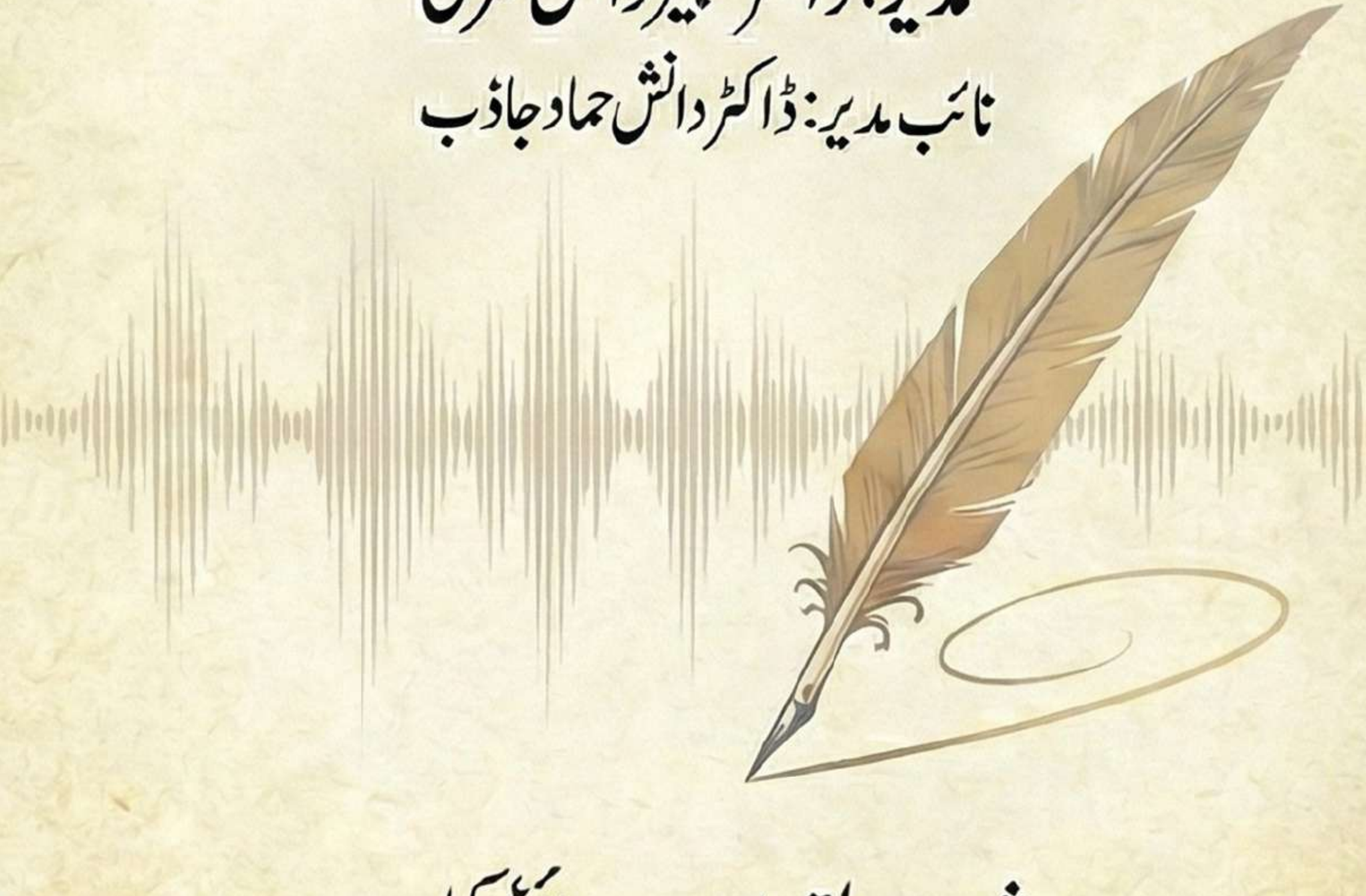
سہ ماہی

ارتعاش ۱۲

مدیر: ڈاکٹر ظہیر دانش عمری

نائب مدیر: ڈاکٹر دانش حماد جاذب



ناشر: دار القرطاس سوسائٹی کڑپہ

سہ ماہی ارتعاش 12

ادبی، تحقیقی، پیرریویوڈ، ریفریڈ ریسرچ جرنل آف اردو لٹریچر

Academic, Research, Peer-Reviewed
Refereed Journal of Urdu Literature

ISSN 2320-2416

ناشر: دارالقرطاس، کڈپہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ
ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ
ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ
ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ
ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ
ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ
ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ
ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ
ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ
ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ
ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ
ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ
ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ
ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ
ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ
ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ
ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ
ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ
ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ
ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ
ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ
ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ ارتعاش، سہ ماہی: کڈپہ

مجلس ادارت و جائزہ کنندگان:

Editorial Board & Reviewers

Dr. SYED VASIULLA BAKHTIARY
Head, DEPARTMENT OF URDU
GOVERNMENT COLLEGE FOR MEN
(AUTONOMOUS),
KADAPA
Mobile: 9441905026
Email: vasibakhtiary@gcmkadapa.ac.in

Dr. S.Mohamed Yassir
H.O.D, Department of Urdu, C.Abdul Hakeem
College(A), Melvisharam, Tamilnadu
Mobile: 9894014664
Email: yassir.urdu@cahc.edu.in

Dr Nishat Ahmed
Department of Urdu, School of Humanities
University of Hyderabad
Gachibowli, Hyderabad 500046
Email: Nishat.ahmed@uohyd.ac.in
Mobile : 9948111687

Dr. Maulana MD Muneeruddin Oomeri
Jamia Darussalam Arabic Collage, Oomerabad
Tamil nadu, India,
Mobile: 9944413346
Email: i2sph9ugau@usa.edu.pl

Dr. Danish Hammad
Assistant professor Department of Urdu
Tata college, chaibasa, Jharkhand
Mobile: 6205005454
Email: i2sph9ugau@usa.edu.pl

ریویو پالیسی

ارتعاش—سہ ماہی ادبی رسالہ

صرف نثری مضامین اور افسانے اشاعت کے لیے قبول کیے جاتے ہیں۔
پامال موضوعات پر مقالات ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں، ایسے موضوعات جن پر بہت زیادہ لکھا گیا ہے ان پر بھی تحریریں نہ ارسال کریں، جدید موضوعات اور کسی مخصوص صنف یا علاقے سے تعلق رکھنے والی شخصیات پر خامہ فرسائی کر سکتے ہیں، قدیم موضوعات میں کوئی نہ کوئی نیا پہلو ضرور ہونا چاہئے۔
ہر تحریر کے ساتھ 1000 روپے فیس لازمی ہے۔
صرف غیر مطبوعہ اور اصل تخلیقات منظور کی جاتی ہیں۔

ریویو کا طریقہ کار
تمام تحریریں ''بلائنڈ ریویو'' کے عمل سے گزرتی ہیں۔
معیار، جدت، وضاحت اور ادبی اہمیت کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا ہے۔
ادارتی بورڈ شائع کرنے، رد کرنے یا ترمیم کی سفارش کا مکمل اختیار رکھتا ہے۔

ریویور کے اصول
جائزہ تعمیری اور غیر جانب دار ہونا چاہیے۔
تحریر کی راز داری ہر مرحلے پر ضروری ہے۔

مصنف کے حقوق
مصنف کو فیڈ بیک دیا جائے گا اور ضرورت ہو تو نظر ثانی کا کہا جائے گا۔
حتمی فیصلہ ادارتی بورڈ کا ہوگا۔

اخلاقی معیارات
سرقہ یا چوری شدہ مواد نا قابلِ قبول ہے۔
حوالہ جات دینا لازمی ہے، حوالہ جات صرف اردو زبان میں تحریر کریں۔

Review Policy
Quarterly IRTIASH
Peer-Reviewed & Refereed Journal of Urdu Literature

1. Scope of Review

Only prose writings (research/critical essays and short stories) are considered for publication.

A processing fee of 1000 rupees is charged per submission.

Submissions must be original and unpublished.

2. Review Process

All submissions undergo a blind peer review.

Each piece is evaluated based on originality, clarity, literary merit, and relevance.

The editorial board has full discretion to accept, reject, or suggest revisions.

3. Reviewer Guidelines

Reviews should be constructive, fair, and free from bias.

Confidentiality of submissions is mandatory.

4. Author's Rights

Authors receive feedback and may be asked for revisions within a given time.

Final decision rests with the editorial board.

5. Ethics

Plagiarism or copied work will not be tolerated.

International Reffrence style should be followed, APA & MLA Chicago Formate.

6. File types:

Word File, times new Roman 16 Font withoud any spacing.

Inpage file, font Noori Nastaleeq 16 Font Size Normal.

ارتعاش، سہ ماہی 12 (اپریل، مئی، جون 2025)

مدیر: ڈاکٹر ظہیر دانش عمری

نائب مدیر: ڈاکٹر دانش حماد

مدیران منتظم: انور ہادی جنیدی، شیخ اسماعیل افضل حیدرآبادی

قیمت: -/500

خصوصی تعاون: 1000 روپئے

صفحات: 246

ملنے کا پتہ:

Dr Zaheer Danish Umari
8/209-1-5, Al Maspet, Bismilla Nagar,
Kadapa 516001 A.P
India Cell:9701065617
irtiashissn@gmail.com
Blog: irtiashissn.blogspot.com

فہرست

باب افسانہ

باب تحقیق وتنقید

باب خاکہ

باب افسانہ

انجام

فیاض قریشی

Cell : 9448785860

اولاد کی تربیت سے لاپروائی اور بیوی پر بے جا اعتماد کا پتہ صفدر صاحب کو اس وقت چلا جب وہ بڑھاپے میں قدم رکھ چکے تھے، شادی کے بعد اپنی بیگم کی مرضی پر چل کر جہاں گھر کی حالت تباہ ہوگئی تھی وہیں وہ اپنا سارا وقار گھر کے اندر کھو چکے تھے، گھر کے کسی بھی معاملے میں گھر کا کوئی فرد ان سے رائے مشورہ کرنا ضروری نہیں سمجھتا تھا، ایک طرف لڑکے انہیں آنکھیں دکھانے لگے تھے تو دوسری طرف ماں کے ساتھ مل کر لڑکیاں سرکشی میں اپنے بھائیوں سے بھی آگے بڑھی ہوئی تھیں، ایک طرف باپ کا بلند رتبہ دوکوڑی کا ہو کر رہ گیا تھا تو دوسری طرف آپس میں بھائی بہنوں کے درمیان پاس ولحاظ ادب واحترام کا دور دور تک شائبہ تک نہیں تھا۔

صفدر صاحب ایک طرف بیوی سے بیزار تو دوسری طرف اپنی سرکش اور خود سر اولاد سے نالاں تھے، مگر اولاد تو پھر بھی اولاد ہوتی ہے، اولاد کی محبت ان کے پاؤں میں زنجیر ڈالے ہوئے تھی، بہت کوششوں کے بعد انہیں ان کی پسند کا داماد مل رہا تھا، اس خوشی میں گھر لوٹتے ہوئے انھوں نے مٹھائی خریدی اور گھر پہنچ کر پچھلی تمام تلخیوں کو فراموش کرتے ہوئے اپنی بیگم کو آواز دی مگر جواب میں کوئی آواز سنائی نہیں دی تو انھوں نے کچن میں جھانکا وہ وہاں بھی نظر نہ آئیں، پھر وہ ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑے تو بیگم کو ٹیلی وژن دیکھنے میں مصروف پایا، کچھ وقفہ کے بعد انھوں نے کہا۔

"یہ بھی کیا بیگم! جب سے ٹی وی گھر میں آئی ہے تم اس کے قریب سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہی ہو۔"

"ٹی وی دیکھنے کے لئے ہی خریدی گئی ہے کہیں اوپر رکھ چھوڑنے کے لئے تو نہیں۔"

"ارے بیگم چھوڑو ان باتوں کو، تم تو ہر وقت ٹی وی اور موبائیل میں ہی لگی رہتی ہو، گھر میں ایک سے ایک جوان اولاد ہے، اب تو ان کی عمر بھی ڈھلنے لگی ہیں، مگر تمہیں ان کی کوئی فکر نہیں۔"

"ارے مجھے اپنے بچوں کی فکر کیوں ہونے لگی، ایک سے ایک ہیرہ ہے میرا بچہ۔" پھر کہا

"دیکھ لینا ایک سے ایک بڑھیا رشتے ہمارے گھر آئیں گے۔"

پھر جیسے ہی شوہر کے ہاتھ میں تھمی ہوئی پیکٹ پر نظر پڑی انہوں نے پوچھا۔

"آج سورج کدھر سے نکل آیا جو میں آپ کے ہاتھوں میں مٹھائی دیکھ رہی ہوں۔"

"بیگم! آج میں نے اپنے دل کی مراد پالی ہے۔"

ٹی وی کی آواز کو دھیمی کرتے ہوئے بیگم نے پوچھا۔

"ذرا میں بھی تو سنوں کہ خوشی کا ایسا کونسا تیر مارلیا آپ نے کہ جس کے اظہار کے لئے آپ نے مٹھائی خریدی ہے۔"

صفدر صاحب کو بیگم کی باتین ناگوار گذریں، پھر بھی انہوں نے بغیر کوئی اثر لئے ہوئے کہا۔

"بیگم! فرخندہ کے لئے میں جس لڑکے کی کوشش کر رہا تھا اس لڑکے کے والدین نے رشتے کے لئے منظوری دے دی ہے، اور لڑکا بھی راضی ہے۔"

" کہیں لڑکے سے مراد عابد تو نہیں؟"

"ہاں بیگم، میں اسی کی بات کر رہا ہوں، عابد پڑھا لکھا ہے، قبول صورت ہے، نیک سیرت ہے، سرکاری ملازم ہے، اب ہمیں اور کیا چاہیئے، اچھے خاندان کا بھی تو ہے۔"

"بس، بس، بہت سن چکی۔ آئندہ اس رشتے کا ذکر کسی کے آگے بھولے سے بھی نہ کرنا۔"

صفدر صاحب بیوی کی برہمی کو تاڑ گئے، پھر بھی سمجھاتے ہوئے بولے، "بیگم ذرا سوچو تو سہی، گھر آئے ہوئے رشتوں کو بغیر سمجھے بوجھے اس طرح ٹھکرانے کا انجام کیا ہوگا، اور ہم کب تک لڑکیوں کو اس طرح بٹھائے رکھیں گے؟"

" کچھ بھی ہو میں آپ کی باتوں میں آنے والی نہیں ہوں۔" پھر پوچھا۔" فرخندہ گریجویٹ ہے، اور عابد؟"

"ارے بیگم آج کل کے گریجویٹ بھی کوئی گریجویٹ ہیں، بھلا آج کا گریجویٹ عابد کا کیا مقابلہ کرسکتا ہے، عابد کردار، قابلیت اور اخلاق میں یکتا ہے، اور بیگم شادی کے لئے ڈگریوں کا نہیں بلکہ جوڑ دیکھا جاتا ہے لڑکے اور لڑکی کا۔ اور ہر لحاظ سے عابد فرخندہ کے لئے موزوں ترین بر ہے، میں نے اپنی منظوری دے دی ہے، آئندہ اتوار کی شام فرخندہ کو دیکھنے کے لئے وہ لوگ ہمارے گھر آرہے ہیں۔"

پورے غصّے اور برہمی کے ساتھ بیگم نے کہا،

" آپ سٹھیا تو نہیں گئے ہیں، کان کھول کر سن لیجئے، فرخندہ کے لئے میں ڈاکٹر یا انجینیر سے کم کوئی رشتہ قبول نہیں کروں گی۔"

"ارے بیگم! ایسا غضب نہ کرنا۔ آئندہ اتوار کو اُن لوگوں کا ہمارے گھر آنا طے ہو چکا ہے۔"

حسبِ وعدہ اتوار کی شام عابد کے والدین، بھائی، بہن اور چند رشتہ دار صفدر صاحب کے گھر آئے اور آپس میں ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے، بیگم اور بچوں نے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے غرور میں انہیں نہ صرف خالی ہاتھ لوٹا یا بلکہ ان کی تضحیک بھی کی۔

صفدر صاحب اپنی ذلّت برداشت نہ کرسکے، بیوی اور بچوں کے خلاف ان کے ذہین میں پہلے ہی سے آتش فشاں تو تھا ہی، آج وہ بُری طرح پھٹ پڑا، انہوں نے سارا گھر اپنے سر پر اٹھا لیا۔

"او کم ظرف! تم نے یہ کیا کر دیا، اب مجھے معلوم ہوا کہ میں نے تم پر بے جا اعتماد کر کے کتنی بڑی اور بھیانک غلطی کی ہے، اب تم ڈائن بن کر میری ہر خوشی کو ڈس رہی ہو، اس میں تمہاری اولاد بھی برابر کی شریک ہے، میں نے اپنی اولاد کے متعلق کتنا بلند تصور اپنے ذہین میں بنا رکھا تھا، کیا کیا خواب نہ دیکھے تھے مگر نہ صرف تم مجھ سے سرکش ہوئیں بلکہ اولاد کو بھی مجھ سے بدظن اور منحرف کر ڈالا، میری اولاد میرا ادب اور احترام نہیں کرتی، یہ دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے، پھر بھی میں ایک باپ ہونے کے ناطے ان سے محبت کرنے پر مجبور رہا، اور اس محبت کا صلہ تم سب نے مل کر اس طرح دیا کہ میں ان لوگوں کے آگے شرمندہ اور ذلیل ہو کر رہ گیا۔ اب

میں انہیں اپنا منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔"

آج صفدر صاحب کا سنبھلنا مشکل ہو گیا تھا، پھر وہ گرجے۔

" کم بخت کبھی تم نے اس بات کو بھی ٹھنڈے دل سے سوچا کہ بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ سہی ان میں انسانیت نام کو بھی ہے؟ کیا انہیں چھوٹوں کے ساتھ شفقت اور بڑوں سے ادب اور تمیز کے ساتھ پیش آنا آتا ہے، جو اولاد اپنے باپ کی عزت نہیں کرتی وہ پڑوسیوں کا کیا حق ادا کرسکتی ہے۔"

پھر پوچھا۔

" کیا تم نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ پڑوس اور پاس پڑوسی ہمارے گھر آنے والے پیاموں کو کیوں توڑ رہے ہیں؟"

صفدر صاحب پوری طرح بے قابو ہو چکے تھے، وہ چلاّئے۔

"ظالم تم نے بچوں کو میرے خلاف بھڑکا دیا، مگر دیکھ لو اس کا انجام کیا ہوا۔سب بچوں کی عمر پچیس سال سے بھی زیادہ ہوگئی مگر اب تک کسی کی شادی کا کوئی امکان نہیں۔"

پھر آہ بھرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"ظالم یہ کیا کر دیا تم نے، ان عمروں میں اب کہاں سے اچھے رشتے آئیں گے۔میں نے اچھے رشتے لائے تو تم نے صرف اس لئے کہ وہ رشتے میرے لائے ہوئے تھے یا پھر میرے رشتہ داروں کی طرف سے تھے تم نے رد کر دئے، دوسرے پیاموں کو تم نے غرور کے ساتھ اس لئے دھتکار دیا کہ وہ پیام ڈاکٹر، انجینیر اور آئی۔اے۔یس۔افسروں کے نہیں تھے، یاد رکھو اب اس گھر کو کوئی ڈاکٹر، کوئی انجینیر اور کوئی آئی۔اے۔یس آفیسر نہیں آئے گا، میں پوچھتا ہوں فرخندہ ملازمت سے لگی ہوئی ہے تو کیا ہوا۔فرحانہ اور فرزانہ اپنے پاس ڈگریاں رکھتی ہیں تو کونسا تیر مار لیا۔ذرا یہ بھی تو بتاؤ جو اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ نبھ نہ سکیں وہ پرائے گھروں میں کیا خاک نبھیں گی، غنیمت تھا جو آئے ہوئے رشتوں کو قبول کر لیتیں۔"

پھر فیصلہ کن آواز میں انہوں نے کہا۔

"اب میں اس جہنم میں نہیں رہ سکتا۔تمہیں اپنی لڑکیوں کے لئے ڈاکٹر، انجینیئر اور آئی۔اے۔یس آفیسروں کی ضرورت ہے، تم انتظار کر لو، میں چلا۔"

اور پیر پٹکتے ہوئے صفدر صاحب گھر سے باہر نکل گئے، تبھی بیگم نے چلاّ کر کہا۔

"ہاں۔ہاں جاؤ۔یہاں کسے پرواہے تمہاری!"
بیگم کو سن کر صفدر صاحب پلٹے اور کہا۔
"ہاں!اب تمہیں میری پروا کیوں ہونے لگی۔اپنی گریجویٹ اور کمائی پوت لڑکیوں پر ناز، ہے گھمنڈ ہے،اور دیکھ لینا تمہارا یہ ناز یہ گھمنڈ سب ایک دن اتر جائے گا۔اور تم زندہ در گور ہوکر رہ جاؤ گی۔"

اس واقعہ کو کئی ماہ بیت گئے۔ وقت ہر زخم کی دوا ہوتا ہے۔وقت صفدر صاحب کے زخموں پر بھی مرہم کا کام کیا۔ایک دن وہ گھر لوٹ آئے۔مگر وہ تعلقات جو میاں بیوی، باپ اور اولاد میں ہونا چاہیئے وہ قائم نہ ہوسکے۔چند دنوں کے سکون کے بعد پھر ایک بار گھر لڑائی جھگڑوں کی آماجگاہ بن گیا۔ایک دو پہر بیگم کہہ رہی تھیں۔

"اف! کیسے آدمی کے ساتھ میرا پالا پڑا ہے، جو اس عمر میں میرا دشمن بنا بیٹھا ہے۔"
صفدر صاحب نے دھاڑا۔
"زبان کو لگام دے اے نادان عورت۔یاد رکھ اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔"
" کیا بگاڑلوگے تم میرا؟" بیگم نے بھی تر کی بہ تر کی جواب دیا۔
"اب بگاڑنے کے لئے کیا باقی رہ گیا جو میں بگاڑوں۔بچوں کا مستقبل تم نے تو ستیاناس کر دیا۔اب اس سے بڑا بگاڑ اور کیا ہوسکتا ہے۔"
شاید بیگم کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتی تھیں۔اپنی آواز میں تھوڑی سی نرمی لاتے ہوئے کہا۔
" آخر اس میں اس قدر بھڑک اٹھنے کی کیا بات ہے؟ میں نے تو صرف اتنا پوچھا ہے کہ بھائی صاحب نے خط میں لکھا کیا ہے؟"
" بھائی صاحب نے خط میں جو لکھا ہے وہ تمہیں سنانے سے پیشتر جی میں آتا ہے تمہارا گلا گھونٹ دوں۔" صفدر صاحب نے کہا اور ساتھ ہی کہا۔" بہت اشتیاق ہے تمہیں بھائی صاحب کے خط کو سننے کو تو پھر سنو۔ کہ خالد پرائے شہر میں غلط راستے پر چل پڑا ہے،اور اگر اس کی شادی فوراً نہیں کر دی گئی تو وہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ پھر کہا۔" میں آج ہی اسے خط لکھ کر بلاؤں گا اور اس کی شادی طئے کر دوں گا۔"
"بہنوں کے ہوتے ہوئے کیا آپ خالد کی شادی کر دیں گے؟" حیرت کے ساتھ

بیگم نے پوچھا۔
" نہیں تو کیا اُسے برباد ہونے کے لئے یونہی چھوڑ دیں گے؟" سختی کے ساتھ صفدر صاحب نے کہا۔
" مگر میں دیکھتی ہوں لڑکیوں کے ہوتے ہوئے آپ خالد کی شادی کیوں کر کریں گے؟"

"اور میں بھی دیکھتا ہوں کہ میرے ہوتے ہوئے خالد کی شادی کو کون روکتا ہے؟" صفدر صاحب نے بضد ہو کر کہا۔
اور کئی ماہ کی بحث وتکرار اور لڑائی جھگڑے کے بعد خالد کی شادی ہوگئی مگر جس گھر میں آپس میں نباہ نہ ہوسکا، جس گھر کے تعلقات ہمیشہ دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں سے ٹھنے رہے اس گھر میں پرائے گھر کی بیٹی کیا نبھ سکتی ہے، دولہن کا گھونگھنٹ ابھی اٹھ نہیں پایا تھا کہ اس کے ساتھ زیادتیاں شروع ہوگئیں۔ اور شادی کے کوئی تین ماہ بعد خالد نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔
گھر کے حالات سے بدظن ہو کر مسعود نے گھر چھوڑ دیا۔ کوئی دو ماہ بعد فرخندہ جس نے اپنی سیول میرتج کو چھپائے رکھا تھا اس کا اعلان کر دیا اور گھر سے نکل گئی۔ فرخندہ کو گھر سے گئے کوئی دو ماہ ہی گذرے تھے کہ فرزانہ پڑوس کے ایک آوارہ نوجوان کے ساتھ فرار ہوگئی۔ اور اسی دوران صفدر صاحب چل بسے۔
ایک دن جب فرحانہ کو لگا تار اُبکائیاں آنے لگیں تو بیگم نے اس کا طبی معائنہ کرایا۔ اور ڈاکٹر کو سن کر اپنا سر پیٹتے اور بال نوچتے ہوئے اپنی موت کی دعائیں مانگنے لگیں۔

کانپور سے واپسی

فاضل شفیع بٹ

اکنگام،انت ناگ،موبائیل نمبر:9419041002

ایک زوردار چیخ ہسپتال کے در و دیوار سے ٹکرا کر گونج اٹھی۔اس چیخ میں درد و کرب تھا۔وہ پچھلے دو ماہ سے کوما میں بے سدھ لاش کی مانند ہسپتال کے ایک بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی ۔اس کی غیر متوقع چیخ سے جاوید ششدر رہ گیا۔سمرن نیم مردہ حالت میں زور زور سے چلا رہی تھی:

"ابو۔۔۔۔مما۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کہاں ہیں آپ؟"

جاوید سمرن کے سرہانے بیٹھ کر اس کو جھوٹی تسلی دیتا رہا۔لیکن سمرن پاگلوں کی طرح اپنے ماں باپ کا پوچھ رہی تھی۔آج سے دو ماہ قبل سمرن اپنے والدین کے ہمراہ پکنک پر گئی تھی۔واپسی پر ان کی گاڑی کے ساتھ ایک دل گزار حادثہ پیش آیا،جس میں سمرن کے والد اور ان کی والدہ کی موقع پر ہی موت واقع ہوئی تھی اور سمرن کو تشویش ناک حالت میں لا کر ہسپتال میں بھرتی کیا گیا تھا۔آج دو ماہ بعد سمرن نے موت کو شکست دے کر نئے سرے سے دنیا میں قدم رکھا تھا اور اپنی آنکھیں کھولتے ہی وہ اپنے ماں باپ کی ایک نگاہ کے لیے پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

جاوید سمرن کے بچپن کا دوست تھا بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے اور دونوں ایک دوسرے سے بے انتہا محبت بھی کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ جاوید پچھلے دو ماہ سے ہسپتال میں سمرن کے ہوش میں آنے کا منتظر تھا اور آج سمرن کے ہوش میں آتے ہی جاوید خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ڈاکٹر نے سمرن کا باریکی سے معائنہ کیا اور جاوید سے مخاطب ہو کر کہا:

"اللہ کا شکر ہے کہ سمرن مشکل ترین ہیلتھ کنڈیشنز کے بعد بالآخر موت کے منہ سے باہر نکل آئی ہیلیکن جاوید صاحب مجھے یہ کہہ کر بہت دکھ ہو رہا ہے کہ سمرن اب کبھی ماں نہیں بن

 ISSN: 2320-2416
Peer-Reviewed & Refereed Journal of Urdu Literature

سکتی۔ماں کی مامتا شاید اس کے نصیب کا حصہ نہیں ہے۔خیر سمرن کی یہ نئی زندگی آپ کو مبارک ہو"

ڈاکٹر کے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی جاوید کی ساری خوشیاں ایک دم سے ماند پڑ گئیں۔اس کے سجے سجائے خواب گویا پل بھر میں زمین بوس ہو گئے۔

جاوید نے دل پر پتھر رکھ کر سمرن کو اُس دل دوز سڑک حادثے کے بارے میں ساری تفصیلات فراہم کیں اور ساتھ میں سمرن کو یہ بھی بتایا کہ حادثے کی وجہ سے اس کی کوکھ ہمیشہ ویران رہے گی۔جاوید نے سمرن کو اپنی باہوں میں بھینچ لیا،اس کے گالوں کو پیار سے تھپتھپایا اور زندگی کے ہر موڑ پر اس کا ساتھ نبھانے کی قسم بھی کھالی۔

ہسپتال سے چھوٹنے کے بعد سمرن ایک دم سے ٹوٹ گئی اور شدید ذہنی کوفت میں مبتلا ہوئی۔سمرن اب اپنی بڑی بہن اور چھوٹے بھائی کے ہمراہ چچا کے گھر میں سکونت پذیر تھے ۔حالانکہ ان کا چچا محمد علی ایک شریف النفس آدمی تھا لیکن وہ سمرن کی یادوں سے اس کے ماں باپ کا نقش مٹانے میں ناکام رہا۔اس ذہنی کوفت سے راحت حاصل کرنے کے لیے محمد علی نے سمرن کو اپنی بڑی بہن کے ہمراہ سیر و تفریح کی خاطر کانپور شہر بھیجنے کا فیصلہ کیا اور سمرن اپنی بڑی بہن شیرازہ کے ساتھ کانپور کے لئے روانہ ہوئے۔

سمرن اور شیرازہ کانپور میں سیر و تفریح سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔سمرن کے غم آلود چہرے پر نکھار آنے لگا۔وہ دھیرے دھیرے زندگی کی المناکیوں کے دئے ہوئے گہرے زخموں کو سلنے میں کامیاب ہو رہی تھی۔

اسی اثناء میں جاوید نے محمد علی کے ساتھ اچھے مراسم قائم کیے۔جاوید ایک سرکاری ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ سماج کے ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔جاوید محمد علی کو اپنے فریب میں گرفتار کرنے میں کامیاب رہا۔کانپور سے واپسی کے چند دن بعد محمد علی کے گھر لڑکی کا ہاتھ مانگنے جاوید کے ماں باپ وارد ہوئے۔

شیرازہ جو سمرن سے ایک سال بڑی تھیں،کافی خوب رو لڑکی تھی۔اس کا ناک نقشہ دلکش اور تیکھا تھا۔محمد علی اور جاوید کے والدین نے آپس میں بات چیت کر کے آخر یہ طے پایا کہ جاوید کی شادی شیرازہ سے ہو گی کیونکہ سمرن ماں بننے کی اہلیت کھو چکی ہے۔دراصل جاوید نے محمد علی کو سمرن کی غیر موجودگی میں حادثے سے جڑی سب باتوں سے آگاہ کیا تھا اور شیرازہ سے

شادی کرنے کی اپنی دلی خواہش کو محمد علی کے سامنے رکھا تھا۔

اس دلخراش سڑک حادثے کے باعث سمرن نے اپنے والدین کے ساتھ ساتھ آج اپنی محبت کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔ جاوید قطعی نہ چاہتا تھا کہ اس کی شادی ایک بانجھ عورت سے ہو اور پھر زندگی بھر لوگوں کے طعنوں سے اس کا دل چھلنی ہوتا رہے۔

جاوید اور شیرازہ کی شادی ہوئی اور سمرن نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے شہر کا رخ کیا اور شہر میں کرائے کے مکان میں رہنے لگی۔ سمرن کو تنہائی سے لگاؤ ہونے لگا۔ تنہائی نے سمرن کو اپنی آغوش میں لیا۔ سمرن نے روح کی گہرائیوں میں تنہائی کو مسلط کیا اور اپنی ماضی کے دلخراش یادوں کے لمس میں اپنی زندگی بسر کرنے لگی۔

سسرال میں چند ماہ گزارنے کے بعد ہی شیرازہ نے سرکاری نوکری حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ شیرازہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی کہ اچانک اس کو ابکائی محسوس ہوئی۔ آج ڈھیر ساری خوشیوں نے شاید ایک ساتھ جاوید اور شیرازہ کو اپنی تحویل میں لیا تھا۔ شیرازہ کی حاملہ ہونے والی خبر نے گھر میں شادمانی کا ماحول قائم کیا۔ چند ماہ بعد شیرازہ نے ایک خوبصورت لڑکے کو جنم دیا۔

جاوید کا تبادلہ ہوا اور شیرازہ بھی جاوید کے ہمراہ اپنا تبادلہ کرانے میں کامیاب ہوئی۔ دونوں میاں بیوی دوسرے شہر میں عارضی طور منتقل ہوئے۔ اب مسئلہ ننھے بچے کی پرورش کا تھا اور اس وقت شیرازہ کے دل و دماغ میں اپنی چہیتی بہن سمرن کا خیال آیا اور اس نے سمرن کو فون کیا اور کہا:

" سمرن۔۔۔۔۔ میری پیاری بہن۔۔۔ تمھیں معلوم ہے کہ ہم دونوں کا تبادلہ ہوا ہے۔۔ یونیورسٹی کی بھی چھٹیاں چل رہی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم چند دن یہاں آ کر تب تک میرے بچے کی پرورش کا خیال رکھو جب تک میں کسی نوکرانی کا انتظام کر لوں گی "

" ٹھیک ہے دیدی۔۔۔۔۔۔ جیسے آپ کی مرضی۔۔ میں کل ہی شہر آنے کا پروگرام بناتی ہوں " سمرن کے جواب میں اختصار تھا۔

سمرن مجبور تھی۔ وہ کسی بھی صورت میں اپنی بہن کو انکار نہیں کر سکتی تھی۔

اگلے دن علی الصبح سمرن نے اپنے سفر کا آغاز کیا اور دوپہر تک اپنی بہن کے گھر وارد ہوئی۔ وہ اپنے بہنوئی سے آنکھیں ملانے سے قاصر تھی حالانکہ شیرازہ، جاوید اور سمرن کے عشق

کے داستان سے بالکل نا آشنا تھیں۔ سمرن کو اپنے بھانجے کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپی گئی ۔شیراز صبح تڑکے ہی اپنے آفس کا رخ کرتی اور سمرن اپنے ننھے سے بھانجے کے ساتھ اپنے دل کو لبھاتی تھی۔

جاوید نے اپنی بیوی کی غیر حاضری میں سمرن پر پھر سے ڈورے ڈالنے شروع کیے ۔اس کو اپنے ماضی کے وہ حسین دن یاد آرہے تھے جب وہ سمرن کے عشق میں گرفتار تھا۔ وہ سمرن سے بے انتہا محبت کرتا تھا لیکن دلدوز سڑک حادثے نیان کے محبت کے بیچ ایک ایسی دراڑ پیدا کر دی تھی جو بعد میں ان کی جدائی کا سبب بنی۔ سمرن کو دیکھتے ہی جاوید کا دل زور زور سے دھڑ کنے لگتا۔ ایک دن جاوید کے صبر کا پیمانہ ٹوٹ گیا اور اس نے سیدھے کچن کا رخ کیا، سمرن کو اپنے باہوں میں بھینچ لیا اور بے انتہا پیار کرنے لگا۔ سمرن سٹپٹا گئی لیکن جاوید کی ضد کے سامنے آخر اس نے اپنی ہار کو تسلیم کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اس کے دل میں بھی شاید جاوید کے محبت کی تھوڑی سی چنگاری سلگ رہی تھی۔

جاوید اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ سمرن کبھی ماں نہیں بن سکتی اس لیے دونوں کے درمیان شیرازہ کے درپردہ ایک گھناؤنے رشتے کا آغاز ہوا۔ سمرن شیرازہ کی غیر حاضری میں اپنے بہنوئی کے ساتھ رنگ رلیاں منانے لگی۔ یہ سلسلہ ایک ماہ تک جاری رہا اور بالآخر یونیورسٹی کی چھٹیاں ختم ہوتے ہی سمرن نے جاوید اور شیرازہ کو خیر آباد کہا۔

سمرن نے کالج جوائن کیا اور چند دن بعد اس کی منگنی عرفان سے طے ہوئی۔ عرفان ایک سیدھا سادہ نوجوان تھا حالانکہ وہ سرکاری ملازم تو نہ تھا لیکن ایک اچھی خاصی پرائیویٹ کمپنی میں نوکری کر رہا تھا۔

منگنی کو چھ ماہ گزر چکے تھے کہ اچانک ایک دن سمرن کی طبیعت بگڑ گئی۔ سمرن نے ہسپتال کا رخ کیا اور اپنی روداد ڈاکٹر صاحب کو سنانے لگی۔ ڈاکٹر صاحب نے باریکی سے معائنہ کرنے کے بعد سمرن سے مخاطب ہو کر کہا:

"سمرن جی مبارک ہو۔ آپ ماں بننے والی ہیں"

ڈاکٹر کے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی سمرن کانپ گئی اور اس پر سکتہ طاری ہوا۔ سمرن بہت گھبرائی ہوئی تھی اس کو پورا یقین تھا کہ وہ ماں بننے کی اہلیت کھو چکی تھی لیکن کارگاہ الٰہی کے فیصلوں سے بھلا انسان کیسے آشنا ہو سکتا ہے؟ وہ چھ ماہ کی حاملہ تھیں۔ سمرن بوجھل قدموں کے

ساتھ ہسپتال سے نکلی اور نمناک آنکھوں سے اپنے بہنوئی کو فون کیا اور اس کو اپنی حاملہ ہونے والی بات سے آگاہ کیا۔

"دیکھو سمرن۔۔ جو ہونا تھا، ہو گیا۔۔۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں تم سے شادی کر لوں گا۔ دین اسلام نے مجھے دو بیویاں رکھنے کی پوری آزادی دی ہے۔ میں تم دونوں بہنوں کو اپنی بیویاں بنانا پسند کروں گا" جاوید کی لہجے میں سنجیدگی تھی۔

سمرن جاوید کا بے تکا جواب سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ کسی بھی حالت میں اپنی بہن کا گھر اجاڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جاوید کے بچے کی ماں بننے والی تھی اور جاوید نے ایک غیر ذمہ دارانہ شخصیت کا ثبوت فراہم کیا تھا اور آج سمرن ایک بار پھر جاوید کی بے وفائی کے سامنے بے یارومددگار نظر آرہی تھیں۔

سمرن نے سیدھے اپنے کمرے کا رخ کیا اور زاروقطار رونے لگی۔ اس کی منگنی ہو چکی تھی اور عرفان تک اس بات کی بھنک لگنا ان کے رشتے کو ہمیشہ کے لیے دفن کر سکتا تھا۔ اس مصیبت کی گھڑی میں سمرن نے اپنی سہیلی نظرانہ کو فون کر کے تمام صورتحال سے آگاہ کیا۔ سمرن رو رو کر اپنی کرتوت اپنی سہیلی کو سنا رہی تھی اور نظرانہ یہ سب سن کر پریشان ہو رہی تھی۔

نظرانہ نے اپنی پیاری سہیلی سمرن کو تسلی دی اور فون رکھتے ہی اپنے منگیتر آصف سے مدد طلب کی۔

آصف پیشے سے ایک ڈاکٹر تھا۔ نظرانہ کی منت سماجت کے بعد آصف نے اسقاط حمل کا مشورہ دیا جس کے لیے کچھ پیسوں کا بندوبست کرنا لازمی تھا اور یہ ایک پرخطر عمل تھا جس سے سمرن کو اپنی جان کی بازی بھی لگانی پڑ سکتی تھی۔

سمرن اپنی سونے کی چین بیچ کر اسقاط حمل کے لیے تیار ہو گئی اور نظرانہ کے ہمراہ آصف کے ایک دوست اشرف کے گھر چلی گئی۔ آصف نے نظرانہ کے محبت کی خاطر اپنے پیشے سے بے ایمانی کی اور سمرن کا حمل گرانے میں کامیاب رہا۔ رات اشرف کے گھر پر ہی بسر ہوئی

اگلے دن صبح سویرے سمرن اشرف اور آصف کے ہمراہ اپنے شہر کے کرائے والے کمرے کی جانب چل پڑی۔ تھوڑی مسافت طے کرتے ہی سمرن نے آصف کو گاڑی روکنے کے لیے کہا۔ اس کا کوئی دوست اس کا منتظر تھا، جس کو سمرن کے ہمراہ شہر جانا تھا۔

آصف نے گاڑی روک لی اور ایک نوجوان پچھلی سیٹ پر براجمان ہوا۔ نوجوان

نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔گاڑی اپنا فاصلہ طے کر رہی تھی کہ اچانک شاہراہ پر تعینات پولیس کی ایک ٹیم نے گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا۔آصف نے گاڑی روکی اور زیرلب پولیس کے خلاف کچھ ناشائستہ الفاظ بڑبڑائے۔سمرن نے تیکھے لہجے میں آصف سے مخاطب ہو کر کہا:

" آصف صاحب۔۔۔پولیس والوں کے خلاف کچھ بھی الٹا سیدھا مت بولیے۔میرے ابو بھی پولیس میں تھے مجھ سے قطعی اپنے ابو کی بیعزتی برداشت نہیں ہوگی"

آصف تلملا گیا۔آصف نے تلخ لہجے میں جواب دیا:

"سمرن اگر تم کو اپنی ابو کی عزت کا اتنا ہی خیال ہوتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچ پاتی"

یہ ساری باتیں سمرن کے دوست کی سمجھ سے پرے تھیں۔

آصف نے غصے پر قابو پا کر اپنا سفر جاری رکھا اور ایک آدھ گھنٹے میں شہر پہنچ گئے۔آصف نے گاڑی کو روکا۔سمرن اپنے دوست کے ہمراہ اپنے کرائے کے مکان کی جانب چل پڑی اور آصف کو انتظار کرنے کے لیے کہا۔

تھوڑی مدت میں سمرن کا دوست واپس لوٹ آیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔آصف نے گاڑی اسٹارٹ کی۔اشرف جو کہ آگے والی سیٹ پر براجمان تھا، نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کہا:

"ارے بھائی کون ہو آپ؟ راستے میں بھی آپ نے کوئی بات نہیں کی۔۔۔بڑے پریشان لگ رہے ہو "

"جناب میرا نام عرفان ہے۔میں سمرن کا منگیتر ہوں۔میری اس پریشانی کا سبب سمرن ہے۔بیچاری جب سے کانپور سے واپس لوٹ کر آئی ہیں تب سے ان کی طبیعت آئے دن خراب ہی رہتی ہے۔بس کسی طرح سے سمرن کی صحت بحال ہو جائے۔یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ اتنی سیدھی سادھی اور شریف لڑکی سے واسطہ پڑا ہے۔ورنہ آج کل کی لڑکیوں کا خدا ہی حافظ ہے۔۔۔"

آصف اور اشرف چونک گئے۔وہ ایک دوسرے کی طرف حیران کن نظروں سے دیکھنے لگے۔اس کے بعد تینوں نے واپسی میں ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔۔۔۔۔۔۔!!

نقش فریادی

راجہ یوسف

میں نے اس میں اپنی مرضی سے رنگ بھرنا چاہا۔ پر جو کچھ اُبھر کر سامنے آ رہا تھا وہ میرے لئے غیر مانوس تھا۔ جس کی پہچان بہت مشکل تھی۔

جب میرے ہاتھ میں کھانے کا ٹفن دیا گیا اور کندھے پر کتابوں کا بوجھ لادا گیا تو میرے دل میں جو پہلا احساس جاگا تھا وہ احتجاج تھا۔ مجھے میری پیاری ماں سے دور کیا جا رہا تھا۔۔۔ میرا ہاتھ دادا کی گرفت میں تھا۔ میں گیٹ تک مڑ مڑ کے دادی کی طرف آس بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اب یا جب وہ بھی میرے احتجاج میں شامل ہو جائے گی۔ وہ مجھے روک لے گی۔۔ پر اس نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ دادا دادی کی آنکھوں میں خوشی کی چمک جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔۔۔ اور ان کی آنکھوں کی یہ چمک مجھے ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔۔۔ میرا اسکول کا یہ پہلا دن ایک صدی کے برابر ہو گیا تھا۔

''تم نے میری پنسل کیوں توڑ دی۔ میں تمہاری بک پھاڑ دوں گی۔'' اس نے صرف کہا ہی نہیں تھا بلکہ میری کتاب کے کئی ورق پھاڑ بھی ڈالے تھے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو میرا احساس جاگا تھا، جس میں احتجاج نہیں تھا۔۔۔

میرے برش سے رنگ ٹپک رہے تھے۔ پر کینوس پر ابھرتے نقوش مانوس نہیں تھے۔

''تمہاری امی میٹھا اچھا بناتی ہے۔'' میں نے اس کو ماں کی بنائی ساری مٹھائی کھلا دی ۔۔۔ مٹھائی کی شہد ایسی مٹھاس اس کی آنکھوں میں جھلمل جھلمل کر رہی تھی اور میرا شوق بڑھ رہا تھا کہ اس کی آنکھیں چوم لوں۔

میں اپنے ذہن کے کینوس پر بڑے شوق سے اس کا خوب صورت پیکر تراشنا چاہتا تھا۔ لیکن وہاں کوئی پیکر نہیں بن پا رہا تھا۔ البتہ مبہم لکیریں ایک جالا جیسا بُن رہی تھیں۔ میرے تصور کے سمندر میں اس کا عکس ڈوبتا اور ابھرتا جا رہا تھا۔ یہ ہلکا سا، غیر مانوس سا پیکر میرے بچپن کے اس

کھلونے جیسا تھا جو دکاندار کے شوکیس میں تو پڑا تھا، پر رات رات بھر میرے سپنوں کے ساگر میں کبھی مدھم تو کبھی جھلملاتا ابھرتا ڈوبتا رہتا تھا۔۔۔دھندلا ہی سہی کچھ تو تھا جس کی تصویر اکثر بادلوں میں تحلیل ہو جاتی تھی اور کبھی پورے چاند پر اس کا خوبصورت عکس منعکس ہو جاتا تھا۔ ایک پیکر، ایک عکس، شفاف مورتی جیسا۔جس کے چہرے کے گرد ہلکا ہلکا سا دھندلا پن تھا۔جس وجہ سے یہ تصویر دھواں دھواں سی دِکھائی دے رہی تھی۔۔۔بس ایک غیر مانوس سا عکس تھا۔ یا نہ سمجھ میں آنے والا پیکر تھا، جو کبھی مکمل تصویر نہیں بن پا رہی تھی۔ پر میں نے اپنے کینوس پر مبہم سا ہی سہی ایک پیکر تراش ہی لیا، جس میں میں ہر وقت نئے نئے رنگ بھرتا رہتا تھا۔شوق رنگوں سے رنگا میرا یہ خیالی پتلا ہمیشہ سفید بادلوں جیسی کتاب پر کالے کالے حروف کی طرح ابھر کر آتا تھا۔لیکن۔۔۔افففف یہ دھند۔۔۔۔یہ دُھند میری سوچ کا حصہ تھی یا میری آنکھوں کا دھوکہ۔۔ یا کہ ابھرتی ڈوبتی تصویر کی لکیریں اتنی ہلکی تھیں کہ وہ پل بھر میں تیز ہو جاتی تھیں اور پل بھر میں مدھم پڑ جاتی تھیں۔کبھی کبھی تو میرا تراشیدہ پیکر دھند کے ایسے اتھاہ سمندر میں گم ہو جاتا تھا کہ میری روح تھر تھر کانپ اُٹھتی تھی اور میرا یقین بڑھ جاتا تھا کہ اب یہ پیکر ڈوبا تو کبھی ابھر کر آئے گا نہیں۔لیکن پھر ایک لمحے میں یہ کالے بادلوں کی اوٹ میں دوبارہ دکھائی دیتا تھا۔

''آپ کتنی شکر لیں گے۔''

''ایک چمچ۔''

''وہ تو مجھے بھی معلوم ہے''

''تو۔۔۔پھر کیوں پوچھا؟''

''وہ تو میں نے آپ کی چپ توڑنے کے لئے کہا۔آپ بہت کم بولتے ہیں نا۔''

''تم بھی تو خاموش خاموش سی رہتی ہو۔کچھ کہتی بھی نہیں ہو۔''

''کیا کہوں، آپ تو صرف میرے چہرے کو گھورتے رہتے ہیں۔میں تو کبھی کبھی ڈر جاتی ہوں''

''ہاں رنگوں کی تلاش میں ہوں۔تم میں کون کون سا رنگ بھرا ہے، انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔میں تم میں اپنی مرضی کے کچھ رنگ بھرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے برش رنگوں میں ڈبو دیا تو ریسٹورانٹ کا سارا رنگین منظر مدہم پڑ گیا۔میں نے سارے رنگ بکھیر دیئے۔۔۔رنگوں میں سارا جوش، جذبہ، چاہت اور بھرپور محبت ڈال دی۔اب مدھم لکیریں ایک پیکر تراش چکی تھیں۔وہ خوش رنگ اور خوش نما ابھر کر آ گئی تھی۔۔۔اس کی آنکھوں

میں مستی تھی۔ گالوں میں چاشنی، ہونٹ مدھ بھرے سے تھے، دانت موتی جیسے اور اس کی مسکراہٹ پر ہزار جان قربان کرنے کو دل چاہتا تھا۔۔۔

محبت پروان چڑھتی رہی۔۔۔شوخیاں بڑھتی گئیں۔ چھیڑ چھاڑ کی رُت برستی رہی۔۔۔قدرت کے حسین نظاروں کے سیر سپاٹے شروع ہوگئے۔۔۔ سمندر ایسی گہری آنکھوں میں محبت کی سیپ کی تلاش مقصدِ حیات بنی۔۔۔محبت ، چاہت ، اور لذت کے ذائقے بے صبری کے پیمانوں میں بٹتے گئے۔۔۔

زندگی کے جھمیلے روشنی کے قمقموں جیسے ہوتے ہیں۔کبھی سورج کی تیز اور چھپاک کرنوں کی طرح آنکھوں میں چکاچوند کر دیتے ہیں، تو کبھی پورے وجود کو چاندنی جیسی سہانی ٹھنڈک سے تھپکی۔۔۔ ابھرتی ڈوبتی لہریں کبھی منجدھار میں غوطہ زن ہونے پر مجبور کر دیتی ہیں تو کبھی اٹھا کر ساحل کے اوپر پٹخ دیتی ہیں۔۔۔

گردشِ ایام کا پہیہ بہت تیزی کے ساتھ گھومتا رہا اور پھر ایک دم مدہم پڑ گیا۔ جیسے تھمنے کے بہت قریب آ گیا ہو۔۔۔اب تو ساری دنیا بدلی بدلی سی دِکھائی دے رہی تھی ۔۔۔ ذہن کے کینوس پر اُبھری مورت بھی بدل بدل سی لگ رہی تھی ۔۔۔ یا شاید یہ وہ تھی ہی نہیں جس کو میں نے بڑے پیار سے تراشا تھا۔ جس کے انگ انگ میں میں نے اپنے رنگ بھر کر اپنی مرضی کا پیکر بنانا چاہا تھا ۔۔۔ یہ جو میرے ذہن کے کینواس پر صورت ابھر کر آ رہی تھی، اسے تو میں نے تراشا ہی نہیں تھا۔۔۔میں نے تو ایک حسینہ کو بہت حسین سانچے میں ڈھالا تھا۔۔۔ جس کا چہرا اپنے حسن و جمال میں لاثانی تھا۔۔۔پر یہ جو چہرا کینوس پر ابھر کے آ رہا تھا، یہ تو یاس، ناامیدی اور فکر کے دھاگوں میں الجھا جھریوں سے بھرا چہرا تھا۔۔۔افففف۔۔۔آج مجھ میں یہ کیسا احساس جاگ رہا تھا۔۔بہت ہی کمزور۔۔۔نحیف ۔۔۔ اور۔۔۔لاغر سا۔۔۔ میرا ہاتھ میرا آئینہ بنا۔ میں نے خود میں خود کو دیکھنے کی سعی کی ۔۔۔ماہ و سال بدلنے سے میرے بھی خدوخال بدل چکے تھے۔۔۔ میرا چہرا تفکر کی اُلجھی جھریوں سے بھرا بھرا لگ رہا تھا۔۔۔ اور نقش فریاد کر رہا تھا کہ تم ناکام رنگ ساز ہو ۔

مافیا کا فیصلہ

قسیم اختر

جیل کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھا وہ شخص نہ دیوانہ لگتا تھا، نہ مجرم۔ اس کی آنکھوں میں وہ روشنی اب بھی باقی تھی جو دھوپ میں کھیتوں کے سینے پر قدم رکھتے کسان کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ مگر وہ کسان نہیں تھا، ایک تعلیم یافتہ، سلجھا ہوا زمین دار تھا— نام کاشف رضا۔

کاشف کی جائیداد شہر کے کنارے واقع تھی۔ کئی سو بیگھہ زرخیز زمین، آموں کا باغ، نہر کے کنارے سبزہ زار، اور مٹی میں لپٹی ہوئی وہ خوشبو جسے کاشف بچپن سے اپنے وجود کا حصہ سمجھتا تھا۔ یہ زمین اس کے باپ دادا کی میراث تھی، مگر میراث سے زیادہ اعتماد اور تہذیب کا مظہر۔

چار مہینے پہلے تک کاشف رضا ایک مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے تین بیٹے، ایک بیٹی، سب اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ وہ خود ریٹائرڈ لیکچرر تھا اور اب صرف زمین کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ مگر زمین صرف کھیت نہ تھی— یہ ایک جنگ تھی، جسے وہ وقتاً فوقتاً جیتتا آ رہا تھا۔ مگر اب وقت بدل چکا تھا۔

یہ وہ دور تھا جب زمین صرف غریب کی چھینی نہیں جا رہی تھی، بلکہ تعلیم یافتہ اور خوددار لوگوں کو بھی اس سازش میں گھسیٹا جا رہا تھا۔

ایک صبح جب کاشف کی بیوی نے اسے جگایا، اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔

''پولیس آئی ہے، کہتی ہے کوئی شکایت ہے آپ کے خلاف۔''

کاشف حیران ہوا، لیکن ڈرا نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے کبھی کوئی جرم نہیں کیا۔ تھانے پہنچتے ہی ایف آئی آر دکھائی گئی، جس میں الزام تھا: ''زمین پر ناجائز قبضہ، جعلسازی اور دھوکہ دہی''۔

یہ وہ زمین تھی جو کاشف کے نام پر تھی، خاندانی کاغذات اس کے پاس تھے، پٹّے، رجسٹری، سیٹلمنٹ کے کاغذات سب درست تھے۔ مگر ایف آئی آر کسی جعلی فرد کے نام پر درج ہوئی، اور رپورٹ تیار کرنے والا پٹواری، وہی شخص تھا جو کئی دنوں سے ''مصالحت'' کا مشورہ دے رہا تھا۔

عدالت میں تاریخیں پڑتی رہیں، وکیل بدلتے رہے، مگر حکمِ حراست جاری ہو گیا۔ جیل میں کاشف کو وہ سب چہرے یاد آئے جو ''دوستی'' کی آڑ میں ''زمین'' کی بو سونگھتے رہے تھے۔

قید کا آغاز صرف بند دروازے سے نہیں ہوا، بلکہ اندر ایک خاموش اذیت کے ساتھ ہوا۔ وہ

سوچتا، "میرے بچے باہر ہیں، مگر کیا انھیں شعور ہے کہ زمین کی حفاظت کیسے کرنی ہے؟"
ادھر باہر، "زمین مافیا" نے اپنے منصوبے تیزی سے شروع کر دیے۔ وہ زمین جو کاشف کی تھی، اب "متنازع" قرار دی گئی۔ ایک کمپنی، "الوین بلڈرز"، نے اعلان کیا کہ وہ وہاں ایک نیا ہاؤسنگ پروجیکٹ شروع کرے گی۔
جب کاشف کے بیٹوں نے احتجاج کیا، تب ان پر بھی دباؤ ڈالا گیا— کبھی دھمکیاں، کبھی لالچ۔ آخر کار دو بیٹے شہر چھوڑ کر چلے گئے، ایک نے وکالت کی کوشش کی، مگر اسے دھمکی ملی کہ اگر عدالت میں کیس کو آگے بڑھایا، تو اس کے والد کو "حادثاتی" موت بھی ہو سکتی ہے۔
جیل میں ایک شخص، رؤف چوہان، کاشف سے ملنے آیا۔ وہ خود کو "دوست" کہتا تھا۔
"کاشف بھائی، معاملہ سنگین ہے۔ اگر تھوڑا سا حصہ دے دیں، تو باہر نکل سکتے ہیں۔ ہم سب یہاں جیتے نہیں، سمجھیے، بِک جاتے ہیں۔"
کاشف نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔ "زمین میری ماں ہے۔ ماں کو بیچنے کا مشورہ مت دو۔"
ایک دن جیل میں ہی کاشف کی ملاقات ایک رپورٹر ماریہ اقبال سے ہوئی، جو قیدیوں پر تحقیق کر رہی تھی۔ جب اس نے کہانی سنی، تو وہ حیران رہ گئی۔
"آپ کی کہانی تو صرف زمین کی نہیں، پورے نظام کی ہے، جہاں سچ بولنے والا قیدی ہے اور جھوٹ بولنے والا بلڈر۔"
ماریہ نے اپنی رپورٹ لکھی، شائع کروائی، سوشل میڈیا پر معاملہ گرم ہوا، کچھ این جی اوز متحرک ہوئیں، عدالت نے ازخود نوٹس لیا۔
تین مہینے بعد عدالت نے تمام الزامات کو "من گھڑت" اور "سازش" قرار دیا۔ ایف آئی آر جھوٹی نکلی، پٹواری اور ایس ایچ او معطل ہوئے، الوین بلڈرز کا پروجیکٹ منسوخ کر دیا گیا، اور کاشف رہا ہو گیا۔
جب کاشف باہر آیا، تو سورج کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ زمین کے کنارے کھڑے ہو کر اس نے مٹی کو چھوا، جیسے برسوں بعد کسی ماں کی گود میں واپس آیا ہو۔ اس کے بچے اب اس کے ساتھ تھے، اب انھیں زمین کی خوشبو کا شعور تھا۔
"میں قید اس لیے نہ تھا کہ مجرم تھا، بلکہ اس لیے کہ آزاد تھا۔"
کاشف جیل سے آزاد ہو گیا تھا، مگر جیل اس کے پیچھے سے نہیں ہٹی تھی۔ وہ اب کھلی فضا میں ضرور تھا، مگر اس کے اطراف سناٹا، خاموشی اور وہ خلا تھا جو انسان کی آنکھوں میں نہیں، دل میں رینگتا ہے۔

اس کے بچے — وہی بچے جن کے لیے اس نے زمین بچائی تھی — اب خوف کے سائے میں زندگی گزارنے لگے تھے۔ وہ سب کے سب شہر منتقل ہو گئے تھے، کوئی ممبئی، کوئی دہلی، کوئی حیدرآباد۔ باپ جب فون کرتا، وہ ادب سے بات کرتے، دعائیں لیتے، مگر زمین کا نام آتے ہی خاموش ہو جاتے۔

"ابّو ... ہم وہ سب نہیں کر سکتے جو آپ نے کیا۔ ہمیں اپنی زندگیاں بنانی ہیں۔"

کاشف دل پر پتھر رکھ لیتا، مگر زمین پر ہاتھ رکھ کر ہر بار یہی کہتا:

"تو پھر سنو، تم لوگ زمین کی حفاظت سیکھو۔ زمین، صرف زمین نہیں ہے، تمہاری جڑ ہے ... تمہارے ہونے کا سبب۔ تم اسے چھوڑو گے تو وقت تمہیں چھوڑ دے گا۔"

مگر کوئی نہ سنتا۔

کاشف نے جب دیکھا کہ بچے پیچھے ہٹ گئے ہیں، وہ خود اور زیادہ متحرک ہو گیا۔ پٹواریوں، تحصیلداروں، وکیلوں کے چکر لگاتا، کاغذات دوبارہ نکلوا کر سنبھالتا۔ مگر زمین مافیا خاموش نہیں تھا، اس کی اگلی چال پہلے سے زیادہ خطرناک تھی۔

ایک نیا مقدمہ قائم کیا گیا:

"جھوٹی ضمانت پر باہر آ کر دوبارہ زمین پر قبضہ کرنے کی کوشش، اور کچھ حصے ایسے افراد کے ہڑپنے کی کوشش جن کا حق اس میں موجود ہے۔"

پھر سے پولیس آئی۔ کاشف کو حیرت نہ ہوئی، بس وہ مسکرایا اور گرفتاری کے وقت صرف ایک بات کہی:

"زمین میری ماں ہے، اور ماں کے لیے قید بھی گوارا ہے۔"

اس بار عدالت میں ماحول بدلا ہوا تھا۔ میڈیا خاموش تھا، رپورٹر ماریہ کہیں اور مصروف تھی، اور کاشف کے وکیل کے چہرے پر الجھن تھی۔ جب کاشف کو عدالت میں پیش کیا گیا، جج کی آنکھوں میں ایک عجیب سرد مہری تھی، جیسے وہ مقدمہ نہیں، فیصلہ پہلے سے جانتا ہو۔

"کاشف صاحب"، جج نے کہا، "ہم مانتے ہیں کہ زمین آپ کے نام ہے۔ لیکن کچھ لوگ اس زمین میں اپنے حصے کا دعویٰ بھی کر رہے ہیں۔"

کاشف نے دھیمے لہجے میں کہا، "جی، مگر وہ دعوے جھوٹ پر مبنی ہیں۔ کاغذات میرے پاس موجود ہیں۔"

جج نے فائل بند کی اور سیدھا کاشف کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا:

"دو باتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ آپ اپنی زمین کی حفاظت نہیں کر پا رہے۔ آئے دن زمین کے سبب جھگڑے ہوتے ہیں، مقدمے، دنگا فساد۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ جو زمین دوسروں کے دعوے

کے تحت آتی ہے، وہ انھیں دے دی جائے گی، اور باقی زمین — جواب بھی متنازع ہے — سرکار کے حق میں ضبط کر لی جائے گی، کیونکہ آپ کی قابلیت اپنی زمین کی حفاظت کے قابل نہیں رہی۔"

کاشف کا دل دہل گیا۔ عدالت میں وہ ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گیا۔ اس نے نظریں جھکائیں، جیسے مٹی سے آنکھ ملا رہا ہو۔ شاید وہ اپنی ماں کو دیکھ رہا تھا، اپنی زمین کو، جو اس کی مٹھی سے پھسل رہی تھی۔

اس نے سوچا، "زمین چھن جائے، تو چھن جانے دو۔ مگر اس کا تقدس نہ چھینو۔ اسے متنازعہ نہ بناو۔"

پھر اس نے سر اٹھایا، جج کی طرف دیکھا، اور صرف اتنا کہا:

"میں اپنی ماں کے سامنے ہارا ہوں، مگر اس کے قدموں میں جھکا نہیں۔"

کاشف کو دوبارہ قید کر دیا گیا۔ اس بار قید میں نہ تو امید کی وہ روشنی تھی، نہ بچے خط بھیجتے تھے۔ مگر وہ روز شام کو آسمان کی طرف دیکھتا، سورج ڈھلتے وقت وہ جانتا کہ اس کی زمین پر روشنی پڑ رہی ہوگی۔

کاشف اب بھی زندہ ہے۔

زمین اب بھی زندہ ہے۔

صرف اتنا فرق ہے کہ کاشف باہر ہوتے ہوئے بھی قید ہے، اور زمین آزادی کے باوجود بے سہارا۔

اور کہیں نہ کہیں، مٹی کے ذروں میں اب بھی کاشف کی سانسیں بسی ہوئی ہیں، جو ہر بار ہوا کے جھونکے کے ساتھ زمین کو پکارتی ہیں: "میں نے تجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑا۔"

البتہ لوگ دل ہی دل میں کہہ رہے تھے کہ یہ فیصلہ کس کس کا فیصلہ ہے، عدالت کا یا کسی اور!

باب تحقیق وتنقید

شمس الرحمٰن فاروقی کی غزل گوئی-ایک جائزہ

پروفیسر عزیز بانو، شعبۂ فارسی، مانو، حیدرآباد

'غزل' شعروسخن کے کلاسیکی عہد ہی سے بہت ممتاز اور معروف صنف مانی جاتی ہے۔جس کو ناموراور عظیم اساتذۂ سخن نے پروان چڑھایا اور عروج کی بلندیوں سے ہمکنار کروایا۔اسے اگر سعدی شیرازی نے عشق کی حلاوت وچاشنی عطا کی تو حافظ شیرازی نے عرفان اورتصوف کے میخانے آباد کیئے۔ جہاں،امیرخسرو نے سماع کی شبستانوں کو رونق بخشی، وہیں صائب تبریزی نے معنی آفرینی کے چمن زار کھلا دیئے۔اور مرزا بیدل نے حیرت کے آئینہ خانے سجادیئے۔ پھر میرتقی میر نے اپنی شورانگیزیوں سے جذبات کا ایک بحرِ زخّار بنادیا، اورمرزا اسداللہ خان غالب نے توعشق وعرفان، فلسفہ وتصوف،اوراحساس وجذبات کی تمام ترنیرنگیاں کشید کرغزل کے جام ومینا پُر کر دیئے۔غزل کی صدیوں پرمحیط اس مسافرت کے بعد بیسویں صدی کے وسط میں شمس الرحمٰن فاروقی نے اسی دشت کی سیاحی اور صحرا نوردی کا بیڑا اٹھایا۔اور غزل کے کلاسیکی اسلوب کے روایتی پیراہن کو اک گونہ شگفتگی عطا کر کے ایک منفرد ڈگر اپنائی۔ اوراردوغزل کوکلاسیکیت سے آراستہ کرتے ہوئے جدیدیت سے آشنا کروایا۔

شمس الرحمان فاروقی کی غزل گوئی کو کلاسیکی شعریات اور جدید تنقیدی معیارات پر پرکھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بحیثیت غزل گوان کا بہت ہی منفرد بلکہ ممتاز مقام حاصل ہے۔اپنے پہلے شعری مجموعے " گنج سوختہ " میں مرزا غالب کی غزلوں پر لکھی غزلیں کچھ تقلیدی رنگ کی حامل ضرور ہیں۔لیکن ابتدائی دور کی غزلوں میں بھی شمس الرحمان فاروقی نے صنف غزل کو اپنے منفرد اسلوب میں ڈھالنے کا آغاز کر دیا تھا۔ابتدائی غزلوں میں تغزل کے آہنگ کو ان اشعار میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

موسمِ سنگ ورنگ سے ربطِ شرارکس کو تھا

لحظہ بہ لحظہ جل گئی دردِ بہار کس کو تھا

سرحدِ آسمان کے پاس، جال بچھے تھے ہرطرف

کس نے کیا ہمیں اسیر، شوقِ شکار کس کو تھا

انگلیاں سرد ہیں، پھونکیں تو انھیں ہوش میں لائیں

اپنے سینوں پہ لکھیں، حرفِ وفا تازہ کریں

شمس الرحمان فاروقی کے تنقیدی نظریات کے مطابق کلاسیکی اردو غزل کی شعریات جن تصورات پر قائم ہیں ان میں ایہام، رعایت اور مناسبت خاص اہمیت کے حامل ہیں۔اور اسکے ارتقاء کی پہلی اہم منزل معنی آفرینی اور خیال بندی کلاسیکی غزل کی مقبول ومعروف خصوصیت بن گئی۔تہہ دار اور حرکیاتی الفاظ کا انتخاب غزل کے ہر شعر کو جذبات و احساسات کا چڑھا ہوا دریا بنا دیتا ہے۔میر تقی میر کے کلام کی شورانگیزیوں نے شمس الرحمان فاروقی کی غزلوں میں بھی تلاطم بپا کر دیا ہے۔جسکا اظہار ان کے آخری مجموعہ کلام '' آسمان محراب'' کی غزلوں کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ یہ غزلیں انکے آخری زمانے کی کہی ہوئی ہیں۔میر کی شاعری سے انکی اثر پذیری کے متعلق پروفیسر مظفر حنفی نے بھی اپنے مضمون '' شمس الرحمان فاروقی بحیثیت شاعر (آسمان محراب کے تناظر میں)'' میں ظاہر کرتے ہیں۔:'' چنبیلی کے نیچے مٹی صرف ایک موسم کی گلباری سے معطر ہو جاتی ہے۔فاروقی نے تو بیس برس میر کی چھتنار غزلوں کے تلے بسر کئے ہیں۔انکی غزل کو تو ابھرنا ہی تھا نکھرنا ہی تھا۔ بلاشبہ '' آسمان محراب'' اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں سمیت شمس الرحمان فاروقی کو نئے شاعروں کی صف میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔''

(کاروانِ ادب، صفحہ۔۔119)۔

شمس الرحمان فاروقی کی غزلوں میں روایت جدید پہلوؤں سے ابھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔۔۔

اشارہء گیسو میں انوکھی نرمی تھی

عجیب سا لہجہ گفتگوئے قد میں تھا

زرد خشک آوارہ برہم کوہ و صحرا کچھ کہو

کس کا دشمن شیشہ ہے، پتھر ہے کس کا آشنا

خاک اب سارے سمندر پہ ہوا کی اڑتی ہے

کوئی آ کر کے مرا سینہ و سر پتھر کردو

ہم برگ زرد سبز خلاؤں میں کھو گئے

ہم کو ہوائے سرد تھی سنگِ گراں جناب

فاروقی صاحب کی غزلیں ان کے گہرے مشاہدے، جذبہ و احساس کی شدت اورفکر وخیال کی قوت کی غمازی کرتی ہیں۔وہ اپنی غزلوں میں زندگی اور کائنات کی ایسی پراسرار فضاؤں میں پرواز کی منظرکشی کرتی ہیں۔کہ قاری بھی انکے ہمراہ فضاؤں کی تیرگی، روشنی اور پرخطر راہوں کے نظاروں کے ساتھ ساتھ دلکش شگفتگی اور نیرنگیوں کا مشاہدہ کرتا ہوامحسوس کرتا ہے۔

رقص نسیم موت تھا ہر چند مختصر

دریا کے منہ پہ پھر بھی اچھل آئے آبلے

ڈوب کر آنکھوں میں تیری بیکراں تک گھومتا

جسم سے اپنے نکل کر آسمان تک گھومتا

شمس الرحمان فاروقی کی غزل میں داخلی کیفیت کا تاثر بہت شدید ہے۔انکی غزل کی داخلیت کے بارے میں ڈاکٹر احمد محفوظ، اپنے تاثراتی مضمون ''پرچھائیوں سے کون ومکان کس طرح بنے'' میں رقمطراز ہیں: '' شمس الرحمان فاروقی کی غزلوں میں جو دنیا نظر آتی ہے وہ خارجی کم داخلی زیادہ ہے۔۔۔۔دراصل انھوں نے مظاہر کائنات کو اپنی داخلی زندگی میں جذب کر کے ایک نئی دنیا خلق کی ہے۔ جو شاعر کی اپنی دنیا ہے۔اور یہ دنیا عرصہء خیال میں آباد ہے۔''

(شمس الرحمان فاروقی۔شخصیت اورادبی خدمات،صفحہ۔191)

داخلی کیفیت کے اظہار کی مثال کے طور پر چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

ساحل، صورت، صدا، سمندر، سب

سوکھے ہوئے دست و پا کا صحرا ہے

ایک کانٹا تھا کہ پہلو میں ترازو ہوگیا
نوک پر خون جم رہا، بس ہو چکی یاری تمام
قدیم نقش آشنائی دل میں آکے گم ہوا
خیال طرفہ شعلگی بیان بن کے مٹ گیا
ٹھہر گیا دل دریائے زرد شب یوں ہی
نہ کوئی برق سا چمکا، نہ میں شکار ہوا

روایتی اسلوب کو فاروقی صاحب محاسن شعری سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہیئتی بندشوں کی بجائے وہ فکری سلاسل سے آزادی کو شعر کے لئے مفید مانتے ہیں۔ الفاظ کی حرکیاتی اور جدلیاتی کیفیت کے طرفدار ہونے کے ساتھ ساتھ معنی در معنی متنوع کیفیات کو اپنے اشعار مخں متعارف کروانے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔

فوارہ چھوٹا خوشبو ہوا میں پھیل گئی
تھا قہقہہ یک لمحہ، مگر ابد میں تھا
بڑھتے بڑھتے بن گیا میں سنگ سے دیوار سنگ
اسلئے ٹوٹی پڑی ہے مجھ پہ آبادی تمام

یوں تو کلاسکیت اور جدیدت میں کوئی بیر نہیں ہے۔لیکن کلاسیکی شعرا کے کلام کے کثیر مطالعہ نے فاروقی صاحب کو بتدریج کلاسیکیت سے قریب تر کردیا۔شعر میں معنی آفرینی اور لفظ کے انتخاب کی خوبی انکی غزل کو متلاطم دریا کی صورت بخشی ہے۔ جو انکی غزلیات میں بھرپور جوش میں ٹھاٹے مارتی نظر آتی ہے۔

کبھی چپ تو کبھی محو فغاں دل
غرض اک گو مگو میں یہ رہاہے
کالے گھنے پیڑ پر برف کا اجلا مکان
تیرے نفس کی مہک گل سے بھی شاداب رنگ
توڑ کر لے لو مجھے، شاخ پہ مرنے مت دو

نہ جسے دیکھیں تو گم ہو، نئی خوشبو میں ہوں
ہے تیرا جسم جس آتش بہار سے روشن
مرے وجود کو تابِ شرر اسی سے ملی

نئی تخلیقی روایت کی دریافت اور نئے طرز فکر کی مدد سے شمس الرحمان فاروقی جدید استعاروں، جدید شعری زبان، جدید موضوعات، اور جدید لہجوں کے ساتھ جذبات واحساسات کی گوناگوں کیفیات کو بیان کرنے میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ جوکہ ان کی تنقیدی بصیرت اور اسلوب شناسی کے ادراک کے سبب ان میں فروغ پانے لگی تھی۔ یہ وہ منفرد خوبی ہے جو فاروقی صاحب کو اپنے معاصر شعرا میں ممتاز درجہ کا حامل بناتی ہے۔ان کی لفظ شناسی، موسیقیِ شعر وآہنگ کلام اور سخن فہمی کے شعور کے باعث وہ اردو کی کلاسیکی شاعری کے اعلی پایہ کے نباض کی حیثیت اختیار کر گئے۔اور الفاظ کی یہی معنی آفرینی ان کی غزل کو نغمگی سے بھرپور، دل واحساس کو چھولینے والے والا بیش قیمت ہنر عطا کرتی ہے ۔چنانچہ انکی جدت طرازی کے چند نمونے پیش ہیں:

بنائے بنتی نہیں منہدم بنائے دل
کدھر ستون ہے کہاں کرسی اور کہاں محراب
بس ایک رشتہ ہے جس میں پرو گئی ہوگی
وہ اشک خواب سے چہروں کو دھو گئی ہوگی
جانے کب سے بےنشان وہ چاہِ شب میں غرق تھا
میں جو اٹھا، ہوگیا اک دم اجالا آسماں

شمس الرحمان فاروقی نے اپنی غزلوں میں مرکب علامتوں کا بھرپور استعمال کیا ہے۔جنکا تعلق بنیادی طور پر انسانی زندگی اور اسکے مسائل سے ہے۔ انھوں نے مٹی، آگ، آسماں، محراب، روشنی، سبزہ، چہرہ، خواب، صبح، شام؛ شب وغیرہ علامات کو انسانی زندگی کی گوناگوں حقیقتوں کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔اوران میں آسمان کو ایک کلیدی علامت کی حیثیت حاصل ہے۔ جو کی زندگی کے افق کی کشادگی، بلندی، عروج اور پہنائی، روشن فکری،

تخیل کی پرواز کی تعبیر مانی جاتی ہے۔اوہ گرد وپیش کی زندگی سپنا در استعارے اخذ کرتے ہیں۔
خیال کی گہرائی اور الفاظ کی گیرائی میں انکی غزل کوفوقیت حاصل ہے۔

اچھا ہے کہ ہے، جلدِ بدن کانٹوں سے مانوس
مجھ سے یہ قبا ورنہ اتر نی تو نہیں تھی

بھلا اس جستجوئے سائبان ودر سے کیا حاصل
مجھے معلوم ہے مجھ کو وہ دوزخ ہی میں گھر دے گا

ہے اتنا حبس پھر بھی؛ زبان کھولتے ہیں ہم
اے ابر ِگرد، سعئ تکلم پہ مت برس

الغرض، شمس الرحمان فاروقی کی غزل گوئی عہد جدید میں اپنے معاصر شعراء کے کلام دے بہت مختلف ہے اوران کی غزلوں میں فکر وتخیل کی وسعت اور تازگی کی بناء پر وہ بہت ہی منفرد اور ممتاز حیثیت کے حامل تسلیم کئے جاتے رہیں گے۔

ڈاکٹر کہکشاں پروین اوران کا ایک افسانہ

ڈاکٹر دانش حماد

شعبہ اردو، ٹاٹا کالج، چائباسہ، جھارکھنڈ

افسانہ جسے ہم مختصر کہانی سے تعبیر کرتے ہیں جس میں حیات انسانی کا عکس یا کوئی گوشہ اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ جسے ایک ہی نشست میں پڑھ کر قاری ذہنی تفریح حاصل کرتا ہے۔افسانے کی خصوصیت ہے کہ ایک واقعے یا تجربے کا نقشِ واحد قاری کے ذہن میں چھوڑ دیتا ہے۔افسانہ پڑھ کر بھی قاری کا ذہن کافی دیر تک افسانے میں ہی اٹکا رہتا ہے اسی چیز کو ہم وحدت تاثر سے تعبیر کرتے ہیں جو افسانے کی پہچان ہوتی ہے افسانے کا لازمی عنصر ہے۔

ہر فنکار یا ادیب کے فن پارے میں ایک نظریہ بھی پنہاں ہوتا ہے اپنے فن پارے کے ذریعے وہ قاری تک اپنے نظریے کو پہنچانا چاہتا ہے۔ادب کے دو نظریے جس سے ہر خاص و عام واقف ہے وہ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی ہے۔ترقی پسند تحریک کے بعد ادب برائے زندگی کا نظریہ عام ہوتا گیا اور یہ نظریہ کارگر بھی ثابت ہوا۔کوئی بھی فن پارہ محض ذہنی تفریح کا سامان کہلائے تو وہ دیر پا نہیں رہتا مگر جب کسی فن پارے میں سماج اور زندگی سے جڑے مسائل ہوں، وقت اور حالات کی عکاسی ہو،اصلاحی اور آفاقی نظریہ ہو یا اس میں کوئی پیغام مخفی ہو تو ایسے فن پارے کو مقبولیت بھی ملتی ہے اور مداومت بھی۔

ترقی پسند تحریک کے بعد افسانہ نگاری نے بھی کروٹ لی با مقصد افسانے لکھے جانے لگے۔آج بھی افسانوں میں وہی رنگ باقی ہے اب افسانے محض ذہنی تفریح کا سامان نہیں ہوتے بلکہ ان کے اندر ایک پیغام،ایک سبق ایک مقصد پنہاں ہوتا ہے۔

جھارکھنڈ کی ایک معروف افسانہ نگار اور خادم اردو ڈاکٹر کہکشاں پروین تھیں جن کا انتقال گذشتہ سال ۱۷ جون ۲۰۲۴ء میں ہوا اور گزشتہ دنوں ۱۷ جون ۲۰۲۵ء کو ان کی پہلی برسی پر ''ایک شام کہکشاں پروین کے نام'' ایک سیمینار کا انعقاد انجمن فروغ اردو رانچی کی جانب سے کیا

گیا جس میں ان کی خدمات کا تفصیلی جائزہ بھی لیا گیا۔ڈاکٹر کہکشاں پروین ۲۶ فروری ۱۹۵۸ء میں پرولیا بہار (موجودہ بنگال) میں پیدا ہوئیں۔ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے گریجویشن اور ماسٹر ڈگری اردو میں رانچی یونیورسٹی سے مکمل کیا اور یہیں سے ڈاکٹریٹ اور ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔بوکارو مہیلا کالج میں ۹ سال آپ نے بحیثیت لکچرر خدمات انجام دیں اور ۱۹۹۶ء میں بہار وروس کمیشن سے آپ کی تقرری ڈورنڈا کالج رانچی میں ہوئی۔۲۰۱۵ء میں رانچی یونیورسٹی کی صدر شعبہ اردو مقرر ہوئیں اور یہیں سے فروری ۲۰۲۳ء میں فرائض سے سبکدوش ہوئیں۔ آپ کے ۵ افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ایک مٹھی دھوپ، دھوپ کا سفر، سرخ لکیریں، پانی کا چاند اور مور کے پاؤں۔اس کے علاوہ تنقیدی و تحقیقی کتابیں بھی شائع ہوئیں جن میں 'صالحہ عابد بحیثیت ناول نگار' 'منٹو اور بیدی کا تقابلی مطالعہ' منٹو اور واجدہ تبسم کے نسوانی کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ' شیشہ افکار اور نظریۂ ادب شامل ہیں۔

افسانہ کھیل کھیل میں کا خلاصہ:

دیہات میں مشترکہ خاندان کی منظر نگاری کے ساتھ افسانے کی ابتداء ہوئی ہے ایک بڑا خاندان جس میں کئی بھائی مل جل کر رہتے ہیں بڑا آنگن اور باغ کشادہ چھت گویا گھر پر ہی تفریح کے سامان میسر ہوں۔جہاں بچے آنگن میں کھیل کود کرتے وہیں لڑکیاں چھت پر گھروندے بنا کر کھیلتی گڈے گڑیوں کے گھر بھی بڑے تھے ان کی بھی شادی عقیقہ منگنی اور دیگر رسم و رواج ہوتے تھے۔ایسی ہی ایک گڈے اور گڑیا کی شادی کا موقع تھا اور شادی کے بعد بچوں کے امتحانات ہونے کی وجہ سے اس کھیل کو کچھ دن تک بند کر دیا گیا تھا مگر گھر کی سب سے بزرگ خاتون بڑی امی جو خود بھی اس کھیل میں بچوں کے ساتھ شریک ہوتی تھی انہوں نے جب دیکھا کہ اسکول کے وقت بھی ننھی صائمہ تیار ہو کر چپکے سے چھت پر جا رہی ہے تو خاموشی سے اس کا پیچھا کیا اور اوپر جا کر دیکھا تو عجیب منظر تھا گڈے اور گڑیا کے کپڑے الٹے تھے اور گڈا گڑیا کے اوپر تھا گڈے کا ایک ہاتھ گڑیا کے سینے پر تھا۔ یہ ہوش ربا منظر دیکھ کر بڑی امی بوکھلائیں اور بچی کو پکڑ کر نیچے لائیں اور آنگن میں لا کر طمانچے رسید کرنے لگیں اور پوچھنے لگیں کہ بتا تجھے یہ سب کس نے بتایا ۔ بچی نے معصومیت سے کہا میں تو کھیل رہی تھی۔بڑی امی روتے ہوئے پوچھنے لگیں کہ تجھے اس طرح کھیلنا کس نے سکھایا؟ گھر کے سارے لوگ جمع ہو گئے تو بچی نے اپنے چچا کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ چچا جان نے بتایا کہ کھیل کھیل میں ایسا بھی ہوتا ہے

افسانے کا تجزیہ:

بنیادی طور پر آپ افسانہ نگار تھیں افسانے سے اردو ادب میں قدم رکھا اور پھر کبھی پلٹ کر نہ دیکھا۔ ہر ایک فنکار کسی ایک نظریے کا حامل ہوتا ہے کوئی ادب برائے ادب کا تو کوئی ادب برائے زندگی کا حامل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کہکشاں پروین بھی ادب برائے زندگی کے نظریے کی حامل ایک افسانہ نگار تھیں۔ ان کے اکثر افسانوں میں ایک نظریہ عام ہوتا ہے جس میں زندگی سے جڑے مسائل، حالات کی عکاسی اور سماجی مسائل رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ زیر بحث افسانہ ''کھیل کھیل میں'' بھی سماج میں پنپ رہے ایک بڑے مسئلے کی طرف قاری کا دھیان مبذول کرتا ہے۔

ڈاکٹر کہکشاں پروین نے اس افسانے کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بچے بالکل کورے کاغذ کی طرح ہوتے ہیں یہ ہر اس بات کو نوٹ کرتے ہیں اور ذہن پر منقش کرتے جاتے ہیں جو ان کے بڑے ان کے سامنے کرتے ہیں۔ اور بعد میں اسے دہراتے ہیں جسے دیکھ کر ہم اپنے بچوں کے ساتھ مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ جیسا سلوک کرتے ہیں۔ قصوار تو والدین کی ہوتی ہے اور سزا بچوں کو ملتی ہے۔ بعض اوقات کچھ کم عقل لوگ بھی ہمارے گھر میں ہوتے ہیں جن کو یہ تمیز نہیں ہوتی کہ بچوں کو کیا بتانا ہے اور کیا نہیں۔ بچوں کے ساتھ ان کی گفتگو کیسی ہونی چاہیے اور اس بات کا بچوں پر کیا اور کیسا اثر پڑے گا۔ کئی بار اس چیز کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ بچے لوگوں یا مہمانوں کے سامنے ایسی حرکتیں کرنے لگتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے والدین کو شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ ان سب کی ایک وجہ یہ ہے کہ جب بھی والدین یا گھر کے بڑے خلوت اختیار کرتے ہیں یا کچھ ایسی باتیں کرتے ہیں جسے گھر کے باہر نہیں جانی چاہیے تو بچوں سے بے پرواہ ہو کر کرتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ بچے تو کھیل میں مشغول ہیں یہ ہماری باتوں پر توجہ نہیں دے رہے جب کہ بڑوں کی ایک ایک بات بچے نوٹ کرتے ہیں اور دوسری جگہ اسے دہراتے بھی ہیں۔

ہمارے معاشرے میں ایسے واقعات آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں اس کی اصلاح کے لئے اپنے پیغام کو عام کرنے کے لئے کہکشاں پروین نے ایک مربوط پلاٹ کا انتخاب کیا، سادہ سلیس الفاظ اور جملوں کی چابکدستی کے ساتھ ایک دلکش اور دلچسپ افسانہ ''کھیل کھیل میں'' قاری کے حضور پیش کیا ہے۔ گھروندے اور گڈے گڑیا کے کھیل کی منظر کشی

میں بھی وہ پوری طرح کامیاب رہی ہیں۔افسانہ کے ابتدائیہ میں ہی سارا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے گویا ہم افسانہ پڑھ نہیں رہے بلکہ اس واقعے کا بہ نفس نفیس مشاہدہ کررہے ہیں۔کہکشاں پروین کی منظر نگاری کا ایک مختصر نمونہ ملاحظہ کریں:

''وہ مشترکہ خاندان تھا اور گھر بھی ایک ہی تھا کافی بڑا گھر اوپر نیچے ملا کر چودہ کمرے تھے۔دو بڑے آنگن تھے لمبا چوڑا برآمدہ تھا ایک طرف باغ بھی تھا جہاں پیڑ پودوں کی شادابی ہمیشہ رہتی تھی ۔کشادہ باورچی خانہ تھا تمام لوگوں کے کھانے ایک ہی جگہ بنتے تھے۔چھوٹے بڑے سب مل جل کر ہنسی خوشی دن گزارتے تھے۔لڑکوں کے کھیل کود کے لئے جہاں آنگن اور برآمدہ تھا وہیں لڑکیوں کے لئے گھروندے بنے ہوئے تھے۔ یہ گھروندے پہلی منزل پر تھے جس طرح گھر کے افراد زیادہ تھے اسی طرح گڈے گڑیوں کی تعداد بھی زیادہ تھی ۔اس لئے گھروندے بھی کشادہ تھے۔سب کے کمرے الگ الگ تھے بستر قرینے سے بچھے رہتے چھوٹی چھوٹی مسہریاں لگی ہوئی تھیں ۔ ان پر مچھردانیوں کا بھی انتظام تھا۔ جب گھر میں رنگ روغن ہوتا تو گھروندے پر بھی لیپا پوتی ہوجاتی۔گھروندے کی چھت بھی کافی شاندار تھی چاروں طرف خوبصورت دیواریں تھیں اور درمیان میں صاف شفاف چھت تھی یہاں موسم کا خاص خیال رکھا جاتا گرمی کے حساب سے اس کی سجاوٹ اس طرح سے کی جاتی گڈے گڑیوں کو ہلکے پھلکے لباس پہنا دئے جاتے اور جاڑے کا موسم شروع ہوتے ہی انہیں گرم کپڑوں میں ملبوس کردیا جاتا۔ کپڑوں سے بنی ہوئی گڑیاں اور گڈے فنکاری کے بہترین نمونے تھے ایسا لگتا تھا کہ یہ کسی انسانی شکل وشباہت کی پرچھائیاں ہیں فرق صرف بے جان ہونے کا تھا''

(افسانہ کھیل کھیل میں، پہلا اقتباس)

اس افسانے کے پہلے اقتباس میں ہی منظر نگاری کا خوبصورت نمونہ ملتا ہے۔اس اقتباس میں گھروندوں گڈے گڑیوں کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے جسے پڑھ کر اپنا بچپن اور گڈے گڑیوں کا کھیل یاد آجاتا ہے۔گڈے گڑیوں کی شادی بیاہ، رخصتی ،عقیقہ کن چھیدن

،بارات وغیرہ ہر رسم کا تفصیل کے ساتھ افسانہ نگار نے ذکر کیا ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ افسانہ نگار نے اس افسانے میں پلاٹ اور کردار سے زیادہ منظر نگاری پر اپنی پوری قوت جھونک دی ہے۔اور یہ افسانہ کہکشاں پروین کی منظر نگاری کے لئے عمدہ مثال ہے۔

کہکشاں پروین کا افسانہ ''کھیل کھیل میں'' ہمیں گزشتہ ۲۵ سے ۳۰ سال پیچھے لے جاتا ہے جہاں انسان تفریح کے لئے موبائل ٹی وی کا استعمال نہیں کرتا تھا اس وقت بچوں کے ساتھ بڑے بھی گڈے گڑیوں کے اس کھیل میں شامل ہوتے تھے۔شادی بیاہ منگنی اورعقیقہ کی رسمیں بھی ادا کی جاتی تھیں۔ایسے ہی کھیل کھیل میں بچوں کے کم عقل چچانے اپنی بے وقوفی کا ثبوت دیتے ہوئے بچوں کے سامنے خلوت کے منظر کو بے نقاب کر کے انہیں یہ سکھایا کہ شادی کے بعد دولہا دلہن کو اس طرح کے بھی کھیل کھیلنے ہوتے ہیں۔اور یہ بچوں کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہے۔افسانے کے کردار بھی زندہ اور سچے معلوم ہوتے ہیں۔معصوم سائمہ کے کردار کے ذریعے افسانہ نگار نے کہانی کا تانا بانا بنا ہے اور سماج کو اس مسئلے کی طرف غور کرنے کے لئے آمادہ کیا ہے۔اس افسانے کا سب سے متحرک اور جاندار کردار بڑی امی کا ہے جس کے اندر ہم اپنے گھر کی بڑی اور بزرگ خاتون کا عکس دیکھتے ہیں۔ بڑی امی (کردار) گھر میں بڑی ہونے کی ذمہ داری بخوبی نبھاتی نظر آتی ہے اور پورے افسانے میں حاوی نظر آتی ہے۔افسانے میں ایک کردار جس کا ذکر بہت ہی مختصر ہے صرف ایک بار ہی افسانے میں اس کا ذکر ہوا اس کے باوجود یہ کردار افسانہ کے اختتام کے بعد کافی دیر تک ذہن میں رقص کرتا رہتا ہے وہ ہے'' چچا جان'' کا کردار جو افسانے کے اختتام میں عین وقت پر نمودار ہوتا ہے اور پوری کہانی پر چھا جاتا ہے۔ چچا جان کے مختصر کردار کے ساتھ ہی کہکشاں پروین نے افسانے کا رخ اچانک موڑ دیا اور ہر ایک کی نظر چچا جان پر ہی مرکوز ہو جاتی ہے۔اور قاری کافی دیر تک چچا جان کے بارے میں ہی سوچتا رہتا ہے۔

ایک افسانہ نگار کے لئے موضوع کے انتخاب اور پلاٹ کی ترتیب کے بعد سب سے بڑا مسئلہ اختتامیہ/کلائمکس کا ہوتا ہے۔افسانہ نگار اس بات پر بہت زیادہ توجہ دیتا ہے کہ افسانہ کا کلائمکس جاندار ہو۔اختتامیہ کا لمحہ ہی وہ لمحہ کے جس کے بعد قاری کافی دیر تک افسانے سے نکل نہیں پاتا۔اس افسانے کے اختتام کا بھی مختصر نمونہ ملاحظہ کریں:

''اسی اثنا میں صائمہ کے سجے سجائے بالوں کو بڑی امی نے بے دردی سے نوچ

ڈالا۔۔۔کیا کر کے آئی ہے؟

صائمہ اس افتاد سے گھبرا کر رونے لگی۔میں نے کیا کیا؟

گھروندے میں کیا گل کھلایا تم نے؟ بڑی امی غضب ناک ہوکر اسے تھپڑیں لگاتی جا رہی تھیں۔

میں تو کھیل رہی تھی۔اتنی دیر میں گھر کے سارے لوگ جمع ہو چکے تھے کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔بول کہاں سے سیکھا؟ کس نے بتایا تجھے؟ بڑی امی کے لبوں پر ایک ہی تکرار تھی۔

وہ۔۔۔وہ۔۔۔ساٹ سالہ صائمہ کی نگاہیں سامنے کھڑے ہوئے حواس باختہ چچا جان پر رک گئیں۔

''انہوں نے بتایا تھا کہ کھیل میں ایسا بھی ہوتا ہے''۔

ننھی صائمہ روئے جا رہی تھی اور اب بڑی امی کی چیخ و پکار بھی آنسوؤں میں گم ہوگئی تھی۔

افسانہ کھیل کھیل میں کا اختتام بھی قاری کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔اس افسانے کا کلائمکس بہت ہی مختصر مگر جاندار ہے جو افسانے کی کامیابی کا ضامن ہے۔آخری منظر کے مکالمے بھی بہت چست ہیں۔کہکشاں پروین نے افسانے کے فن کو ملحوظ رکھتے ہوئے بڑی کامیابی کے ساتھ ہر ایک جز پر توجہ کی ہے اور اسے نبھانے کی کوشش کی ہے مگر منظر نگاری سب پر حاوی ہے۔

ڈاکٹر دانش حماد،شعبہ اردو ٹاٹا کالج، چائباسہ جھارکھنڈ 6205005454

''اثر انگیز شاعر''۔۔۔۔اثر حامؔد

محبوب یوسف زئؔی

سکریٹری ''بزم زکی'' کڈپہ۔سیل : 7207773287

سرسری ایک نظر! اس میں قباحت کیا ہے
ایک پارینہ رسالہ ہوں اٹھالو مجھ کو
یہ کس خیال کی وسعت کا سلسلہ ہوں میں
کوئی سمجھ نہ سکا آج تک کہ کیا ہوں میں؟
(حامداثر)

میری نظر میں شاعری خود شاعر کے خیالات ،تجربات، مشاہدات، جذبات و احساسات کی ترجمان ہوتی ہے۔چاہے ظلم وستم ہو یا مہربانیاں،عدل وناانصافی،حوادثات ہوں یا پھر تجربات خود شاعر پر بیتے ہوئے ہوتے ہیں۔تمام تر جذبات واحساسات کوشاعر بڑے ہی ماہرانہ انداز میں شعر کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔بالفاظ دیگرشاعری شاعر کے داخلی وخارجی کیفیات کے اظہار کا ذریعہ ہے۔جسے شاعرشعر کا جامہ عطا کرتا ہے۔جس سے گزر کر قاری یا سامع کہہ اٹھتا ہے۔''یہ بات وہی ہے جومیرے بھی دل میں ہے۔''

غزل کوکسی نے''نیم وحشی صنف سخن'' کہا ہے توکسی نے غزل کو''اردوشاعری کی آبرو'' ۔میری نظر میں ہر شاعر کی شاعری کا ''پہلا زینہ غزل'' ہی ہوتی ہے۔غزل ہر شاعر کی شاعری کی دل کی دھڑکن ہے۔

کڈپہ میں دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض غزل گوشعرانظم نویسی کی جانب بھی مائل ہوئے ہیں۔اورنظم کے ہی ہوکر رہ گئے ہیں۔مگرجن شعرأ نے اپنے جذبات واحساسات کے اظہار کے لیے غزل کو وسیلہ بنایا ان میں ایک نام حامؔد اثر کا ہے۔جوگمنام شخصیت کے حامل

ہیں۔گمنام اس لیے کہ تلاش معاش کے لیے انہوں نے تارک وطن ہونا پسند نہیں کیا اور اپنے آپ کو کڈپہ شہر ہی میں موجود مسجد اقصی کے روبرو ایک چائے کی ہوٹل کے مالک کی حیثیت سے اپنے آپ کو مقید کرلیا ہے۔اور مشاعروں اور ادبی نشستوں سے اپنے آپ کو کوسوں دور رکھا ہے۔میں نے انہیں کبھی بھی کسی مشاعرہ میں پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔حامد اثر سے میری پہلی ملاقات بصورت ''انشاد'' ان کے شعری مجموعہ کے ذریعہ ہوئی۔جب میں نے انشاد کو مکمل پڑھا تو میرے دل میں ان سے ملاقات کی آرزو جاگ اٹھی۔اور میں نے ان سے ملاقات بھی کی۔اثر حامد صاحب سے ملاقاتوں کے دوران مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ وہ بہت ہی خوددار ہیں۔

آثر حامد کا نام شیخ محمد اقبال ہے۔اور ادبی دنیا میں آثر حامد کے قلمی نام سے مشہور ہیں۔آثر حامد کی پیدائش آندھراپردیش کے خطۂ رائلسیما کے ایک مشہور شہر کڈپہ میں 1961ء میں جناب شیخ محبوب صاحب کے گھر میں ہوئی۔اثر حامد نے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی۔اور اس کے بعد تجارت سے وابستہ ہوگئے۔اثر حامد کو جناب الحاج ظہیر ناصری صاحب کا شرف تلمذ حاصل ہے۔

ان کی شاعری میں کہیں بھی زندگی سے نفرت ، بیزاری، مایوسی اور کسی کام کے کرنے پر افسوس، پشیمانی نظر نہیں آتی ہے۔ ہر قدم پر وہ حوصلہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔انہوں نے زندگی کے تجربات اور حوادثات کے اظہار کے لیے شاعری کو ذریعہ بنایا ہے۔ان کے مجموعۂ کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے یعنی کہ زندگی کا مزہ چکھا ہے۔ان کی شاعری میں کہیں بھی زندگی سے کسی قسم کا ڈروخوف محسوس نہیں ہوتا۔اثر حامد بے باک طبیعت کے مالک ہیں۔جابجا ان کی شاعری میں مجھے بے فکری، بانکپن، حوصلہ وہمت نظر آتی ہے۔اگر وہ کسی سے کوئی شکایت بھی کرتے ہیں تو بڑے ہی نرم انداز سے:

پھول بھی جس جگہ آگ اگلیں آثر
مجھ کو ایسی زمیں پر اتارا گیا

حامد اثر حساس طبیعت کے مالک ہیں۔انہوں نے جو کچھ دیکھا محسوس کیا، سمجھا، سوچا ان تمام تر باتوں کو وہ شعر کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ان کے اشعار نہایت ہی سیدھے سادھے الفاظ سے معمور ہیں۔جس کے پڑھنے اور سمجھنے میں قاری کو دقت محسوس نہیں

ہوتی۔حامد اثر صاحب نے اپنے تجربات،مشاہدات، جذبات واحساسات کے اظہار کے لیے مختلف تشبیہات،استعارات اور تراکیب کا استعمال کیا ہے۔جس کو انہوں نے مناسب موقعہ ومحل کے اعتبار سے برتا ہے۔جس کی وجہ سے شعر کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے۔بطور مثال:

بھیگی آنکھوں میں خواب رہتا ہے
یہ نگر زیر آب رہتا ہے
ساحل پہ مچھلیاں ہیں سمندر میں جال ہے
اک بے شعور شعر کی اچھی مثال ہے
فکر ،وحشت، اشک، مایوسی، الم
ہم غریبوں کی انوکھی عید ہے

اثرؔ صاحب نے تلمیح کا بھی استعمال بخوبی کیا ہے:

پھر کسی بھائی کو کنوئیں میں اتارا جائے
پھر حسد نام کا اک نقش ابھارا جائے

دنیا میں ان لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔جن کو مشکلات، پریشانیوں، تلخ تجربوں اور مصیبتوں وحوادثات کا ڈر رہتا ہے۔ ہر آدمی جو جینا چاہتا ہے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کا سامنا کرے اور جب کوئی آدمی ان تمام تر چیزوں سے بہرہ ور ہوتا ہے تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ یہ میری زندگی جیسی بھی ہے مجھے پسند ہے۔بقول حامد اثرؔ:

زندگی کتنی بھی کڑوی ہو اثرؔ!
ہم کو اس کی تلخیوں سے پیار ہے

شاعر چاہے جتنا بھی سنجیدہ ہو یا پھر رنجیدہ ۔ بے روزگاری سے پریشان و مایوس ہو یا نہ ہو۔وہ ضرور اپنے کلام میں اپنے محبوب کا ذکر کئے بغیر نہیں رہتا۔اثر حامد بھی اپنے محبوب کا ذکر برملا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اثر حامد کا اپنے محبوب کا ذکر کرنے کا انداز دیکھئے:

کچھ اس طرح سے بیاض سخن سجادی ہے
ہر اک غزل میں ترے نام کو جگہ دی ہے

اور جب کبھی ان کے دل میں اپنے محبوب سے جدائی کا احساس جاگتا ہے تو اس طرح کہتے ہیں کہ:

میرا خط اس نے جب چھوا ہوگا
لفظ ہر اک مہک اٹھا ہوگا
جب دل میں تیری یاد کا سکہ رہا نہیں
تنہا ہوں، میرے ساتھ کوئی دوسرا نہیں
کیا اب مری زباں پہ کھلیں گے غزل کے پھول
دل جب تری جدائی نے ویراں بنادیا

اثر حامد نے طنزیہ اشعار بھی کہے ہیں ۔اور برملا کہے ہیں۔علی الاعلان کہے ہیں ۔جن میں مشکل الفاظ سے پرہیز کیا گیا ہے۔اثر کا اسلوب طنز بھی دیکھئے کہ انہوں نے کتنی سلاست ونفاست ،اورسیدھے سادھے الفاظ میں بیان کیا ہے۔انہوں نے حالات کو جیسا سمجھا اور محسوس کیا ویسے ہی کہنے کی از حد کوشش کی ہے۔ واقعی اثر حامد کا یہ انداز شہرِ کڈپہ کے دیگر شعراً سے انہیں جدا کرتا ہے۔

خنجروں کے مقابلے پہ اثر!
بھیگے کاغذ کی ڈھال ہے بابا
پھر مرے ہاتھ کے پتھر نے کیا ایک سوال
دیکھئے بدلے میں شیشے کا خدا کیا دے گا

کڈپہ اور باشندانِ کڈپہ کی تعریف ہم خود اپنی زباں سے کیا کریں۔ بیرونِ شہر حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو جناب مظفر شہ میری صاحب کے قلم سے نکلی ہوئی تحریر پڑھئے کڈپہ اور اہلیان شہرِ کڈپہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''کڈپہ کی مٹی میں کھلے پن کی خوشبو ہے۔یہاں لوگ کھلے دل سے ملتے ہیں۔کھل کر بات کرتے ہیں۔کھل کر محبت کرتے ہیں۔اور اگر دشمنی کرنی ہوتو وہ بھی کھل کر ہی کرتے ہیں۔تصنع ، ریا کاری اور مصلحت اندیشی کو یہاں کے عمومی مزاج سے کم ہی نسبت ہے۔جو کہو برملا کہو۔جو کرو علی الاعلان کرو۔سب کے سامنے کہو۔سب کے سامنے کرو۔''

(''نظر نظر کے چراغ''صفحہ نمبر:12)

آثر حامد بھی کڈپہ ہی کے سپوت ہیں۔ اوران کے لہجہ میں اوران کے اندازِ بیاں میں اسی کڈپہ کے کھلے پن اور کھلی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنے خیالات واحساسات کے اظہار کے لیے کسی طرح کی تکلف کا شکار ہوتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے ہیں:

ظاہری ادب ہم کو ناپسند اثر صاحب
ورنہ جھوٹ کے مارے خط طویل ہوتا
مشورہ مجھ سے!مری تصنیف پر؟
ناقدو! یہ بھی کوئی تنقید ہے؟

مزید یہ بتاتا چلوں کہ میں نے ان کی کتاب پر تبصرہ کرنے کے لیے خود اثر صاحب کی رائے دریافت نہیں کی ہے اور نہ ہی ان سے مشورہ لیا ہے۔

اور اثر صاحب کے اسلوب طنز کو ذرا ملاحظہ کیجئے:

روز نیلام ہورہا ہے وقار
پھر بھی خاموش ہے وطن کتنا
کون چڑھائے گا ترے در پہ پھول
اب تو ہر اک شخص خدا ہوگیا

اثر حامد کی تقریباً تمام غزلیات تغزل سے پر ہیں۔ تاہم ان کے بعض اشعار میں گفتگو سا انداز ملتا ہے:

تمہارے نام سے نسبت کہ جس مٹی کو حاصل ہے
اسی مٹی سے پیشانی کی تنویریں بناتے ہیں۔
بڑے غرور سے بستی جو پھونک دیتے تھے
انہیں بھی فکر لگی اپنا گھر بچانے کی
جو خدا بن کر سبھی انسانوں کو اپدیش دے
آج کل ہے سب زمانہ ایسے آدم زاد کا

اور آخر میں ایک شعر دعائیہ قبیل کا ہے۔:

جس راہ تری مرضی اس راہ مجھے لے چل!
اس دہر کی گردش میں عاجز ترا بندہ ہے

آپ کے کلام میں ایک شعر اشارتاً و کنایتاً نعتیہ یا منقبتی انداز لیے ہوئے ہے:

اس یار کی محفل میں آنے کے لیے ہمدم!
بپھرا ہوا شعلہ بھی اشکوں میں نہاتا ہے

میں یہ کہنا چاہوں گا کہ آثر حامد شہرِ کڈپہ کے ''اثر انگیز شاعر'' ہیں۔ جنہوں نے بڑے ہی شستہ و سادہ انداز میں شعر کہیے ہیں۔ اپنی الگ پہچان بنائی ہے۔ آثر حامد کے وہ اشعار جو مجھے پسند آئے ہیں ملاحظہ ہوں:

پھول بھی جس جگہ آگ اگلیں آثر
مجھ کو ایسی زمیں پر اتارا گیا

مجھ کو ہر امتحان کے شایاں بنادیا
ہر حادثے نے راہ کو آساں بنادیا

میں چاہوں گا کہ آثر حامد صاحب ادب سے اپنے آپ کو جوڑے رکھیں۔ ورنہ اردو زبان و ادب واقعی ایک اچھے شاعر سے محروم رہے گا۔ اور میں اپنی بات کو خود ان کے ہی ایک شعر سے ختم کرنا چاہوں گا۔

دل کے اوراق پہ لکھا ہوا ہے نام آثر!
تو بیاضوں سے مرا نام مٹا کیا دے گا

☆

ہندوستان کے آن لائن اردو اخبار

ڈاکٹر عبدالقدوس

اسسٹنٹ پروفیسر اردو، گورنمنٹ آرٹس اینڈ سائنس کالج ،محبوب نگر، تلنگانہ

اکیسویں صدی کو ہم سائبر دور کے نام سے جانتے ہیں،جس نے نہ صرف دنیا کے مختلف شعبوں کو متاثر کیا ، بلکہ ان شعبوں میں نمایاں کارنامہ بھی انجام دیا۔کمپیوٹر اور انٹرنیٹ موجودہ دور کی سب سے زیادہ مفید اور حیرت انگیز ایجاد ہے۔اس کی مدد سے ہم دنیا کی بہت سی معلومات آن لائن حاصل کرنے لگے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ آن لائن تعلیم کا بھی رواج عام ہو گیا ہے۔ جسے ای ایجوکیشن کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس دور میں ای ایجوکیشن ،ای بکس،ای رسائل،اور ای اخبار جیسے الفاظ عام ہو گئے ہیں۔دیگر زبانوں کی طرح اردو کے بھی بہت سے اخبار آن لائن شائع ہورہے ہیں۔آج میں انہیں آن لائن شائع ہونے والے اخبار پر ایک روشنی ڈالنے کی کوشش کررہا ہوں۔

دنیا کے مختلف مما لک میں آن لائن اردو اخبار کا ایک جال سا بچھ گیا ہے۔ان سبھی کا احاطہ اس مختصر سے پیپر میں ممکن نہیں،اس لئے میں اپنے موضوع کو مختصر کرتے ہوئے ، ہندوستان سے شائع ہونے والے اخباروں کو ہی موضوع بحث بنانے کی کوشش کررہا ہوں۔ ہندوستان کی دیگر ریاستوں سے آن لائن شائع ہونے والے اخباروں کی تعداد ۲۷ ہے۔

ہندوستان کے کچھ شہر ایسے ہیں جہاں سے کئی آن لائن اخبار شائع ہوتے ہیں،ان شہروں میں حیدرآباد،لکھنؤ، دہلی اور اورنگ آباد جیسے شہر شامل ہیں۔

حیدرآباد: حیدرآباد اردو زبان و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کے حکمرانوں نے نہ صرف اردو زبان و ادب کی آبیاری کی بلکہ یہاں کی عوام نے بھی اس زبان کو قبول کر کے اس زبان کو عزت بخشی ۔یہی وجہ ہے کہ یہاں اردو بولنے والوں کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے۔اس شہر سے بھی بہت سے آن لائن اخبار شائع ہوتے ہیں،ان آن لائن شائع ہونے والے اخباروں

میں اعتماد، منصف، سیاست، گواہ، صدائے حسینی، وقار ہند، سفیر میل، انکشاف، صحافی دکن جیسے اخبار شامل ہیں۔ان اخباروں میں سیاست، اعتماد، منصف کو کافی اہمیت حاصل ہے۔حیدرآباد کا اعتماد ایک ایسا اخبار ہے جو اردو کے تمام اخباروں میں سب سے پہلے آن لائن ہوتا ہے۔اس اخبار کو صبح ۳ بجے آن لائن کر دیا جاتا ہے۔

لکھنؤ: سرزمین لکھنؤ نے تہذیبی اور روائتی اقدار کے ساتھ ساتھ تحقیقی اور لسانی سطح پر اتنا بڑا ادبی سرمایہ پیدا کیا ہے کہ اردو زبان و ادب کا تصور لکھنؤ کے بغیر ممکن نہیں۔ یہاں کی عوام کی دلچسپیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہاں سے بھی اردو کے بہت سے آن لائن اخبار شائع ہوئے۔ ان شائع ہونے والے اخباروں میں صحافت، آگ، ہند نیوز، مرکز، عوامی سالار، وارث اودھ، اودھ نامہ جیسے اخبار شامل ہیں۔ان میں روزنامہ آگ کو اس لیے سبقت حاصل ہے کہ یہ اخبار ایک ساتھ دو زبانوں میں شائع ہوتا ہے جس کا آدھا اخبار اردو اور آدھا اخبار ہندی میں شائع ہوتا ہے۔اس اخبار کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس اخبار کا روز ایک صفحہ ادبی گوشہ پر مشتمل ہوتا ہے، جس میں ادب سے متعلق تنقیدی، تحقیقی، مضامین کے ساتھ ساتھ افسانے اور غزلیں بھی روز شائع کی جاتی ہیں۔

دہلی: دہلی نے اردو کے فروغ میں مرکزی کردار ادا کیا، یہی وجہ ہے کہ اردو صحافت کے فروغ کے ابتدائی نقوش اسی سرزمین میں پیوست نظر آتے ہیں۔ جسے ہم دہلی اردو اخبار کے طور پر جانتے ہیں۔عصر حاضر میں بھی اس شہر نے صحافت کے میدان کو آگے لے جانے میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ دہلی سے شائع ہونے والے اخباروں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن کے نام یہ ہیں۔نئی دنیا، ہندوستان ایکسپریس، جدید خبریں، روزنامہ خبریں، فاروقی تنظیم ،سائبان، ہند نیوز، دعوت، ہمارا مقصد، سالار ہند، چوتھی دنیا، اردو تہذیب نیٹ، الجمیعہ، مسرت، سیاسی خبریں، میزائل ایکسپریس، قاصد، صحت اور سماج، اور مسلم دنیا۔

ممبئی: ممبئی میں اردو والوں کی خاصی تعداد بڑھی ہے جو شہر سے مضافات کے دور دراز علاقوں تل پھیل گئی ہے۔جن کی تعداد ایک اندازے کے مطابق ۴۰ سے ۵۰ لاکھ تک ہے۔ یہاں سے شائع ہونے والے آن لائن اخباروں میں روزنامہ اردو ٹائمز، ممبئی اردو نیوز، روزنامہ ہندوستان اور میرا بھارت ٹائمز شامل ہیں۔

اورنگ آباد: اورنگ آباد دکن کا قدیم علاقہ ہے جو بعد میں مہاراسٹرا میں ضم کر دیا

گیا۔ یہاں بھی اردو والوں کی اچھی خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔اسی لئے اس چھوٹے سے شہر سے بھی تین آن لائن اخبار اورنگ آباد ٹائمز، ڈیلی ہندوستان، اور ایکسپریس ایشیاء شائع ہوتے ہیں۔اردو روزنامہ اورنگ آباد ٹائمز نے ابھی ایک اور دو اپریل ۲۰۱۷ء کو اپنی گولڈن جبلی تقریب منائی ہے۔اس تقریب کے تحت قومی کونسل برائے فروغ زبان نئی دہلی کے توسط سے دو روزہ قومی سیمینار اردو صحافت کے موضوع پر منعقد کیا گیا جس میں ہندوستان بھر سے کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

ہندوستان میں آن لائن شائع ہونے والے اخبار کی ایک کثیر تعداد ہے جو اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ان اخباروں میں زیادہ تر اخبار ایسے ہیں جو شہرت تو نہیں رکھتے مگر یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے عصری منظر نامے پر قدم رکھ کر انفارمیشن ٹکنالوجی سے اردو زبان و ادب کو جوڑنے کی کوشش ضرور کی ہے۔

ہندوستان کے اہم آن لائن اردو اخبار:

ہندوستان کے اہم آن لائن اردو اخباروں میں روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو، انقلاب، سیاست، منصف، اور اعتماد ہی ایسے اخبار ہیں جو قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور ان کا سرکیولیشن بہت زیادہ ہیں۔جن میں انقلاب اور روزنامہ راشٹریہ سہارا دو ایسے اخبار ہیں جو کئی ریاستوں کے ساتھ ساتھ کئی شہروں سے ایک ساتھ شائع ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ سبھی اخبار اپنے اپنے علاقوں میں مقبولیت رکھتے ہیں۔

اب تک ہم نے ان اخباروں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے جو پیپر پر پرنٹ ہوتے ہیں۔اب ایسے اخباروں پر بھی نظر ڈال لی جائے جو صرف اور صرف آن لائن اپلوڈ کیے جاتے ہیں۔

اخباروں کو پرنٹ کرنا اور دور دراز علاقوں تک پہنچانا ایک مشکل عمل ہے، اس کام سے بچنے کے لیے کچھ افراد نے کار خیر کو مد نظر رکھتے ہوئے آن لائن اخبار شروع کیا جن میں ایک اہم نام www.baseeratonline.com کا ہے، جنھوں نے اس سائٹ پر ایک آن لائن اخبار ''بصیرت'' کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ یہ ہندوستان میں اردو دنیا کا پہلا اخبار ہے جو ۲۴ گھنٹے اپڈیٹ رہتا ہے۔اس
اخبار کو مندرجہ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔سرورق ۲۔ ہندوستان۳۔اخبار جہاں ۴۔مسلم دنیا۵۔خاص خبریں۶۔شمع فروزاں ۷۔مضامین ومقالات ۸۔جہان بصیرت ۹۔تاریخ وادب ۱۰۔سیرت وشخصیت ۱۱۔اسلامیات ۱۲۔خواتین واطفال ۱۳۔طب وسائنس۔

ساحل آن لائن نیٹ(sahilonline.net): بھٹکل سے آن لائن اپلوڈ ہونے والا اخبار ہے اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک ساتھ تین زبانوں اردو، انگریزی، اور کنٹر میں شائع ہوتا ہے۔

اخبار اردو ڈاٹ کام(www.akhbarurdu.com): ہندوستان کی بے حد مقبول سائٹ ہے اس سائٹ پر ہندوستان سے شائع ہونے والے ہندی اردو اور انگریزی کے تمام اخبار اپلوڈ کردیے جاتے ہیں۔آن لائن اخبار کو سرچ کرنا ہرایک کے بس کی بات نہیں اس سائٹ نے اس کمی کو پورا کرنے میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔

مضامین ڈاٹ کام: اس سائٹ کا قیام ایک اپریل ۲۰۱۶ءکو عمل میں آیا اس کا بھی مقصد ہندوستانی عوام تک روزانہ شائع ہونے والے اخبارات کو پہنچانا ہے۔

آخر میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جام جہاں نما کلکتہ ۱۸۲۲ء سے شروع ہونے والے اخبار نے آج عصر حاضر میں ترقی کے کئی منازل طئے کرچکی ہیں۔عصر حاضر میں ہمیں اب اخبار آنے کا انتظار نہیں رہتا بلکہ ہم اپنے موبائل، لیپ ٹاپ یا ڈیسک ٹاپ پر آن لائن اخبار پڑھ لیتے ہیں۔ بہت سے اخبار کے باقاعدہ طور پر موبائل ایپ بھی تیار کئے گئے ہیں، جہاں پر ہمیں روز کا اخبار موصول ہو جارہا ہے۔ یہ ایک خوش آئند خبر ہے کہ اردو کو عام کرنے میں ان اخباروں کے ساتھ ساتھ انفارمیشن ٹکنالوجی نے بھی نمایاں رول ادا کیا ہے۔

Dr.ADBUL QUDDUS

Assistant Professor in Urdu

Govt.Arts & ScienceCollege

Mahabubnagar,Telangana State.509001

7416708158

quddusnoorani@gmail.com

بیباک صحافت کا علمبردار: ہفت روزہ ''رہبر''

ڈاکٹر شیخ عمران

اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو

وسنت راؤ نایک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز، ناگپور (مہاراشٹر)

صحافت نہ صرف ملک وقوم کی آئینہ دار ہوتی ہے بلکہ سیاسی، سماجی، معاشرتی، ثقافتی ،تہذیبی اور تمدنی قدروں کی ترجمان بھی ہوتی ہے۔ زمانہ قدیم سے سماج کو بہتر بنانے کا فریضہ صحافت انجام دیتی آئی ہے۔ معاشرے میں پھیلی برائیوں کو دور کرنے میں صحافت کا اہم رول رہا ہے۔ یہ ایک ایسا فن ہے جس کے ذریعہ بہت سے کام کیے جاسکتے ہیں، اس کی اوّلین شرط یہ ہے کہ تخلیقی قوتوں کو صحیح اور موثر انداز میں برتا جائے۔ اردو صحافیوں نے ان اصولوں کو سامنے رکھ کر صحافتی خدمات انجام دی ہیں۔ موجودہ دور سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے۔ برقی صحافت آج عروج پر ہے۔ باوجود اس کے مطبوعہ صحافت کی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔ ترقی یافتہ دور میں اخبارات کی طاقت بہت بڑی طاقت تسلیم کیا گیا ہے۔ اخبارات کی اہمیت ہر دور میں رہی ہے اور ہر دور میں اخبارات نے انقلاب برپا کیا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس دنیا میں ہر بڑے انقلاب میں اخبارات کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ وہ صحافی ہی تھے جنھوں نے اپنی محنت لگن اور ایمانداری سے مردہ دلوں میں جان ڈال دی۔

اردو ایک ہندوستانی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مشترکہ تہذیب کا مظہر بھی ہے۔ اردو زبان کی چاشنی سے ہر کوئی شرابور ہوا ہے۔ اردو زبان کو فروغ دینے میں جہاں مسلم شعراء، ادباء وصحافیوں نے اہم کردار ادا کیا، وہیں دوسری جانب اردو کی زلفیں سنوارنے میں غیر مسلم قلم کاروں کی بھی بڑی حصہ داری رہی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو صرف اور صرف مسلمانوں کی زبان نہ کبھی تھی، نہ ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔ ہر مذہب کے لوگوں نے اسے اپنایا ہے۔ اردو کا پہلا اخبار 'جام جہاں نما' منشی سدا سکھ لعل کی ادارت میں جاری ہوا۔ اس طرح اردو صحافت کے پہلے بانی ہونے کا فخر سدا سکھ لعل کو حاصل ہے جو غیر مسلم تھے۔ سدا سکھ لعل، ہری ہر

دت، منشی نول کشور، دیا نارائن نگم، چکبست ، ماسٹر رام چندر، رگھویر پرساد، بابو کیدار ناتھ گھوش، بنسی دھر، مکند لال، گنیش لال، بابوا جودھیا پرساد، پنڈت قلندر رام، وغیرہ کئی ایسے نام ہیں جنھوں نے اردو صحافت کی آبیاری میں اپنا خون جگر صرف کیا۔سر تیج بہادر سپر و نے اردو زبان کے متعلق لکھا ہے:

''اگر مسلمان یہ دعوے کریں کہ اردو ان کی ایجاد اور ان کی ساختہ پرداختہ ہے تو مجھے اس سے قطعی انکار ہے اور اگر ہندوایسا دعوے کریں تو وہ بھی غلط ہے۔۔۔اردو ہم ہندو اور مسلمانوں کی نا قابل تقسیم مشترکہ وراثت ہے۔یہ ہمارے اتحاد کی سب سے بڑی یادگار ہے۔ہم کئی صدی سے یہ زبان بولتے چلے آرہے ہیں۔میرے خیال میں اس سے بڑھ کر کوئی غلطی نہیں ہوسکتی کہ اس رشتے کو توڑنے کی کوشش کی جائے۔''

زبان و ادب کے حوالے سے ریاست جموں کشمیر بڑی سازگار ثابت ہوئی ہے۔یہاں اردو شعر وادب میں قلم کاروں نے مختلف ادبی حوالوں سے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ایک طویل عرصہ سے یہ ریاست اردو زبان وادب کی آبیاری کرتی آرہی ہے۔اس خطہ کی ادبی حیثیت پوری دنیا میں تسلیم کی جاتی ہے۔یہ ہندوستان کی واحد ریاست ہے جہاں اردو کو سرکاری زبان ہونے کا شرف حاصل ہے۔جہاں تک جموں وکشمیر میں اردو صحافت کا معاملہ ہے ابتداء میں یہاں صحافت کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔اخبارات کو شائع ہونے کی اجازت نہیں تھی۔صحافت کی کمی کو شدت سے محسوس تو کیا جارہا تھا لیکن عملی طور پر اس کا آغاز ہونا مشکل لگ رہا تھا۔ایسے پر آشوب دور میں ملک راج صراف نے سن ۱۹۲۴ میں ہفت روزہ ''رنبیر'' جاری ہوا۔''رنبیر'' نے ریاست میں اردو صحافت کی داغ بیل ڈالی۔اس اخبار کی اشاعت کے بعد جموں وکشمیر سے کئی اردو اخبارات منظر عام پر آئے جنھوں نے عوام کی فلاح و بہبودی کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے دامن کو بھی وسیع کیا۔صحافتی میدان میں آج یہ ریاست کسی سے پیچھے نہیں۔یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اردو صحافت کا مسلمانوں سے گہرا رشتہ رہا ہے اور مسلمانوں کی اکثریت اور اخبارات کا مطالعہ کرتی ہے لیکن ''رنبیر'' کا معاملہ یہ تھا کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اس اخبار سے وابستہ تھا۔وہ بڑے ذوق وشوق سے اس کا مطالعہ کرتے تھے۔جموں وکشمیر میں اردو صحافت اپنے ۲۰۰ برس مکمل کر رہی ہے اس طویل عرصے میں یہاں کی صحافت نے کئی دور دیکھے اور ہر دور میں اپنا کردار بڑی ذمہ داری سے ادا کیا ہے۔ریاست میں اردو صحافت کو زرخیز زمین عطا کرنے کا

اہم کام ''رنبیر'' نے کیا۔

اردو صحافت میں ملک راج صراف کا نام تعارف کا محتاج نہیں۔اردو صحافت کی آبیاری انہوں نے اپنے خون جگر سے کی۔ملک راج صراف کا نام جموں وکشمیر میں اردو صحافت کے شاندار دور کا یادگار ہے۔کم وبیش پچاس برسوں تک بطور صحافی خدمات انجام دیں۔جموں کشمیر کے بابائے صحافت کے نام سے انہیں موسوم کیا جاتا ہے۔ان کی صحافتی اور علمی لیاقت کا لوہا سب نے مانا۔ملک راج کی صحافتی جدوجہد صرف جموں وکشمیر تک محدود نہ تھی بلکہ بیرون ریاست میں بھی ان کے کارناموں کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔جموں کشمیر کے چند تاریخ ساز صحافیوں میں ملک راج صراف کا شمار ہوتا ہے۔وہ بنیادی طور پر ایک صحافی تھے۔ادب اور صحافت سے انہیں غیر معمولی دلچسپی تھی اسی لیے رنبیر کو ادب وصحافت کا حسین مرقع بنادیا۔اردو صحافت کے اُفق پر ''رنبیر'' اس وقت طلوع ہوا جب ریاست میں اردو صحافت کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ملک راج صراف نے اپنے بزرگوں کے خواب کو اپنی جدوجہد سے اس پُرفتن دور میں ایک باشعور اور تعمیر پسند صحافت کی حیثیت سے ''رنبیر'' کو منظرعام پر لاکر شرمندہ تعبیر کیا۔انہوں نے اپنے کام کا مقابلہ ایک چیلنج اور جدوجہد کے طور پر کیا۔اصولوں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔پیشہ صحافت ان کے خون میں شامل تھا۔حق گوئی ، بے باکی ، جرات مندی ،حوصلہ مندی وغیرہ اس اخبار کے نمایاں اوصاف تھے۔اخبار میں اداریہ خبروں کی پالیسی کا نہ صرف ترجمان بلکہ جان ہوتی ہے۔جس سے اس اخبار کی انفرادیت کا تعین کیا جاتا ہے۔اداریہ سے اخبار کے مدیر کے فہم وادراک کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ملک راج صراف کو اداریہ نگاری میں عبور حاصل تھا۔اپنے صحافتی دور میں کئی غیر معمولی اداریے انہوں نے لکھے جسے کافی پذیرائی ملی۔اس دور کے حالات کی عکاسی ''رنبیر'' کے اداریوں میں دکھائی دیتی ہے۔''رنبیر'' کے اداریے پرجوش اور بے خوف ہوتے تھے۔''رنبیر'' کے پہلے شمارے میں جو اداریہ لکھا گیا اس میں ''رنبیر'' کی پالیسی کو بھی واضح کیا گیا جو اس طرح سے ہے:

''دنیا میں ایک نئے دور کا طلوع ہو رہا ہے اور ہر قوم وملک ترقی کے لیے کوشش کر رہا ہے۔کچھ ممالک میں بادشاہت کا غلبہ ہے اور کچھ دوسرے ممالک میں آزادی کی جدوجہد جاری ہے۔کچھ ممالک میں سامراجیت کی بالادستی ہے اور کچھ ممالک میں اولوالعزم جمہوریت کے آگے جھک رہے ہیں۔ہر جگہ سیاسی ،سماجی اور اقتصادی قوتیں آگے بڑھ رہی ہیں۔یہ ناممکن

ہے کہ بین الاقوامی سطح پر ہونے والے واقعات سے ریاست جموں و کشمیر اثر انداز نہ ہوا اور ریاست عوام میں بھی آگے بڑھنے کا یہ جذبہ پیدا نہ ہو، یہ بیداری کی ایک صحت مند علامت ہے تاہم محض کوئی چیز چاہنے سے ہی حاصل نہیں ہوسکتی۔ کامیابی کے لیے قربانیا یثار اور استقلال کے علاوہ ایسے طرز عمل کی ضرورت ہے جو سچائی پر مبنی ہو اور یہی وہ پاک مقصد ہے جسمیں 'رنبیر' کو میدان عمل میں لایا ہے۔''

ملک راج صراف اردو صحافت کو اپنے فکر وفن سے وقار عطا کرنے والے عظیم المرتبت صحافیوں کے سلسلہ کی مضبوط اور اہم کڑی تھے۔ ان کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی۔ اپنی غیر معمولی وجاہت زور قلم اور سماجی مقام و مرتبہ کے باوجود وہ اپنے عظیم مشن اور صحافت کے ارتقاء اور استحکام کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ ان کی تحریروں میں وضاحت، اختصار، سنجیدگی نمایاں ہے۔ انہوں نے اردو زبان کو صرف زبان ہی نہیں سمجھا بلکہ وہ اس زبان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب اور علامت تصور کرتے ہوئے اردو کا تحفظ اور ارتقاء چاہتے تھے۔ ہندو مسلم دونوں طبقہ کے لوگ اس اخبار میں نامہ نگار تھے ڈاکٹر افضل مصباحی اپنی تصنیف 'اردو صحافت آزادی کے بعد' میں 'رنبیر' کی غیر جانبداری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ملک راج صراف نے کافی جدو جہد کے بعد ۲۴ جون ۱۹۲۴ کو ' ہفت روزہ رنبیر' کی اشاعت شروع کی۔ انہوں نے صداقت کے فروغ کو رنبیر کا نصب العین بنایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کشمیر کے ارباب اختیار میں صحافت یا اس کی صداقت کا کوئی مداح نہیں تھا۔ اس زمانے میں 'رنبیر' ایک باشعور اور تعمیر پسند صحافت کے معمار کی حیثیت سے اُبھرا۔ 'رنبیر' میں اس کی پالیسی کا واضح لفظوں میں ذکر کیا گیا ہیکہ یہ ایک قومی اخبار ہوگا اور کسی مذہب یا فرقے کی طرفداری نہیں کرے گا، بلکہ ریاست کے تمام باشندوں کا بلا لحاظ مذہب، ذات یا فرقہ ترجمان ہوگا۔ اس نے اپنے نامہ نگاروں کا ایک خاصہ وسیع نظام قائم کیا۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ ان میں پنڈت پریم ناتھ، کاشی ناتھ آتمہ، مولوی زین العابدین، چودھری محمد شفیع، منشی غلام رسول خادم اور خواجہ غلام قادر

بندے وغیرہ شامل تھے۔ ''

(اردو صحافت آزادی کے بعد، ڈاکٹر افضل مصباحی، ۲۰۱۳، ص ۳۶۲)

صحافی کی تحریریں جس قدر اثر انگیز، خیال انگیز اور جس حد تک واقعات سے پُر ہوگی اس قدر اس کی اثر آفرینی میں اضافہ ہوتا ہے، ملک راج صراف کی تحریریں اسی نوعیت کی حامل تھی۔ صحافتی اقدار کو بلندی اور استحکام بخشنے میں انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس اخبار کا ایک اہم کارنامہ یہ رہا کہ اس نے زندگی کے مختلف شعبوں کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کے بہت سے روشن پہلو کی طرف عوام کی توجہ مبذول کرائی۔ نئے قلم کاروں کی تحریریں شائع کر کے ان کی صلاحیت کو اُبھارنے کا اہم فریضہ ''رنبیر'' نے انجام دیا۔ اردو والوں میں ادبی جوش پیدا کرنے اور انہیں زبان کی اہمیت و افادیت سے روشناس کرانا یہ اس کے مقاصد میں شامل تھا۔ جموں و کشمیر کے معروف مصنفین اور اردو کی باکمال شخصیات کی وزنی تحریریں اس اخبار کا حصہ تھیں۔ ادبی صحافت کے متعدد نمونے اس اخبار کے حوالے سے منظر عام پر آئے جنہیں کافی سراہا گیا۔ جان محمد آزاد ''رنبیر'' کی ادبی خدمات کے پس منظر میں لکھتے ہیں:

''رنبیر کے منظر عام پر آتے ہی مقامی ادیبوں اور شاعروں کو تشہیر و ترغیب کا ایک ایسا وسیلہ مل گیا جس کی کمی کو وہ ایک عرصے سے محسوس کرتے آرہے تھے۔ 'رنبیر' اب ایک اخبار نہیں رہا۔۔۔۔۔۔اس نے بتدریج ایک ادبی دبستان کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ چنانچہ اخبار میں خبروں کیلئے علاوہ تبصرے، کہانیاں مضامین اور نظمیں وغیرہ بھی پابندی سے شائع ہوتی تھیں۔ اس کے لکھنے والوں میں لالہ ہنس راج مہاجن، پریم ناتھ پردیسی، سید نسیم، غلام حیدر خان، نند لال کول طالب، جوش ملیح آبادی اور مرزا مبارک بیگ وغیرہ شامل رہے گویا 'رنبیر' کی صحافت پر مقامی ادیبوں کی ایک پوری نسل پروان چڑھی۔'' (جموں و کشمیر کے اردو مصنفین، جان محمد آزاد، ص ۴۰۲)

جس انداز سے رنبیر نے جوش اور ولولے کے ساتھ اپنے صحافتی سفر کو جاری رکھا وہ اس کی ضمانت ہے کہ اس اخبار میں تابندگی ہے اور زندہ رہنے کی تمام تر خوبیاں موجود ہیں۔ ''رنبیر'' یہ جموں و کشمیر کی اردو صحافت میں ایک تحریک ثابت ہوا۔ جس نے علمی، ادبی، سیاسی و سماجی میدان میں ایک تغیر پیدا کیا۔ پُر آشوب حالات میں اس نے عوام کی موثر رہنمائی کی، زبان و ادب کے معاملے میں بھی یہ پیش پیش رہا۔ ''رنبیر'' سے جو قلم کار وابستہ رہے ان میں لالہ ہنس راج

وکیل، ہرکشن لال حبیب، سید ذلفقارعلی نسیم، مولوی محمد زین العابدین، ارجن سنگھ عرش، بنسی لال سوری، پنڈت لوک ناتھ شرما، وید پرکاش صراف، امن لکھنوی، سورج پرکاش، غلام رسول نازکی، فیض لدھیانوی، نیاز کاشمیری، ہدایت اختر وغیرہ کے علاوہ ادب کے کئی اہم نام جیسے مولانا ظفرعلی خان، ساحر لدھیانوی، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، آغا حشر کاشمیری، تلوک چند محروم وغیرہ جڑے رہے۔ انہوں نے اس اخبار کے حوالے سے اپنی تخلیقات کو عام کرنے اور اردو زبان کو فروغ دینے کا اہم کام کیا۔ ریاست میں اردو شاعری کے ساتھ ساتھ نثر کی ترقی میں بھی یہ بے حد کارآمد ثابت ہوا۔ محبان اردو کے لیے یہ کسی معجزہ سے کم نہ تھا۔ سید ذولفقار علی نسیم نے 'رنبیر' کے اوصاف کو اشعار کے ذریعہ اس طرح پیش کیا ہے:

آؤ پیدا کریں پھر مل کر وہ آن رنبیر
پھر سے عالم کو دکھادیں وہی شان رنبیر
اس کے آنے سے سُدھر جائے گی حالت اپنی
خیر مقدم کو بڑھو آیا ہے جوان رنبیر

(نقوش رنبیر، ملک راج صراف، ص۱۲)

کسی بھی اخبار کی زبان و بیان پر رائے قائم کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ اس کے تمام شمارے مطالعہ میں ہوں لیکن شاید ہی اردو میں کوئی اخبار ایسا ہوگا جس کے تمام شمارے ایک جگہ محفوظ ہو۔ ''رنبیر'' نے زبان و بیان کے معاملے میں بہت احتیاط سے کام لیا، شستہ اور معیاری زبان کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔ رنبیر کی زبان بہت سادہ، سلیس اور رواں تھی۔ مدیر کی کوشش ہوتی تھی کہ زبان ثقالت اور الفاظ کی پیچدگی سے پاک ہوتا کہ عوام خاص طور پر ادبی طبقہ اس سے استفادہ کرے۔ سن ۱۹۴۶ میں اس ہفت روزہ اخبار نے روزنامے کی شکل اختیار کر لی اور سن ۱۹۵۰ میں یہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ جس سے ریاستی صحافت کا ایک اہم باب ختم ہوگیا۔ اس اخبار کے بند ہونے سے اردو صحافت کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب بھی متاثر ہوا۔ باوجود اس کے بہت کم عرصے میں رنبیر کے حوالے سے ملک راج صراف نے جو خدمات انجام دیں وہ قابل ستائش ہے۔ اپنی پوری صحافتی زندگی میں ملک راج صراف نے صحافت کو جو معیار اور وقار قائم رکھا وہ یقینا آنے والی نسلوں کے لیے چراغ رہ گزر کا کام کرے گا۔ اردو صحافت کی دنیا میں وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

حوالہ جات:

۱۔ اردو صحافت آزادی کے بعد، ڈاکٹر افضل مصباحی ۲۰۱۳، ص ۳۶۲

۲۔ جموں و کشمیر کے اردو مصنفین، جان محمد آزاد، ص ۴۰۲

۳۔ نقوش رنبیر، ملک راج صراف، ص ۱۲

Dr.Shaikh Imran

Assistant Professor & Research Guide Urdu

Vasantrao Naik Govt.Instt.of Arts & Social Sciences,

Nagpur Maharashtra. Mob:9921986904

shaikhimranvas@gmail.com

میر کی کلاسیکی شاعری میں انسان دوستی کا پیغام

عابد سلمیٰ

اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ فرسٹ گریڈ کالج، چنگیری و ریسرچ اسکالر کویمپو یونیورسٹی، شیموگہ

میر محمد تقی میرؔ اردو کے باکمال شاعر اور مسلم الثبوت استاد ہیں۔ غزل گوئی میں کوئی دوسرا شاعر ان کا ہمسر نہیں ہوا ہے۔ اپنے عہد میں بھی وہ بڑے شاعر تسلیم کئے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ''خدائے سخن'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ خود ان کے عہد کے شعراء اور بعد کے شاعروں نے بھی ان کی استادی کا اعتراف کرتے ہیں۔ سوداؔ نے ان کو استاد مانا ہے اور میر حسنؔ نے اپنے تذکرے میں انھیں ''سر آمد شعرائے ہند'' لکھا ہے۔ ان کی کمال شاعری کو تسلیم کرتے ہوئے ذوقؔ فرماتے ہیں:

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

مرزا غالبؔ نے بھی میرؔ کی فنکارانہ صلاحیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ریختہ کے تمھیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

میرؔ کے اشعار کی دلکشی اور تاثیر کا راز ان کے دلکش اسلوب بیان اور طرز ادا میں پوشیدہ ہے۔ میرؔ کی زندگی حزن و یاس اور مصائب و آلام کا مجموعہ تھی۔ لڑکپن میں والد کی موت، سوتیلے بھائی کا حاسدانہ سلوک، روزگار کا غم اور تنگ دستی، نوجوانی میں ناکام عشق، جوانی میں دلّی کے بار بار اجڑنے کے ہنگام، ادھیڑ عمر میں دہلی سے جدائی اور ضعیفی میں بچوں اور اہلیہ کی موت کا صدمہ وغیرہ۔ پے در پے حادثات نے ان کی زندگی کو اس قدر متاثر کیا کے غم والمنا کی ان کی زندگی کا حصہ بن گئی۔ یہ فطرت انسانی ہے کہ پے در پے مصیبتیں انسان کو بلند ہمت اور اذیت کوش بنا دیتی ہیں۔ اور یہی داخلیت پسندی ان کی شاعری میں سادگی اور معنی آفرینی کا باعث بنی۔ وہ خود کہتے ہیں:

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع سو دیوان کیا

میرؔ نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ میر کے کمالات کی اصلی جولان گاہ غزل ہے جو ایک داخلی صنف ہے۔ میر نے اپنے ذاتی تجربات، کیفیات اور واردات قلب کو شعر کے لبادہ میں پیش کر کے غزل کی روح اور اس کی معنویت کو متاثر کیا ہے۔ ان کے یہاں غزل کا اشاراتی انداز، اس کا اختصار، اس کی نغمگی، اس کی مرکزیت یہ تمام خوبیاں حسن تناسب کے ساتھ موجود ہیں:

اک آفت زماں ہے یہ میرؔ عشق پیشہ
پردے میں سارے مطلب اپنے ادا کرے ہے

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

چونکہ غزل کا بنیادی موضوع عشق ہے، میرؔ نے عشق کے موضوع کو طرح طرح سے اپنی تخلیقات میں برتا ہے۔ اس لیے کہ یہ تعلیمِ عشق میرؔ کو ان کے والد نے دی تھی:

''اے بیٹے عشق اختیار کر (دنیا کے) اس کارخانے میں اسی کا تصّرف ہے۔ اگر عشق نہ ہوتو نظمِ کل کی صورت پیدا نہیں ہوسکتی۔ عشق کے بغیر زندگی وبال ہے دل باختۂ عشق ہونا کمال کی علامت ہے۔ عشق ہی سوز و ساز ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہے وہ عشق ہی کا ظہور ہے۔''

میرؔ کے ہاں عشق کے دو دائرے ہیں۔ ایک بڑا دائرہ اور دوسرا اس دائرہ کے اندر ایک چھوٹا دائرہ۔ بڑا دائرہ وہ ہے جو کل پر محیط ہے۔ یہاں عشق ساری کائنات پر حاوی ہے اور عشق ہی روحِ کائنات ہے:

لوگ بہت پوچھا کرتے ہیں کیا کہیئے میاں کیا ہے عشق
کچھ کہتے ہیں، سرّ الٰہی کچھ کہتے ہیں خدا ہے عشق

(دیوانِ سوم)

اسی لیے سارے عالم میں، خدا کی طرح میر کو عشق ہی عشق نظر آتا ہے:

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

عشق ہے طرز و طور عشق کے تئیں　　کہیں بندہ کہیں خدا ہے عشق
عشق معشوق عشق عاشق ہے　　یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق

(دیوانِ دوم)

میرؔ کی عاشقانہ سیرت کی تعمیر میں ان کے خاندان کی تہذیبی اور معاشرتی روایات کو بڑا دخل ہے انسان کے دکھ درد کا احساس، اپنی اور دوسروں کی عزت، عشق کی غیرت اور حسن کا احترام انھیں ورثہ میں ملا ہے۔ان خارجی عوامل کو سامنے رکھ کر جب ہم ان کے اشعار کا مطالعہ کریں گے ، تو ان کی انسان دوستی کا بخوبی اندازہ ہوگا۔

پاس ناموس عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے
جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرح
اے کشتہ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

میرؔ کے تغزل میں جو حسن کا احساس ہے وہ خیالی یا تصوراتی نہیں ہے بلکہ حقیقی اور اصلی ہے ۔میر نے عشق و محبت کے نازک اور لطیف جذبات کی تصویریں کھینچی ہیں۔ان کے اشعار میں قلبی واردات کا بیان ہے جس کا خلوص بے پناہ اور جس کی تاثیر لا انتہا ہے۔انھوں نے داخلی کیفیت اور محرکات کی مدد سے عالم فطرت کی نیرنگیوں کا بھی مشاہدہ اور مطالعہ کیا ہے:

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا
جب کوندتی ہے بجلی تب جانب گلستاں
رکھتی ہے چھیڑ میرے خاشاک آ شیاں سے

میرؔ کا زمانہ وہ تھا جہاں شخصیتوں کے نقوش بگڑ رہے تھے ایسے ماحول میں کسی صلاحیت کو پنپنے کا موقع مشکل سے ملتا ہے۔میرؔ نے اپنی شخصی کیفیتوں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ پورے ماحول کا آئینہ بن کر ہمارے سامنے آئی ہیں اور ماحول یا معاشرے کی تصویر کشی اس طرح کی ہے کہ ہم ان کی ذات کو اس میں آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں۔ایسے اشعار کلام میرؔ میں کثرت سے پائے گئے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دل تاب ہی لایا نہ ٹک جو یاد رہتا ہم نشیں

اب عیش روز وصل کا ہے جی میں بھولا خواب سا
دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

میرؔ کی شاعری دردانگیز ضرور ہے لیکن زہرناک اور مردم بیزار نہیں ہے۔انسان کی عظمت پر انھیں پورا بھروسہ ہے۔وہ ناکام ہوتے ہیں لیکن ہمت نہیں ہارتے،ان کے یہاں مصیبت میں استقامت ہے اور محرومی میں غیرت وحمیت۔ان کے کلام میں درد کی لو اور انسانیت کی شبنم کا پرتو ہے۔وہ کہتے ہیں:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں
بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

میرؔ کے فن کا کمال یہ ہے کہ وہ کسی نہایت وسیع،شدید اور بے پناہ احساس کے صرف ایک گوشے سے نقاب اٹھاتا ہے اور پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ میرؔ کے کلام میں ایجاز کا اعجاز جتنی بھرپور قوت سے ظاہر ہوتا ہے وہ اردو کے کسی دوسرے شاعر کے ہاں نہیں مل سکتا۔لطف یہ ہے کہ اس تصویر کشی کے لیے وہ بہت ہی سادہ،عام فہم اور سامنے کے الفاظ سے کام لیتا ہے۔وہ کبھی اپنے ماحول سے خطاب کرتا ہے اور کبھی پوری کائنات سے سرگوشیاں کرتا سنائی دیتا ہے۔

اپنے ماحول کے علاوہ وہ انسان کی نفسی کیفیات کا بھی گہرا احساس رکھتا ہے۔ایک پریشان حال انسان حالتِ زار میں کس طرح سوچتا ہے اور بعض ایسے امکانات پر بھی اس کی نگاہ پہنچتی ہے جو عام حالت میں پیشِ نظر نہ ہوتے۔میرؔ کہتا ہے:

تیرے فراق میں ، جیسے خیال مفلس کا
گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری

میرؔ کے کلام میں جو رچاؤ ہے ان کے شعروں میں جو سوز وگداز اور تاثیر ہے اس کے اسباب مختلف ہیں۔میرؔ اپنے شعروں کو بات چیت کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ رنج وغم،مایوسی ونامرادی کے جذبات بڑے مؤثر انداز میں ملتے ہیں۔چونکہ ان کو زندگی میں غموں سے زیادہ واسطہ رہا اس لیے ان کا کلام غم کا ترجمان بن گیا۔ان کے جذباتِ غم میں

خلوص اور سچائی ہے۔اسی لیے اشعار میں درد اور تاثیر کی کیفیت پائی جاتی ہے:

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
کیا کرو شرح خستہ جانی کی
میں نے مرمر کے زندگانی کی

میؔر اپنے ذاتی احساس کو معلوم احساس کے ذریعے بیان کرکے اسے ایک نئی صورت دے دیتا ہے اور وہ احساس عام ہوتے ہوئے بھی عام نہیں رہتا۔ میر کے تجربے میں میر کی ذات چھپ جاتی ہے۔اور یہ جذبہ معلوم جذبوں کا مماثل بھی ہوتا ہے اور ان سے مختلف بھی۔مثلاً میؔر کا ایک مشہور شعر ہے:

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

بحر صورت میؔر نے جہاں اپنی ذاتی زندگی کے تجربات و مشاہدات کو شاعری میں برتا ہے انھیں صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا ہے۔ بلکہ اپنی تخلیقی اور فنی و فکری خوبیوں کے باعث انھوں نے اپنے دل کی آواز کو تمام عالم انسانیت کی آواز بنا دی ہے۔ان کے اشعار کے مطالعہ سے ہر پڑھنے والے کو یہ احساس ہونے لگتا ہے گویا یہ شعر اس کی اپنی ذاتی زندگی پر مبنی ہو۔یہی وہ خصوصیت ہے جس سے میر کی شاعری انسان دوستی کی بہترین مثال بن جاتی ہے۔

حوالہ جات:
۱۔محمد تقی میر۔ڈاکٹر جمیل جالبی
۲۔میر تقی میر۔نثار احمد فاروقی

Abid Salma, Assistant Professor, GFGC Channagiri &
Research Scholar, Kuvempu University, Shimoga.
Email: salmakgf@gmail.com
Mobile No:8073714615

اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصّہ: ایک جائزہ

زویا آفرین سیّد زین الدّین

ریسرچ اسکالر، امراؤتی یونیورسٹی امراؤتی، (بلڈانہ، مہاراشٹر)

خواتین کی عظمت وحیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مفکر اسلام ڈاکٹر علامہ اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے۔

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

تصویر کائنات میں خواتین کے وجود نے ہی رنگ بھرے ہیں۔ یوں تو زندگی کے ہر شعبہ میں خواتین ہمیشہ پیش پیش رہی ہے۔لیکن ادب سے خواتین کی دلچسپی اس لیئے زیادہ رہی ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔زندگی کی طرح ادب کا مقام بھی وجود زن سے قائم ہے۔

اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ بہت اہم رہا ہے۔انہوں نے افسانہ نگاری، ناول نگاری، ڈرامہ نگاری، شاعری اور تنقید و تحقیق سمیت مختلف اصناف میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ قدیم زمانے سے ہی خواتین اردو ادب میں سرگرم رہی ہیں اور ان کے کارناموں نے نہ صرف ادب کو مالا مال کیا ہے بلکہ معاشرے میں خواتین کی حیثیت کو بھی روشن کیا ہے۔شعر و ادب کی فروغ اور اردو زبان کی ترقی وہ اشاعت میں مردوں کی طرح خواتین نے بھی پیش قیمت خدمات انجام دی ہے۔علم و ادب فکر و فن شعر و سخن اور خاص طور سے اردو زبان و ادب کی ترقی میں حصہ لینے والی خواتین کی ایک لمبی فہرست ہے۔اردو ادب کی تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ مندرجہ ذیل خواتین نے شعر و ادب کی خدمت کے علاوہ اردو زبان و ادب کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہیں:

تہنیت النساء بیگم، لطف النساء امتیاز، مہ لقا بائی چندا، زہرہ نگاہ، سیدہ جعفر، رضیہ خاتون جمیلہ، نثار فاطمہ کبریٰ، رابعہ پنہاں، انیسہ بیگم شروانی، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، رضیہ سلطان

،بشیر النساء، حیا لکھنوی، صفیہ شمیم، رابعہ سلطانہ، سعیدہ عروج، رضیہ حلیمہ جنگ، ساجدہ زیدی، زبیدہ تحسین، وحیدہ نسیم، حمیدہ سلطان، نکہت بھاگل پوری، زاہدہ زیدی، رشیدہ عیاں، سیدہ فرحتں، جمیلہ بانو، صغریٰ عالم، بلقیس ظفیر الحسن، ممتاز محل، مریم غزالہ، رشیدۃ النساء، فاطمہ وصیہ جائسی، حسنیٰ سرور، عرفانہ عزیز، ناہید اختر، بیگم، شبنم عابدی، شکیلہ اختر، مسعودہ حیات، صدیقہ شبنم، ہاجرہ مسرور، مظفر النساء، سیما عظمیٰ، نور جہاں ثروت، ام ہانی، پروین شاکر، عشرت آفرین، ملکہ نسیم، حمیرہ رحمٰن، عفّت زرّیں، اسما سعیدی، شہناز، کہکشاں تبسم، ڈاکٹر سلطانہ خوشنود جبیں، ہاجرہ مسرور، جیلانی بانو، ادا جعفری، یاسمین حمید، شبنم شکیل، زہرہ نگاہ، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض ،خدیجہ مستور، صالحہ عابد حسین، وغیرا اہم ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان وادب کی ترقی میں حصّہ لینے والی اور اپنی بہترین کارکردگی اور مثالی خدمات انجام دینے والی خواتین بیشمار ہیں۔ اس مختصر سی تحریر میں ہر ایک کے نام اور کام سے قارئین کو آگاہ کرنا ممکن نہیں ہیں۔ اردو ادب کی چند مشہور ومعروف خواتین جنہوں نے اپنے بیش بہا کارناموں سے اردو ادب کی ترقی میں اضافہ کیا ہیں، ان کا تعارف وتذکرہ نہایت اختصار کے ساتھ نذرِ قارئین ہے۔

’’لطف النساء بیگم نام اور امتیاز تخلص تھا۔ وطن حیدر آباد ہے۔ ماں کا بچپن میں انتقال ہو گیا، اس لیے شاہی خاندان میں پرورش ہوئی .... اس کا دیوان ۱۲۱۲ھ میں مرتب ہوا۔ اسکے دیوان کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے، جس میں جملہ اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ دیوان کے علاوہ اس کی ایک ضخیم مثنوی ’’گلشنِ شعرا‘‘ کے نام سے موسوم ہے اور اس میں آٹھ ہزار اشعار ہیں۔ ان سے امتیاز کی پر گوئی کا اندازہ ہوتا ہے۔(۱)

جو لطف النساء سچ ہے تیرا ہی نام
ترے شعر کا شہرہ تا روم وشام

’’بیگم۔ بیگم میر تقی میرؔ یہ نوجوان مر گئیں۔ آسی صاحب لکھتے ہیں کہ یہ ''صاحب دیوان'' تھی لیکن اب صرف ایک غزل کے تین چار شعر ملے ہیں جو مولوی جمیل احمد نے تذکرہ'' شمیم سخن''، ’’تذکرہ الخواتین''اور ''افکار خواتین'' کے حوالے سے اپنے تذکرے میں نقل کی ہیں۔ مولوی جمیل احمد مصنف ''شاعرات اردو'' اور عبدالباری آسی کا خیال ہے کہ مندرجہ ذیل شعر میر نے اس سانحہ کے بعد کہا تھا۔(۲)

اب آیا دھیان آرام جاں اس نامرادی میں
کفن دینا تمہیں بھولے تھے ہم اسباب شادی میں

''عصمت چغتائی: مرزا عظیم بیگ چغتائی کی بہن اور ملک کی مشہور وہ معروف افسانہ نگار ہیں علی گڑھ سے بی اے بی ٹی کا امتحان پاس کرنے کے بعد کچھ دن معلّمہ رہیں ۔۱۹۴۲ء میں انہوں نے شاہد لطیف صاحب سے شادی کر لی اور اس کے بعد بمبئی میں قیام کر کے فلمی افسانے لکھنے میں مشغول ہوئی ان کے افسانوں کے چار مجموعے موسوم ہیں ۔(۱) کلیاں (۲) چوٹیں (۳) ایک بات (۴) چھوئی موئی، شائع ہو چکے ہیں اور ان کے علاوہ دو ناول ''ضدی ''اور ''ٹیڑھی لکیر'' اور ایک ڈرامہ ''دھانی بانکپن'' چھپ چکے ہیں ترقی پسند مصنفین ان کی تحریروں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں پرکاش پنڈت نے سرخ آنچل میں ان کا ایک افسانہ'' بہو بیٹیاں''نقل کیا ہے۔(۳)

''خدیجہ مستور: فن صحافت اور افسانہ نگاری میں مشہور ہے دسمبر ۱۹۲۷ء میں لکھنو کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئی اور وہی تعلیم پائی ۔۱۹۴۲ء سے فن صحافت کو خاص مشغلہ قرار دیا ہے اور سنا گیا ہے کہ اب تک اس میں منہمک ہے کچھ عرصے تک روح ادب کی ادارت بھی کر چکی ہیں ان کی شادی ظہیر بابر صاحب سے ہوئی ہے پاکستان بننے کے بعد سے لاہور میں مقیم ہیں ان کے افسانوں کے دو مجموعے بوچھار اور کھیل شائع ہو چکے ہیں اور پرکاش پنڈت نے سرخ آنچل میں ان کا ایک افسانہ "محاذ سے دور" درج کیا ہے۔(۴)

''نواب شاہ جہاں بیگم شیریں کی علمی وادبی اور تصنیفی خدمات قابلِ قدر ہیں ۔نظم ونثر دونوں صنفوں پر قدرت حاصل تھی ۔ اچھی شاعری کرتی تھیں ۔ ''شیریں'' اور ''تاجور'' تخلص تھا.۔ پروفیسر فصیح الدین بلخی کے بقول: ''ہندوستان میں ایسی ذی لیاقت اور باصلاحیت عورتیں کم پیدا ہوئی ہیں ....تاریخ میں تاج الاقبال، لغت میں خزینۃ اللغات اور اخلاق وتصوف میں تہذیب النسواں ان کی تصانیف سے یادگار ہیں''۔(۵)

گل کے ہونے کی توقع پہ جئے بیٹھی ہے
ہر کلی جان کو مٹھی میں لیے بیٹھی ہے
(مہ لقا بائی چندا)

''خدیجۃ النسا: ان کے خاندان میں بہت سے عالم فاضل گزرے اس وجہ سے یہ تعلیم یافتہ

اور باذوق خاتون تھی والد شوہر صاحبِ تصنیف تھے ان کے شوہر مفتی نور اللہ تخلص آباد آگرہ میں تھانے دار تھے۔۱۸۵۷ء میں نائب کوتوال بھی رہے۔انہوں نے اپنی یادگار شاعرات کا ایک تذکرہ "افکار خواتین" چھوڑا ہے مولوی جمیل احمد "شاعرات اردو" میں اس کے متعلق لکھتے ہیں : یہ تذکرہ محترمہ خدیجۃ النساء کا لکھا ہوا ہے اس کا نام افکار خواتین سن تصنیف ۱۸۴۷ء ہے اس میں ۳۷ شاعرات کا اجمالی تذکرہ ہے حالات دو چار جملوں سے زیادہ نہیں زیادہ تر شاعرہ خواتین کے ایک یا دو شعر پیش کیے گئے ہیں"۔(۶)

شب بھر کو ترا جاگنا اچھا نہیں زہؔرا
پھر دن کا کوئی کام بھی پورا نہیں ہوتا
(زہؔرا نگاہ)

اردو ادب میں خواتین نے اپنی ایک منفرد پہچان بنائی ہے۔مہ لقا بائی چندا، لطف النساء امتیاز، عصمت چغتائی، خدیجۃ النساء، بیگم، جیسی شاعرات نے اپنے کلام سے اردو ادب کو مالا مال کیا۔افسانہ نگاری میں بھی خواتین نے معاشرے کے مختلف پہلوؤں کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔انہوں نے خواتین کے مسائل، ان کی خواہشات اور ان کی جدوجہد کو موضوع بنایا ہے۔اور تو اور اردو ناول نگاری میں بھی خواتین نے اہم کردار ادا کیا ہے۔انہوں نے مختلف موضوعات پر ناول لکھے ہیں اور خواتین کے کردار کو اجاگر کیا ہے۔خواتین نقادوں نے بھی اردو ادب پر تنقیدی اور تحقیقی مضامین لکھے ہیں اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

’’جیلانی بانو: جیلانی بانو اردو کی معروف افسانہ نگار ہیں۔آپ کے افسانوی مجموعہ کا نام’’ روشنی کے مینار‘‘ ہے۔آپ کا خانوادہ اتر پریش کے ضلع بدایوں کا ہے چونکہ آپ نے حیدر آباد میں آنکھ کھولی ہے اس لئے خود کو حیدر آبادی لکھتی رہی ہیں۔ڈاکٹر رضوانہ جیلانی بانو کے فکر وفن کا تعارف اس انداز سے کراتی ہیں۔ ’’جیلانی بانو کے افسانوں میں حیدر آباد کے جاگیردارانہ ماحول و معاشرے کی کھوکھلی روایتوں، قدروں، عورتوں کا استحصال، تلنگانہ کسان کی انقلابی جدو جہد اور بدلتے ہوئے عصری حالات کی حقیقی عکاسی ملتی ہے۔‘‘ جیلانی بانو کے چند مشہور افسانوں کے نام اس طرح ہیں۔موم کی مریم، سونا، آنگن وغیرہ۔(۷)

’’صالحہ عابد حسین: آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم کی صاحبزادی ہے ان کی والدہ مولانا صفی مرحوم کی حقیقی پوتی تھی۔۱۹۱۳ء میں اپنے آبائی وطن پانی پت میں پیدا ہوئیں۔ابتدائی

تعلیم گھر ہی میں حاصل کی ۱۹۳۳ء میں ان کی شادی ڈاکٹر عابد حسین سے ہوئی جو جامعہ ملیہ میں پروفیسر ہیں ۔شادی کے بعد تحصیل علم کا سلسلہ از سرنو جاری ہوا اور ۱۹۴۲ء میں ادیب فاضل کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ مضمون نگاری کا ذوق وشوق پہلے سے تھا۔ ۱۹۳۷ ء سے ان کے افسانے اور ڈرامے رسالوں میں شائع ہونے لگے تھے ۱۹۴۱ء میں ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''نقش اول'' شائع ہوا اس کے علاوہ وہ ایک اور مجموعہ موسم بہ ''ساز ہستی'' اور ریڈیو کی تقریروں کا مجموعہ ''بات چیت'' بھی مرتب ہو چکا ہے۔(۸)

''پروین شاکر: بلا کی ذہین، سلیقہ شعار، تہذیب وشائستگی کی پروردہ، شعر وادب کی رسیا اور ایک عظیم شاعرہ تھیں۔اردو زبان وادب کے فروغ میں پروین شاکر کی خدمت کو کسی بھی جہت سے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ پانچ شعری مجموعے خوشبو، صد برگ، خود کلامی، انکار، کفِ آئینہ ان کی شاعرانہ مہارت اور ادبی بصیرت کو اجاگر کرتے ہیں۔ پروین شاکر کی شاعری کلاسیکل ٹریڈیشن اور جدید احساسات، جذبات و محبت کا خوبصورت اور دل نواز سنگم ہے۔

وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھر جائے گا
مسئلہ پھول کا ہے پھول کدھر جائے گا

پروین شاکر کی شاعری کے حوالے سے آفتاب احمد لکھتے ہیں:

''پروین شاکر کی شاعری میں دل کا معاملہ ہی نہیں کھلا ان کی ذاتی زندگی کے کئی ایک دوسرے معاملات بھی سامنے آئے۔ بلکہ یوں کہیے کہ وہ خود انہیں سامنے لائی ہیں۔اس لیے انہوں نے براہ راست ان کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔اس کی ایک وجہ شہرِ ذات سے گہری دلچسپی بھی ہے۔ظاہر ہے کہ کاروبارِ زیست میں ذات جن الجھنوں میں گرفتار ہوگی وہ شاعری میں بھی راہ پائیں گی''۔(۹)

نمونے کے طور پر یہ محض چند ممتاز خواتین کی ادبی کاوشوں کا مختصر تذکرہ تھا۔ان کے علاوہ ماضی و حال سے تعلق رکھنے والی سینکڑوں خواتین ایسی ہیں، جنہوں نے نظم و نثر، تحقیق و تصنیف اور ناول نگاری و افسانہ نگاری کے میدان میں بیش بہا کارنامے انجام دے کر اردو زبان وادب کی ترقی کے راستے ہموار کیے ہیں۔اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہّ نہ صرف ادبی لحاظ سے اہم ہے بلکہ اس نے معاشرے میں خواتین کی حیثیت کو بھی بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

زمانے اب ترے مد مقابل
کوئی کمزور سی عورت نہیں ہے

☆☆☆☆☆

حواشی:

۱) دکن میں اردو ۔ نصیرالدین ہاشمی،(ص۔۴۴۱)
۲) اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ ۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ،(ص۔۲۱)
۳) اردو ادب میں خواتین کا حصہ ۔مجموعہ مقالات، پروفیسر آصفہ زمانی،(ص۔۱۴)
۴) ایضاً۔(ص۔۱۶)
۵) تذکرہ نسوان ہند۔ فصیح الدین بلخی،(ص۔۶۸)
۶) اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ ۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ،(ص۔۶۰)
۷) اردو ادب میں خواتین کا حصہ ۔مجموعہ مقالات، پروفیسر آصفہ زمانی(۱۱۶۔۱۱۷)
۸) تذکرہ نسوان ہند۔ فصیح الدین بلخی،(ص۔۱۸)
۹) آفتاب احمد، مشمولہ ''معاصر'' صدر دفتر معاصر 25 سی لوئر مال لاہور،(ص۔۱۹۲)

....

ZOYA AAFREEN SYED ZAINUDDIN
Research Scholor,Dr. Manorama & Prof. H.S.Pundkar,
Arts Com & Sci College Balapur, Dist - Akola (M.S.)
(Amravati University,Amravati)
''BASERA''BEHIND POLICE STATION,
PAITH MOHALLA WARD NO.15 AT POST NANDURA
DIST BULDHANA-443404(MAHARASHTRA)
EMAIL ID- zzsyed87@gmail.com
MOBILE NO - 8806243919

نجات دہندہ : ایک مطالعہ

ڈاکٹر صفیہ فاطمی

سارے علوم کا بنیادی مقصد ہے زندگی کی تاریک اور خاردار راہوں میں روشنی فراہم کرنا۔ادب بھی علم کی ایک شاخ ہے،اس شعبۂ علم سے ویسی ہی امید رکھی جاتی ہے۔دیگر علوم نے روشنی دہندہ ہونے کو کافی سمجھا ہے جبکہ ادب میں بصیرت کے ساتھ مسرت کی ضرورت ہوتی ہے،ناول نے اپنے شروعاتی دور ہی سے یہ فریضہ انجام دیا ہے۔انگریزی ناول کی ابتدا اصلاح کی غرض سے ہوئی تھی۔سیموئیل رچرڈسن Samuel Richardson کا پہلا ناول ''پامیلہ'' Pamela پوری طرح اصلاحی ہے۔دوسرا ناول کلیریسا Clarissa بھی کچھ ایسا ہی ہے۔یوروپی سماج پر اس ناول کے مثبت اثرات مرتب ہوئے۔اردو ناول کے معلم اوّل ڈپٹی نذیر احمد کے ساتوں ناول میں اصلاح کا جذبہ کارفرما ہے۔رینو بہل کے سارے ناولوں میں مقصدیت نمایاں ہے پھر بھی مصنفہ نے اپنے مقصد کو سطح زیریں میں رکھا ہے۔بالائی سطح پر دلچسپی کو کم نہیں ہونے دیا۔2024ء تک ان کے چار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔

گرد میں اٹے چہرے 2017ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

میرے ہونے میں کیا برائی ہے 2017ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

نجات دہندہ 2019ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

دشت بے نوا 2024ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

چاروں ناولوں کے موضوعات الگ الگ ہیں پھر بھی انسانی ہمدردی کا جذبہ سب میں آیا ہے۔ہر ناول میں ایک واضح پروگرام ہے۔ناول کے مرکزی خیال سے نظریۂ حیات ہم آہنگ ہے۔اپنے پہلے ناول ''گرد میں اٹے چہرے'' کو مصنفہ نے گھریلو معاملات تک محدود رکھا ہے۔ہمارے گھروں میں شوہر،بیوی اور بچوں کی شمولیت ہوتی ہے۔سب کے اپنے اپنے حقوق ہیں،فرائض ہیں،ذمہ داریاں ہیں ساتھ ہی حد بندی بھی ہے۔ناول میں تین اہم کردار ہیں۔

ریٹائرڈ افسر گریش سرین، ان کی بیوی شبنم اوران کی بیٹی سنینا سرین۔سب اوسط قسم کے ہیں۔ بیوی نے ٹھوکر کھائی۔شوہر سے بے وفائی اس کے لیے اور پورے خاندان کے لیے مضر ثابت ہوئی۔

رینو بہل کا دوسرا ناول ''میرے ہونے میں کیا برائی ہے'' اپنے موضوع کے اعتبار سے اُردو ادب میں شاید یکتائے روزگار ہے۔مرکزی کردار شیکھر تھا جس میں وقت گزرنے کے ساتھ نسوانی جذبات کی فراوانی ہو جاتی ہے۔اب وہ شیکھر نہیں بلکہ شیکھا نام کی لڑکی بن چکا ہے۔ ہجڑا یعنی مخنث کا روپ مذکر یا مونث سے مختلف ہوتا ہے۔اس ٹیڑھے موضوع کو مصنفہ نے اپنے ناول میں پیش کیا۔ناول کے بطن سے مطالبہ ابھرتا ہے کہ اس گروپ کو بھی معذور یعنی وِکلا نگ جیسی قانونی شناخت ملنی چاہیے کیونکہ کسی کی معذوری لباس کے باہر دکھائی پڑتی ہے جبکہ مخنث کی معذوری زیرِ لباس ہوتی ہے۔

ناول ''دشت بے نوا'' کے بیک فلیپ پر اُردو کی مشہور افسانہ نگار محترمہ ذکیہ مشہدی کے تعریفی کلمات موجود ہیں :

> ''رینو بہل اس مکتبہ فکر سے تعلق رکھتی ہیں جن کے اراکین زبان کو کسی خاص طبقے سے جوڑ کر نہیں دیکھتے، مذہب کی تو کہیئے ہی نہیں۔اُردو پر اس حد تک عبور ہے کہ عرصے سے اس میں افسانے اور ناول لکھتی چلی آ رہی ہیں جن میں ایک معیار برقرار رہتا ہے۔ بنیادی شرطیں یعنی فکر انگیزی اور زبان و بیان کی کشش انگیزی پوری ہوتی ہے۔کس حد تک، اس کا فیصلہ تو نقادوں کو کرنا ہے۔ بشرطیکہ وہ صنفی عصبیت سے اوپر اُٹھ کر پوری دیانتداری سے ان کا جائزہ لیں۔ میں یہاں بحیثیت قاری اپنے تاثرات رقم کر رہی ہوں۔میں نے ان کے پچھلے دونوں ناول ''میرے ہونے میں کیا برائی ہے'' اور ''نجات دہندہ'' پورے پڑھے اوران کے موضوعات واسلوب دونوں کو سراہا۔نجات دہندہ کے لیے تو انہوں نے بنارس جا کر وہاں کے ڈوم کنبوں کے افراد سے ملاقات کی۔خاصہ عرصہ وہاں رہیں اور پوری معلومات حاصل کرنے کے بعد وہ ناول لکھا۔''

ذکیہ مشہدی کی یہ تحریر واضح کرتی ہے کہ ناول میں پیش شدہ واقعات مصنفہ کے تخیل پر

مبنی نہیں بلکہ ان میں مشاہدہ کی آمیزش ہے۔ادب کی سچائی اپنی جگہ ہے کہ تجربہ، مشاہدہ یا تخیل سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ کچن میں جا کر دیکھ لیجئے، کوئی بھی کھانا تیار ہونے سے قبل باورچی کے تخیل میں تیار ہوتا ہے۔ چھوٹی یا بڑی بلڈنگ زمین پر بننے سے قبل معمار کے تخیل میں بنتی ہے۔ادب کی تخلیق کے لیے تخیل شرط ہے۔مولانا الطاف حسین حالی نے شعر گوئی کے لئے تخیل، مطالعہ کائنات اور تفصحِ الفاظ کو لازمی شرط قرار دیا ہے۔ای ایم فارسٹر نے فکشن کے معاملہ میں وہی بات کہی ہے۔ ناول نجات دہندہ واضح کرتا ہے کہ ناول نگار نے کائنات کا مطالعہ یا ہندوستان کی سیاست، معیشت، ذہنیت، ثقافت، رسوم اور تہذیب کا مطالعہ بھلی بھانتی کیا ہے۔

صفحہ سات سے شروع ہو کر صفحہ دوسو باسٹھ پر یہ ناول ختم ہو جاتا ہے۔یعنی یہ ناول ۲۵۷ صفحات پر مشتمل ہے جس کو ناول نگار نے تیرہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ناول کے اختتام کے بعد ناول نگار نے تین صفحات کا آخری باب جوڑ دیا ہے جس میں انہوں نے اپنے نظریہ کی وضاحت کر دی ہے۔یہ نظریہ دلدل اور ذلت سے نجات حاصل کرنے والا نظریہ ہے۔قدیم اکڑ اور الٹی سیدھی سوچ ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔سرخروئی کے لیے مثبت سوچ اپنانی ہوگی۔

ناول میں کئی موضوعات زیر بحث آ گئے ہیں۔

- تعلیم کی اہمیت بشمول غریبوں کی تعلیم، تعلیمی مسائل بشمول تعلیم نسواں
- جات برادری کا مسئلہ، اچھوت یعنی Untouchable کا مسئلہ
- بین المذاہب شادی کو فروغ
- ہر شہر شہر ماست کہ شہر خدائے ماست
- مذہب کو امن کا پیامبر ہونا چاہیے نہ کہ گولہ بارود
- جس عورت کو شوہر نے چھوڑ دیا ہو یعنی پریتیکتا، اس کی دوسری شادی
- محبت کی شادی کو لو جہاد کے نام سے بدنام کرنے کی مخالفت
- تصادم یا کشمکش پر امن وامان کو ترجیح
- صنفی مساوات
- ظاہر داری سے پرہیز
- خدمت خلق کا جذبہ
- جو کام آئے وہی اچھا

ناول کا ایک ضمنی کردار افضل مسلمان ہے۔ سہارنپور کا باشندہ ہے۔ اس کی شادی ہندو لڑکی رشمی سے ہوتی ہے۔ پھر دونوں میاں بیوی کناڈا میں جا کر بسنا چاہتے ہیں کیونکہ اتر پردیش میں شاید وہ لوگ محفوظ نہیں رہیں گے۔ سکھ گر تیج کی شادی ہندو رخشی سے ہوتی ہے۔ بیاہ کے رسوم سکھ اور ہندو دونوں طریقوں سے ادا ہوتے ہیں۔ ڈوم کنبہ سے تعلق رکھنے والا اچھوت لڑکا دیوا کر اور اونچی ذات سے تعلق رکھنے والی لڑکی یامنی Live in Relation میں ہیں۔ یامنی کو اپنے گارجین کی اجازت کا انتظار ہے۔ گارجین کی اجازت کے بغیر انٹر کاسٹ میرج کے لیے وہ تیار نہیں۔ دو بچوں کی ماں شیلہ کو اس کے شوہر نے چھوڑ دیا ہے۔ شوہر نے دوسری شادی کر لی ہے۔ بھاسکر نام کا ایک کنوارا لڑکا اس کو بیوی کے روپ میں اپنانے کے لیے تیار ہے۔ بھاسکر کی موت ہو جاتی ہے اور یہ شادی نہیں ہو پاتی۔ یعنی دوسری بار دولہن بننے سے پہلے ہی شیلہ بیوہ ہو جاتی ہے۔ بھاسکر کی ماں نے شیلہ کو اپنی بیوہ بہو کا درجہ دیا۔

ناول کی شروعات سے قبل مصنفہ نے پیش لفظ کے طور پر اسرار الحق مجاز کے ۱۵/اشعار لکھے ہیں۔

مہر صدیوں سے چمکتا
ہی رہا افلاک پر
رات ہی طاری رہی
انسان کے ادراک پر
اک نہ اک در پر جبین
شوق گھستی ہی رہی
آدمیت ظلم کی چکی میں
پستی ہی رہی
یہ مسلسل آفتیں یہ
یورشیں یہ قتل عام
آدمی کب تک رہے
اوہام باطل کا غلام

مجاز لکھنوی یا مجاز ردولوی نے کمیونزم میں انسان کی فلاح کا خواب دیکھا تھا۔ رینو

بہل کی نگاہ میں صحیح تعلیم اور انسان سے انسان کی محبت ہی فلاح کا راستہ ہے۔کمیونزم میں تشدد کی گنجائش رہتی ہے،مصنفہ نے اپنے اس ناول کو شدت پسندی سے دور رکھا ہے۔جگر مرادآبادی کی طرح ان کا بھی نظریہ ہے۔میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

اوہامِ باطل سے چھٹکارا کے لیے مصنفہ نے اپنی جانب سے کئی فارمولے پیش کیے۔ یہ کوئی نصیحت نہیں بلکہ حالات حاضرہ کی تصویر کشی ہے۔

ناول کی شروعات دیواکر اور یامنی سے ہوتی ہے۔مصنفہ نے ابتدا حسن وعشق سے کی ہے۔حسن خود کو نچھاور کرنے کو تیار ہے لیکن عشق کو اپنی پڑھائی سے فرصت نہیں۔دونوں پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ میں انجینئرنگ کے طالب علم ہیں۔یہ کورس چار سال میں مکمل ہوتا ہے۔ کورس کے شروعاتی دنوں سے یامنی کی نگاہیں دیواکر کو پسند کرنے لگی تھیں لیکن دیواکر بالکل بے نیاز ہے کیونکہ

''یامنی اس کی منزل نہیں۔'' (ص۔۸)

ایسا نہیں کہ اس کے سینہ میں دل کی جگہ پتھر ہو،ایسا بھی نہیں کہ صنف مخالف کے لیے اس کے دل میں کشش نہ ہو۔سب سے اہم معاملہ اس کی تعلیم کا ہے جس میں کسی قسم کی رکاوٹ اسے پسند نہیں۔دوسری طرف یامنی ہے جو دیواکر کے قرب کا بہانہ ڈھونڈتی ہے۔

''دیواکر رُکو دو منٹ............
تم مجھ سے بھاگتے کیوں ہو،کھا جاؤں گی تمہیں
کیا؟''
''ایسی کوئی بات نہیں،کہو کیا کام ہے؟''
''مجھے تم سے مدد چاہئے،بہت کوشش کی سمجھ میں
آ جائے وہ ٹاپک، پر نہیں آ رہا،کیا تم تھوڑا
وقت نکال کر مجھے سمجھا سکتے ہو۔''
''تم مجھے ٹوپک دے دو میں تمہیں اپنے
Notes دے دوں گا
......وقت نکالنا مشکل ہے۔''
''کیا شام کو دو گھنٹہ نہیں نکال سکتے۔''

’’شام کو میری مصروفیات الگ ہوتی ہیں۔‘‘
’’......ٹھیک ہے شام کو اگر وقت نہیں تو چھٹی
والے دن تو وقت نکال ہی سکتے ہو۔‘‘
وہ بھی جیسے پکا ارادہ کر کے آئی تھی اس سے
منوانے کا۔......
......چلتے چلتے وہ رک گیا۔ پہلی
بار............ گہری نظروں سے یامنی کو دیکھا۔
یامنی کی آنکھ میں سلگتے رنگ دیکھ کر............ بنا
کچھ کہے ڈیپارٹمنٹ کی جانب بڑھ گیا۔‘‘
(ص۔۹۔۱۰)

یامنی کا دیواکر کی جانب جھکاؤ بے وجہ نہیں۔ دیواکر کا شمار تیز ترین طالب علم کے طور پر ہوتا ہے۔ اس کی شان بے نیازی کی وہ قدر کرتی ہے۔ اس طرح کے واقعات ناول میں کئی مقام پر آئے ہیں۔ انسان کی ضرورتوں میں ایک اہم ضرورت محبت بھی ہے جس کی مختلف اقسام ہوتی ہیں۔ ناول کے کردار سے لے کر قارئین کو بھی ایسی ضرورت پیش آتی ہے۔ مصنفہ نے قارئین کی اس ضرورت کا خیال رکھا ہے۔

مرکزی کردار دیواکر کا آبائی وطن بنارس ہے۔ ناول میں اس مقام کا ذکر مختلف طریقہ سے کیا گیا ہے۔

’’بنارس ہندو یونیورسٹی...... تیرہ سو
ایکڑ پر بنی اس ادارہ کی زمین بنارس کے راجہ
نے دان میں دی تھی۔ 1916 میں مدن موہن
مالویہ نے اس کی بنیاد بسنت پنچمی کے دن رکھی
تھی۔ قریب تیس ہزار طلباء مختلف ملکوں سے آ
کر یہاں پڑھ رہے ہیں۔ ۷۵ کے قریب
ہاسٹل ہیں۔‘‘
(نجات دہندہ، ص۔۹۹)

اسی صفحہ میں ناول نگار نے اس شہر کی بڑی خامی کو بیان کر دیا ہے۔

''یہ شہر ذات پات اور دھرم کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔کام بھی ذات پوچھ کر ملتا ہے اور مکان بھی۔''

یعنی بڑی خوبی کے ساتھ بڑی خامی بھی ہے۔تعلیم کی جوت جگانے والا یہ شہر خود ہی علم کے اثرات سے دوری بنائے ہوئے ہے۔ یہاں عزت انسان کی نہیں،علم کی نہیں، محنت کی نہیں بلکہ جاتی کی ہوتی ہے جو بذات خود ایک بڑا عیب ہے۔اسی بنارس شہر میں انتم داہ سنسکار کے لیے کئی گھاٹ بنے ہیں جن میں ہریش چندر گھاٹ کو زیادہ مقدس مانا جاتا ہے۔ ہندوستان کے کونا کونا سے یہاں مردے لائے جاتے ہیں،ان کو آگ میں جلانے کے لیے ماہر ڈوم گھاٹ پر موجود رہتے ہیں۔

''ایک کونے میں ادھ جلی لاش کو کتے نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ کچھ غریب ایسے بھی ہوتے ہیں جو کریا کرم کا پورا پیسہ نہیں دے پاتے ،ایسے میں تھوڑی لکڑیوں کی چتا بنائی جاتی ہے جو ایک مردے کو جلانے کے لیے ناکافی ہوتی ہے۔کئی بار ڈوم اس مردے کو سیدھا لٹانے کے بجائے مروڑ کر لٹا دیتے ہیں تاکہ کم لکڑی میں مردہ جل جائے یا پھر ادھ جلی لاش کو کوّوں اور گِدھوں کے کھانے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں......''

(ص۔۱۰۱)

کئی ایسے بھی ضعیف لوگ ہوتے ہیں جو اپنی زندگی کے آخری ایام بنارس میں گزارتے ہوئے موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہندو عقیدہ ہے کہ اگر اس شہر میں گنگا کنارے مردہ کو سپرد آتش کر دیا جائے تو اسے موکش کی پراپتی ہو جاتی ہے۔مصنفہ نے اس نظریہ کو قارئین کے سامنے کر دیا۔ بحث کی ضرورت نہیں سمجھی۔

بنارس شہر سے قریب سارناتھ ہے جو بدھسٹ لوگوں کا تیرتھ استھل ہے۔گوتم بدھ کے نروان سے لے کر پروَچن (تقریر) کا ذکر بھی ناول میں موجود ہے۔یہ بھی بتایا گیا کہ

''جب ساتویں صدی میں چینی استاد Husan Tsang سارناتھ پہنچے تو اس وقت تیس Monastries اور تین ہزار راہب (Monk) سارناتھ میں رہائش پذیر تھے۔''(ص۔۱۰۵)

سارناتھ کے کئی قابل دید مقامات کا ذکر نجات دہندہ میں ملتا ہے۔

ARCHEOLOGICAL MUSEUM

CHAUKHANDI STUPA

DHAMEK STUPA

ASHOKA PILLAR

MULAGANONA KUTIVIHAR

DEER PARK

JAIN TEMPLE

(ص۔105)

گوتم بدھ کی تعلیمات کو پیش کرنے کی گنجائش اس مقام پر تھی لیکن لگتا ہے کہ مصنفہ نے جان بوجھ کر گریز کیا ہے۔ ناول نگار نے بنارس کو دھرم نگری بنا کر پیش کیا ہے۔ جہاں دقیا نوسی خیالات یا اوہام پرستی کو انسانیت کے سارے نظریات پر فوقیت حاصل ہو گئی ہے۔ اس شہر میں مندروں کی بہتات ہے۔ پریم چند نے ''اسرار معابد'' میں تلخ لہجہ اختیار کیا تھا۔ بنارس کے کاشی وشوناتھ مندر کا ذکر رینو بہل نے اوسط لہجہ میں کیا ہے۔

''...... یہاں سے نکل کر وہ سیدھے کاشی وشوناتھ مندر لے گیا۔
وہاں سے دونوں کو VIP ٹکٹ دلوا دی ......ٹکٹ والوں کی الگ قطار ہوتی ہے۔ VIP کی باری جلدی آجاتی ہے۔ یعنی بھگوان کے گھر بھی دولت والوں کی رسائی ہے۔'' (ص۔۱۰۶۔۱۰۵)

مصنفہ نے تفصیلی بیان کے بجائے بنارس کے کئی اہم مقامات کا صرف ذکر کر کے چھوڑ دیا ہے۔ لنکا، مدینی، شوالہ، سونا پورا، گوری گنج، جنگم باڑی، مدن پورا، سنکٹ موچن، تلسی مانس، درگا کنڈ، وشوامیدھ گھاٹ، میر گھاٹ، دال منڈی وغیرہ وغیرہ کا نام گناتے ہوئے مصنفہ آگے بڑھ گئی ہیں۔ ناول میں ہلکا سا تبصرہ سماجی اور سیاسی صورتحال پر بھی ہے۔

''...........آج کل یو پی کے حالات ویسے بھی خوشگوار نہیں تھے......کیسری رنگ کا بول بالا ہے۔ ان پر کوئی بھی قانون لاگو نہیں ہوتا۔ قانون کے رکھوالے جان بوجھ کر آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔'' (ص۔۲۱۹)

اس موضوع کو طول دینے کی پوری گنجائش تھی پھر بھی ناول نگار نے الجھنے کے بجائے شارٹ کٹ راستہ اختیار کیا ہے اور قاری کی توجہ صوبہ اتر پردیش کے سیاسی اور تہذیبی عناصر کی جانب مبذول کراتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی ہیں۔ جو بھی ہو، اتر پردیش صوبہ اور بنارس شہر سے متعلق اس ناول کا مجموعی تاثر منفی انداز لیے ہوئے ہے۔ ناول میں جس شہر کی زیادہ تفصیل ملتی ہے اور جسے زیادہ اہم تسلیم کیا گیا ہے، وہ ہے چنڈی گڑھ۔ مصنفہ کی رہائش اسی مقام کی ہے اس لیے سارے بیانات کی وہ چشم دید گواہ یعنی Eyewitness بھی ہیں۔ ان کے بیان میں مبالغہ نہیں۔

جب چنڈی گڑھ میں دیوا کر نے پہلی بار قدم رکھا تو اس کا تاثر بڑا اچھا رہا۔

> ''چنڈی گڑھ میں قدم رکھتے ہی وہ جان گیا تھا کہ جتنی تعریف اس شہر کی سنی تھی، اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ یہ جدید شہر اپنی خوبصورتی، صفائی اور نئے طرز کی تعمیر کی وجہ سے مشہور ہے۔ سڑکیں، مکان، دفتر، بازار، دکانیں، پارک سب بڑے ترتیب اور سلیقے سے تعمیر کیے گئے ہیں۔ کہیں بھی بے ترتیبی نظر نہیں آ رہی۔............ سڑکوں پر مویشی آوارہ گھومتے نظر نہیں آئے۔ نہ اس کے شہر جیسی تنگ گلیاں، نہ بھیڑ، نہ کھلی نالیاں،...... آمد و رفت کا سلسلہ بھی قاعدے سے چلتا ہے۔...... نہ کوئی گاڑی ادھر سے نکل رہی ہے اور نہ اسکوٹر ادھر سے...... ٹریفک کے رول با قاعدگی سے لاگو ہوتے نظر آئے۔......'' (ص۔۲۰)

دیوا کر نے اس سے قبل صرف ایک شہر یعنی بنارس کو دیکھا ہے۔ یہیں اس کی پیدائش ہوئی، یہیں اس کا پالن پوسن ہوا اور اسی شہر میں اس نے انٹر میڈیٹ تک کی تعلیم پائی۔ اسے چنڈی گڑھ کی کھلی فضا دیکھ کر حیرت اور خوشی ہوتی ہے۔ ناول میں کچھ ایسا تاثر ملتا ہے کہ ایک نوجوان کو گھٹن بھرے ماحول کے بعد کھلی فضا میسر آئی ہو۔

دیوا کر کی پڑھائی چنڈی گڑھ میں چل رہی ہے۔ اسی مناسبت سے اس شہر کا ذکر لازمی ہو جاتا ہے۔ ناول نگار کا تعلق چنڈی گڑھ شہر سے ہے۔ انہیں اس شہر اور قرب و جوار کی بھرپور جانکاری ہے۔ صوبہ پنجاب کی راجدھانی چنڈی گڑھ میں ہے، صوبہ ہریانہ کا دارالخلافت بھی چنڈی گڑھ میں ہے جبکہ یہ شہر بذات خود مرکز کے زیر انتظام ہے۔ ہندوستان کے دیگر مشہور شہروں کی بہ نسبت چنڈی گڑھ کی عمر کم ہے۔ 1947ء تک یعنی متحدہ ہندوستان میں اس شہر کا

وجود نہیں تھا۔ ملک کی تقسیم کے بعد پنجاب کی راجدھانی بنانے کے لیے اور مغربی پاکستان سے آئے ہوئے ریفیوجیوں کو بسانے کے لیے یہ شہر ایک خاص نقشہ، پلان اور اسکیم کے تحت بنایا گیا۔ انگریزوں کے زمانہ کی پنجاب یونیورسٹی کا ہیڈ کوارٹر لاہور میں تھا اور ہے۔ بٹوارے کے بعد وہ علاقہ پاکستان کا ہو گیا۔ ہندوستانی پنجاب کے علاقہ میں اس کمی کی بھرپائی کے لیے چنڈی گڑھ میں پنجاب یونیورسٹی قائم کی گئی۔ ناول میں یونیورسٹی کیمپس کے علاوہ آس پاس کے علاقوں کا ذکر بھی اچھے انداز میں آیا ہے۔ چندی گڑھ اور اطراف وجوانب کا ذکر کرتے ہوئے ناول نگار نے کئی اہم اطلاعات فراہم کی ہیں۔

> ''مشترکہ خاندان ہے۔ آٹھ بھائی اپنے پریواروں کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہیں۔ تقریبا پینتالیس افراد ہیں اور حیرت کی بات ہے کہ ایک ہی رسوئی میں کھانا پکتا ہے۔............
> ......ہال نما کمرے میں کھانے کے لیے زمین پر آسن لگے تھے۔''
> (ص۔۲۲)

> ''بچے سے لے کر بڑے تک سب پر ماں سرسوتی کا آشیرواد تھا۔ گھر کی بہو بیٹیاں بھی پڑھی لکھی، مہذب، گھر اور باہر کے کاموں میں برابر حصہ لیتی تھیں۔'' (ص۔۲۴)

سال 1925ء میں عابد حسین کا ڈرامہ ''پردۂ غفلت'' منظر عام پر آیا تھا۔ اپنے اس ڈرامہ میں مصنف نے مشترکہ خاندان کی مخالفت کی ہے۔ دوسری جانب رینو بہل نے مشترکہ خاندان کو ترقی کا زینہ سمجھا ہے۔ یہ اپنی اپنی سوچ کا معاملہ ہے۔ تعلیم نسواں سے متعلق دونوں فنکاروں کا نظریہ ایک جیسا ہے۔ گرچہ ''پردہ غفلت'' میں قاعدہ سے پڑھی لکھی صرف سعیدہ ہے جبکہ ''نجات دہندہ'' میں چنڈی گڑھ کی بیشتر خواتین تعلیم یافتہ ہیں۔ مصنفہ نے بار بار باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ عصبیت سے پاک تعلیم یافتہ معاشرہ ہر لحاظ سے خوشحال رہتا ہے۔

دیواکر کو جس آچاریہ جی نے یونیورسٹی کیمپس تک پہلی بار پہنچایا، ان کا آخری جملہ قابل غور ہے۔

> ''ہمارا کام تمھیں یہاں تک پہنچانا تھا، اب ہم فارغ اور تمہاری ذمہ داری شروع۔ آج سے نئے باب، نئی زندگی کا آغاز کرو۔ دکھا دو دنیا کو

کہ تم کسی سے کم نہیں۔'' (ص۔۲۴)

یہ نصیحت ایک طالب علم کو کی گئی ہے جسے دنیا کے سخت، نرم، سرد، گرم کو جھیلنا ہے۔ اپنی راہ خود بنانی ہوگی، خود ہی خار وخس سے سمجھوتا یا بچاؤ کرنا ہوگا۔ مفت خور یعنی پر جیوی یعنی Parasite والی فطرت سے دور رہنا ہوگا۔

پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کو اس ناول میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے بیشتر واقعات تعلیم اور تعلم سے تعلق رکھتے ہیں۔ طالب علموں کی مختلف اقسام کو ناول نگار نے پیش کر دیا ہے۔ دیوا کر بہت ہی اچھا طالب علم ہے۔ کتاب، لائبریری، لیکچر ہال، خود پڑھنا، اساتذہ سے قرب، ٹیوشن پڑھانا، اکیڈمی میں جا کر پڑھانا اور اس طرح کی مشغولیات کو اس نے اپنی روٹین میں شامل کر رکھا ہے۔ غریب ہے، گھر والے اس کے اخراجات پوری نہیں کر پاتے، اس کو اسکالرشپ کی رقم ملتی ہے۔ یونیورسٹی کیمپس سے باہر جا کر بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کا کام اس نے منظور کر لیا ہے، کچھ آمدنی ہو جاتی ہے، اس کو خود اپنا سابقہ سبق دہرانے کا موقع بھی مل جاتا ہے، ساتھ ہی دنیا کے مشکل ترین کام یعنی انسان کو کنٹرول کرنے کی ٹریننگ بھی اسے ملتی رہتی ہے۔ یعنی ایک پنتھ کئی کاج۔

دیگر طالب علموں کا ذکر بھی ناول میں آ گیا ہے۔ کچھ کھلنڈر قسم کے ہیں، کچھ کو سیر سپاٹے سے فرصت نہیں، کچھ کو جنس مخالف کی کشش زیادہ اچھی لگتی ہے، کچھ نشیڑی بھی ہیں۔ پھر بھی آسانی سے یا دشواری سے یا گرتے پڑتے اکثر طالب علموں کو سند مل جاتی ہے اور ان کے لیے زندگی کی ڈگر زیادہ مشکل نہیں رہ جاتی۔ ان طالب علموں میں امیر باپ کے بیٹے اور فوت شدہ باپ کے بیٹے بھی شامل ہیں۔ پڑھائی کم اور غیر ضروری کام زیادہ کرنے والے بھی ہیں۔ ایک طالب علم کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ خون کی ضرورت ہوئی تو دیوا کر نے اسے اپنا خون دیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر نے انکشاف کیا کہ خون خون ہوتا ہے اس کی درجہ بندی گروپ کے مطابق ہوتی ہے۔ خون کی اونچی جاتی یا نیچی جاتی نہیں ہوتی۔

سال 2016 میں صغیر رحمانی کا ناول ''تخم خون'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اپنے اس ناول کو مصنف نے دلت ڈسکورس (Dalit Discourse) کا آئینہ بتایا ہے۔ اچھوت طبقہ پر مختلف قسم کے مظالم کی تفصیل سے یہ ناول بھرا ہوا ہے۔ گھر جلانا، پٹائی کرنا، مار ڈالنا اور دلت عورتوں سے زنا بالجبر جیسے واقعات اس ناول میں معمولی قسم کے ہیں۔

ناول نگار نے باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اُنچ جاتی یعنی Forward caste کے خلاف اگر کوئی دلت پُر زور آواز اٹھاتا ہے یا خونیں کرانتی کا آہوان کرتا ہے تو اس کے پیچھے دلت عورت کے شکم سے پیدا شدہ اونچی جاتی کے نطفہ کی کارکردگی ہوتی ہے۔تخم خون کی ہیروئن بلایتی چمارن نے برہمن کے بیٹا من جی بابا تیواری کی پرورش اپنی اولاد کی طرح کردی، وہی من جی بابا جب سیانا ہوا تو موقع پا کر اس نے پرورش کرنے والی ماں بلایتی کا ریپ کر دیا۔حمل ٹھہرا اور ایک بیٹا پیدا ہوا۔بلایتی چمارن کے پیٹ سے پیدا شدہ برہمن کے نطفہ کو ناول نگار نے تخم خون کہا ہے۔

''تخم خون'' کے بعد ''نجات دہندہ'' کی اشاعت ہوئی ہے۔صغیر رحمانی کے اس ناول کو رینو بہل نے پڑھا ہو یا نہیں پڑھا ہو پھر بھی ان کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشہ میں یہ خیال موجود ہے۔دیواکر اور اس کے بچپن کے استاد یادو جی کی گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ دیوارکر کے پردادا جی پانڈے تھے۔

''دیواکر : پانڈے پریوار کے بارے میں کچھ جانتا تھا؟

یادو جی : پانڈے تو بہت ہیں وہاں، کوئی نام بتاؤ شاید کچھ بتا سکوں۔

دیواکر : بابولال پانڈے کا نام سنا ہے آپ نے؟

یادو جی : بابولال پانڈے، ارے بابولال وہ تو نہیں جنہیں برادری سے عاق کر دیا گیا تھا؟

دیواکر : جی جی وہی بابولال۔

یادو جی : رکو، رکو، کہیں تم بابولال کے خاندان سے تو نہیں؟ وہ بھی ڈوم بن گیا تھا۔

دیواکر : وہی بابولال میرے پردادا تھے۔''

(ص۔۱۲۵)

ایک اور مقام پر ناول نگار نے وضاحت کردی ہے :

''ڈوم ذات کے وجود میں آنے اور مقدس اگنی کے پیچھے بھی ایک قصہ ہے۔کہا جاتا ہے کہ صدیوں پہلے ماں ستی نے......خود کو ہون کنڈ میں جلا دیا تھا۔اس وقت ان کے کان کی ایک بالی گر گئی تھی جسے وہاں موجود ایک برہمن نے لوگوں کی نظریں بچا کر چرا لیا تھا۔......تب اس برہمن کو شمسان کی مقدس اگنی کا نگراں بنا دیا۔......اونچی ذات میں جنم لینے والا برہمن اپنے کرم

سے نیچ ذات کا ڈوم بن گیا۔......''

(ص۔۶۱)

یہاں اہمیت عمل کی ہے جس نے خلوص نیت سے آگے بڑھنے کی کوشش کی، اسے کامیابی ملی۔ ذات برادری یا پچھلا جنم کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ عمل سے زندگی بنتی ہے۔ اقبال نے اس مصرع میں جنت اور جہنم کا ذکر کیا ہے۔ رینو بہل اسی دنیاوی زندگی کے بیان پر اکتفا کرتی ہیں۔ جب یہاں کی زندگی نیکی کے راستے پر گزرے گی تو آگے بھی اچھی امید کی جاسکتی ہے۔

ناول میں کہانی سے زیادہ اہم کہانی کی بنت ہے اور اس سے زیادہ پراثر رینو بہل کا طرز تحریر ہے۔ موقع محل کے اعتبار سے انہوں نے زبان استعمال کی ہے اور تصویر کشی کا انداز بھی بدل دیا ہے۔ ان کی پیش کردہ تصویریں کبھی کبھار جامد اور بیشتر متحرک ہیں۔ ناول کی فضا میں قاری کو مستغرق کر دینا بڑے فنکاروں کا طریقہ ہوتا ہے۔ یہ فضابندی مصنوعی نہیں بلکہ فطری انداز لیے ہوئے ہے۔

قاری کے جذبات کو بھی ناول میں مصنفہ نے شامل کر دیا ہے۔ تعلیم کے میدان میں دیوا کرتگ و دو کرتا ہے۔ اس کی حوصلہ افزائی کے لیے بڑے بھائی بھاسکر اور مقامی ٹیچر یادو جی جیسے لوگ موجود ہیں۔ قاری خود کو دیوا کر، بھاسکر یا یادو جی کا ہمنوا محسوس کرتا ہے۔ جب یامنی کی محبت بھری عرضی مختلف روپ میں، مختلف رنگ میں، مختلف انداز میں، مختلف آہنگ میں اور مختلف اوقات میں دیوا کر کے دربار میں پیش ہوتی ہے تو قاری کا دل بھی محبت کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔

اردو ناول کے باب میں ''نجات دہندہ'' ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اس ناول میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی امید اوسط قاری کو ناول سے ہوتی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ میڈم رینو بہل کو مستقبل کے قارئین یاد رکھ پائیں گے۔

DR. SUFIA FATIMEE

Asstt. Professor, MRM College,

L.N. MITHILA UNIVERSITY, DARBHANGA- 846004

Mob. 7763051364

اردو کی جدید افسانہ نگار عصمت چغتائی

ڈاکٹر عائشہ عبدالعزیز پٹھان

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، پنیہ شلوک اہلیہ دیوی ہولکر، شولا پور یونیورسٹی، شولا پور

عصمت چغتائی ایک مشہور ناول نگار ہیں۔ انھوں نے اردو ادب میں ناول کو ایک نئی وسعت بخشی۔ عصمت چغتائی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھیں۔ عصمت چغتائی کی مقبولیت میں ان کی زبان کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ عصمت چغتائی صاف ستھری اور رواں زبان استعمال کرتی ہیں۔ عصمت چغتائی نے خاص طور متوسط مسلمان گھرانوں کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی کہانی ناول میں بیان کرتی ہیں۔ عصمت چغتائی کے یہاں جنسی موضوعات ملتے ہیں۔ عصمت چغتائی کو عورتوں کی بول چال پر زیادہ عبور حاصل تھا۔

عصمت چغتائی کا ناول '' ٹیڑھی لکیر'' ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ ان کا پہلا ناول ''ضدی'' ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ ان کے دیگر ناول اور ناولٹ میں ''معصومہ سودائی''، عجیب آدمی''، ''دل کی دنیا'' اور ''ایک خطرہ خون'' شامل ہے۔

''ضدی'' ناول ایک کرداری ناول ہے۔ اور پورن کا کردار اس ناول میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ پورن ہی کی زندگی کے المیہ کو موضوع بنایا ہے۔ اس جہت سے پورن کی شخصیت نمایاں اور اس کی سیرت کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ناول کے تمام واقعات اسی کے گرد گھومتے ہیں یہ ناول ۱۲۰ صفحات پر تصویر کشی کی ہے۔ اس ناول میں بھی انھوں نے اپنے ترقی پسندانہ شعور کا مظاہرہ کیا ہے۔ پلاٹ کے واقعات مربوط ہیں۔ اور پورن متوسط طبقے آمیز اخلاقی روایتوں اور طبقاتی نظام کی ہمواریوں اور کشمکشوں کی وجہ سے ضدی بن جاتا انسان کی ذات ہے۔ جس کے تجربات کی عکاسی مختلف زاویوں سے کرتے ہوئے تہہ بہ تہہ کر کے کھولی جارہی ہیں۔ ان کا پہلا ناول ''ضدی'' ہے۔ جو فنی اعتبار یا تکنیکی اعتبار سے زیادہ اہم ہے۔ یہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۱ء میں لکھا۔ اپنی نفسیاتی پیشکش کی بناء پر بھی اہمیت حاصل کر گیا ہے۔

عصمت کا دوسرا ناول ''ٹیڑھی لکیر'' ۱۹۴۷ء میں منظر عام پر آیا۔ جو کسی حد تک ان کا شاہکار ناول ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک افسانے کی حیثیت کی رکھتا ہے۔

عورتوں کے مسائل پیش کرنے والے افسانوں پر نظر ڈالی جائے تو عصمت چغتائی کے افسانے سرفہرست نظر آئیں گے۔ عصمت چغتائی نے اپنے افسانوں میں عورت کی زندگی کے تقریباً ہر پہلو کو پیش کرتے ہوئے انھیں درپیش مختلف مسائل کو اُجاگر کیا ہے۔ گویا 'عورت' ان کے تمام افسانوں کا موضوعاتی محور ہے۔ جہاں ایک طرف ان کے افسانوں کی خصوصیت عورتوں کے مسائل ہیں، وہیں اس کا دوسرا پہلو جنسیات بھی ہے۔ انھوں نے کہیں کہیں تو بڑی بیباکی سے جنسیات کا ذکر کیا ہے جس کی مثال ان کا افسانہ 'لحاف' ہے۔ 'لحاف' میں جب انھوں نے عورتوں کی ہم جنسی کے پہلو کو اُجاگر کیا تو اس کے سبب ان کو مقدمہ کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ کہیں انھیں فحش نگار کہہ کر ناپسند کیا گیا تو کہیں حقیقت نگار کہہ کر ان کے اقدام کو سراہا گیا۔ جب عصمت چغتائی سے ان پر لگے فحش نگاری کے الزام پر صفائی مانگی گئی تو انھوں نے بڑی بے باکی سے کہہ ڈالا ''دُنیا میں کچھ بھی گندا نہیں۔ اگر بدن گندا نہیں ہے تو اس کا ذکر بھی گندا نہیں''۔

اگر چہ منٹو اور دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی جنسیات اور عورت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے، مگر عصمت چغتائی نے جس طرح سے جنسیات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا اور جس طرح عورتوں کے مسائل کا ذکر کیا ہے، وہ دوسروں کے یہاں بمشکل تمام ہی ملتا ہے۔ عصمت کے افسانے عورت کو ہر رنگ اور روپ میں بیان کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ جس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے عورت ہو کر عورتوں کے مسائل پر قلم اُٹھایا ہے۔ عصمت چغتائی نے ہر طبقہ کی عورتوں کے مسائل کو پیش کیا ہے اور ہر طبقہ کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگوں کی خوشیاں، غم، طرز زندگی اور ان کے نفسیاتی، جنسی، معاشی کوائف، غرض کہ زندگی کے تمام پہلوؤں کو انھوں نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔

عصمت چغتائی نے صرف نوجوان لڑکیوں کے مسائل کے بارے میں ہی نہیں لکھا بلکہ نوجوان لڑکوں کی جنس مخالف کی جانب کشش کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ افسانہ ''ہیرو'' کا نوجوان نوکر 'سکھا' جو حمیدہ بی بی کی طرف مائل ہے۔ وہ اگر چہ اس کے لئے اپنی محبت کو پوری طرح نہیں سمجھ پاتا، لیکن حمیدہ بی بی کے لئے اسے ہر کام کرنے میں راحت ملتی ہے۔ اسی طرح ''خدمت گار'' میں گھر میں پلا بڑھا ایک نوجوان نوکر اپنی نوجوان مالکہ کی محبت میں گرفتار

ہوتا جاتا ہے۔مگر کم عمری کی وجہ سے اسے محبت کے جذبہ کا احساس نہیں ہوتا۔محبت کا احساس اسے اُس وقت ہوتا ہے۔جب مالکہ کا رشتہ امیر آدمی سے ہوجاتا ہے۔

عصمت چغتائی نے اپنے بعض افسانوں میں جنسیات کے بغیر بھی رومانوی جذبات کوموضوع بنایا ہے۔افسانہ''تنہا تنہا'' میں کالج کے دو اسٹوڈنٹس کی محبت کو پیش کیا ہے ۔جو ایک دوسرے کو چاہتے تو ہیں،مگر اس کا اظہار نہیں کرتے۔تقسیم ہند کے بعد دونوں جدا ہوجاتے ہیں اور ایک دوسرے کی محبت میں تنہا تنہا زندگی گزار دیتے ہیں۔گویا جدائی اور دُوری ہونے کے بعد بھی ان کی محبت ختم نہیں ہوتی۔اسی طرح 'پنکچر' بھی عصمت کا رومانوی افسانہ ہے ۔جس میں دو کردار'میں اور وہ' اتفاقی طور پر ملتے ہیں اور ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔مگر انا کی وجہ سے کوئی بھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتا۔آخر کار جب 'میں' کی منگنی کسی اور سے ہوجاتی ہے تو 'وہ' ہار مان جاتا ہے اور اظہار محبت کر کے شادی کی درخواست کرتا ہے جسے 'میں' قبول کر لیتی ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ محبت میں انا کبھی شامل نہیں ہونی چاہئے، ورنہ جدائی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

عصمت چغتائی نے غربت کی چکی میں پستی عورتوں کی مجبوریوں اور محرومیوں کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔افسانہ''بھیڑیں'' میں یہ حقیقت سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس معاشرے میں کہیں کہیں عورتوں کو جانور سے بھی زیادہ حقیر سمجھا جاتا ہے۔عصمت چغتائی نے اپنے افسانوں میں بیوہ عورتوں کے مسائل اور معاشرے میں ان کے ساتھ افسوس ناک سلوک کو بھی موضوع بنایا ہے۔'عشق پر زور نہیں' میں انھوں نے 'خلیفن بوا' کے کردار کے ذریعہ ہمارے معاشرے میں ایسی عورتوں کی حالتِ زار کو پیش کیا ہے جو بیوگی کی وجہ سے اپنوں میں بھی بیگانگی کی زندگی گزارتی ہیں۔عصمت نے لڑکیوں کی شادی کو بھی اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔جس کی مشہور مثال ان کا افسانہ 'چوتھی کا جوڑا' ہے۔اس میں انھوں نے دکھایا ہے کہ بعض لڑکیاں اگرچہ ہر لحاظ سے شادی کے قابل ہوتی ہیں اور ایک اچھی بیوی بننے کی تمام خوبیاں ان میں موجود ہوتی ہیں۔مگر غربت کی وجہ سے انکی شادی نہیں ہو پاتی۔ یہاں تک کہ وہ گھر بسانے کی آرزو اپنے دِل ہی میں دفن کر کے اس دُنیا سے رخصت ہوجاتی ہیں۔

عصمت چغتائی نے نہ صرف معاشرے کے کمزور طبقہ کے استحصال کے خلاف آواز اُٹھائی بلکہ انھوں نے معاشرے کے خودساختہ نام نہاد اعلیٰ اور شریف طبقہ کی حقیقت کو بھی

بے نقاب کیا۔افسانہ ’پہلی لڑکی‘ میں عصمت نے دکھایا ہے کہ کس طرح نام نہاد شرفاء کے گھرانوں میں شرافت کی دھجیاں اُڑائی جاتی ہیں۔ان کی شادیاں محض ایک رسم ہے۔اسی طرح افسانہ ’نیند‘ میں دکھایا گیا ہے کہ اعلیٰ سوسائٹی کے لوگ کس طرح اپنی بیویوں کا استعمال کرکے مال و مفادات حاصل کرتے ہیں۔عصمت چغتائی نے اپنے افسانوں کے موضوعات و واقعات اور کردار نہ صرف حقیقی زندگی سے لئے ہیں بلکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے افسانوں کو حقیقت ثابت کرنے کے لئے انھوں نے مختلف طریقوں کا استعمال بھی کیا ہے۔جس کا اندازہ افسانہ ’موکھا‘ اور ’لحاف‘ کے بعض مکالماتی حصوں سے بخوبی ہوتا ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ عصمت کا فن افسانہ نگاری نہایت بالیدہ ومنفرد ہے۔انھوں نے اپنے مخصوص باغیانہ رجحان کے تحت عورتوں کے عام معاشرتی مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے اور فرسودہ روایات، معاشرتی تضادات اور جبر واستحصال پر کاری ضرب لگائی ہے۔ ان کی کہانیاں نہ صرف اپنے مواد، تکنیک اور پلاٹ کی وجہ سے چونکا دینے والی ہیں بلکہ زبان و بیان اور طنزیاتی لب ولہجہ کے اعتبار سے بھی قابل قدر اہمیت کی
حامل ہیں اور اپنا انفرادی رنگ رکھتی ہیں۔ بے شک لفظی مصوری سے ان کی کہانی کا ہر کردار اور ہر واقعہ ہماری نگاہوں کے سامنے روشن ہو جاتا ہے اور یہ ایک بڑی خوبی ہے۔جو ان کے ہم عصر فنکاروں اور خصوصاً ان کی معاصر خواتین کے یہاں بمشکل تمام ہی مل پاتی ہیں۔عصمت چغتائی پر فحش نگاری، عریانیت اور تلذذ پرستی سے کام لینے کا الزام رکھنا آسان ہے۔اس سے پوری طرح انکار بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن فنی محاسن کی پاسداری کے ساتھ انھوں نے معاشرے اور ماحول کی جو ڈھکی چھپی سچائیاں جس مخصوص انداز سے دکھائی ہیں اور جس فنی چابکدستی کے ساتھ ان کی عکاسی کی ہے، وہ بہر حال اُردو کے افسانوی ادب کا یادگار سرمایہ ہے۔

حوالہ جات :۔

(۱) نمائندہ مختصر افسانے مرتبہ: محمد طاہر فاروقی
(۲) اردو افسانے ،انشائے اور ڈرامے محمد قاسم صدیقی
(۳) اردو کے تیرہ افسانے مرتبہ: ڈاکٹر اطہر پرویز

غالبؔ فدائی بحیثیت صحافی

ڈاکٹر اے۔شبیر باشاہ
شعبہ اردو، آچاریہ ناگارجنا یونیورسٹی، گنٹور، آندھرا پردیش
موبائل:7981921002

صحافت عربی زبان کا لفظ ''صحف'' سے ماخوذ ہے۔ جس کے لغوی معنی صفحہ، کتاب یا رسالہ کے ہیں۔ جدید عربی میں جریدہ اور اخبار کو بھی صحیفہ کہتے ہیں۔

عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

''صحیفے سے مراد ایسا مطبوعہ مواد ہے جو مقررہ وقفے کے بعد شائع ہوتا ہے۔ چنانچہ عام اخبارات ورسائل صحیفے ہیں اور جو لوگ اس کی ترتیب وتحسین وتحریر سے وابستہ ہیں انہیں صحافی کہا جاتا ہے اور ان کے پیشے کو صحافت کا نام دیا گیا ہے۔1؎

صحافت جدید وسائل کے ذریعے عوامی معلومات رائے عامہ اور عوامی تفریحات کی باضابطہ اور مستند اشاعت کا فریضہ انجام دیتی ہے۔

صحافت ایک ایسا پیشہ ہے جس میں خبروں کی تلاش ان کی تحقیق، اور پھر انہیں عوام تک پہنچانا شامل ہے۔ یہ کام مختلف ذرائع ابلاغ جیسے اخبارات، رسائل، ٹیلی وزن، ریڈیو اور انٹرنیٹ کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد شاہد حسین نے صحافت کو بہت ہی سہل انداز میں اس طرح واضح کیا ہے:

''صحافت خبر ہے، اطلاع ہے، جانکاری ہے۔ صحافت عوام کے لیے عوام کے بارے میں تخلیق کیا گیا مواد ہے۔ یہ دن بھر کے واقعات کو تحریر میں نکھار کر آواز میں سجا کر، تصویروں میں سمو کر انسان کی اس خواہش کی تکمیل کرتی ہے جس کے تحت وہ ہر نئی بات جاننے

کے لیے بے چین رہتا ہے۔''2؎

صحافت ایک ایسا پیشہ ہے جس میں خبروں کی تلاش ان کی تحقیق اور پھر انھیں عوام تک پہنچانا شامل ہے۔مختلف ذرائع ابلاغ جیسے اخبارات، رسائل، ٹیلی وژن، ریڈیو اور انٹرنیٹ کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

صحافت ترقی یافتہ سماج میں ایک اہم ادارے کی حیثیت رکھتی ہے۔آج کے جمہوری معاشرے میں جو ہمہ جہت ترقیاں رونما ہورہی ہیں،ان میں بلا شبہ اخبارات ورسائل نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔اخبارات ورسائل نہ صرف معلومات کی فراہمی کا ایک موثر ذریعہ ہیں بلکہ ان کے ذریعہ عوام میں قومی، معاشی، سیاسی اور تہذی شعور کو بیدار کرنے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ اخبارات ورسائل ہم کو گردو پیش کے حالات سے باخبر کرانے کے ساتھ ساتھ ان تمام حالات و مسائل کے بارے میں غور وفکر کی دعوت بھی دیتے ہیں۔اس طرح اخبار اور رسائل انسانی مسائل اور ان کے حل کے تعلق سے معاشرے میں رائے عامہ کی تشکیل میں بھی ایک موثر کردار ادا کرتے ہیں۔

غالب فدائی جنوبی ہند کے ساحلی آندھرا کے ایک مشہور ومعروف شاعر و ادیب ہیں۔ ان کی ولادت 15 جنوری 1913ء کو ایلور ضلع مغربی گوداوری میں ہوئی۔غالب فدائی ایک ہمہ جہتی شخصیت کے حامل تھے، انہوں نے ملک کی سیاست میں بھی عملی حصہ لیا اور صحافت کے میدان میں بھی کارہائے انجام دیے۔وہ اردو کے ایک معتبر استاد شاعر بھی تھے اور ایک کامیاب صحافی بھی۔اس کے علاوہ وہ ایک سرگرم سماجی رہنما بھی تھے۔

محمد غالب فدائی ایک باشعور انسان تھے۔انہوں نے 1942ء میں آندھرا یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی اور 1945ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے جرنلزم (ڈپلوما) کی سند حاصل کی۔ان کا پیشہ صحافت سے تعلق رکھتا تھا۔جس دور میں غالب فدائی اعلیٰ تعلیم حاصل کررہے تھے وہ ملک وقوم کے لیے ایک ہنگامہ خیز دور تھا۔ ہندوستان کے طول اور عرض میں تحریک آزادی اپنے شباب پر تھی، ہندوستانی عوام حصول آزادی کے بعد ہندوستان میں قائم ہونے والے نظام حکومت کے تعلق سے اختلاف رائے رکھتے تھے لیکن ملک سے برطانوی تسلط کو ختم کرنے اور انگریزوں کو باہر نکالنے کے معاملے میں بھی متحد تھے۔

غالب فدائی سیاسیات جیسے مضمون میں ماسٹر ڈگری حاصل کی تھی۔ساتھ ہی صحافت میں

ڈپلوما بھی کیا تھا۔اس طرح وہ ملک کے سیاسی حالات اورقومی مسائل سے خوب واقف تھے۔ ایک باشعوراورتعلیم یافتہ نوجوان کی حیثیت سے وہ ملک کی سیاسی تحریک میں عملی حصہ لینا چاہتے تھےلیکن ان کی خاندانی ذمہ داریاں انہیں تلاش معاش اورحصول روزگار پرمجبورکررہی تھیں۔ان حالات میں غالب فدائی نے ان دونوں کے درمیان سمجھوتے کی یہ راہ نکالی کہ انہوں نے صحافت کواپنے پیشے کےطور پراختیار کیا۔

ابودانش لکھتے ہیں:

''جواں سال غالب فدائی نے آندھرایونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد 1944ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے صحافت کا ڈپلومہ لیا۔ بعدازاں 1952ء میں دہلی کےاس وقت کےایک مشہورومعروف انگریزی ہفتہ وارکامرس اینڈانڈسٹری کےاسٹنٹ ایڈیٹرکی حیثیت سےاس کارگہ شیشہ گراں میں باقاعدہ طورپرعملی زندگی کا آغازکیا۔''3

غالب فدائی نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز 1952ء میں دہلی کے انگریزی ہفتہ وار کامرس اینڈ انڈسٹری میں نائب مدیرکی حیثیت سے کیا۔اس سے پہلے وہ دی اور ینٹ پریس لاہورکےسٹی رپورٹر، دی ایسٹرن ٹائمس لاہورکے نیوزایڈیٹر، دی پاکستان ٹائمس لاہورکےسب ایڈیٹرکی حیثیت سےصحافتی کارنامےانجام دیں۔بعدازیں جمعیت علماء ہندکے ہفتہ واراخبارمسیح سےوابستہ ہوئےاوراس اخبارسےانہیں تقریباچھ سال وابستگی رہی ہے۔غالب فدائی نے اخبار مسیح کے نائب مدیرکی حیثیت سے بڑا فعال کرداراداکیا۔تقسیم ہندکے بعدرونما ہونے والے پر تشددواقعات اورفرقہ واریت نے ہندوستانی مسلمانوں میں خوف وہراس اورعدم تحفظ کا احساس پیدا کیا تھا،ایسے حالات میں ملک کا دانشورانہ طبقہ اکثریت اوراقلیت کے درمیان افہام وتفہیم کی صورت پیدا کر کے آپسی غلط فہمیوں کو دورکرے اورامن وآتشی کی فضاء کو بحال کرے۔غالب فدائی نے ایک ذمہ دارصحافی اوردانشورکی حیثیت سےاس کام کوانجام دیا۔انہوں نے اخبارمسیح کے ذریعہ ملک وملت کےان سلگتے مسائل کوحل کرنے کی بھرپورکوشش کی۔

ابودانش لکھتے ہیں:

’’یہ اخبار ان دنوں اسلامیان ہند کی امنگوں اور آرزوؤں کا محور بنا ہوا تھا۔ آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو مشکلات و مصائب کے جس جان لیوا بھنور نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اس سے نکل پانے کی آرزو تو بہت سے سینوں میں مچل رہی تھی لیکن اس کی عملی شکل کیا ہو، ملت کی شیرازہ بندی کس طرح کی جائے، بدگمانیوں کے انبار سے نجات کس طرح حاصل کی جائے، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا کس طرح جائے، وہ لوگ جو بے سبب ارتکاب جرم کے بغیر احسام جرم میں مبتلا ہیں، جنہوں نے آس کا دامن چھوڑ دیا ہے ان میں ایک بار پھر سر اٹھا کر چلنے کا حوصلہ کس طرح پیدا کیا جائے، مسیح کا مقصد ان سوالوں کا جواب تلاش کرنا بھی تھا اور ارباب بست و کشاد کو ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے مسائل سے واقف کرانا بھی تھا۔ اور وہ اپنے اس مقصد میں جس حد تک بھی کامیاب رہا اس کا سہرا دوسروں کے علاوہ اس کے اسسٹنٹ ایڈیٹر غالب فدائی کے سر بھی بندھتا ہے۔4‘‘

غالب فدائی نے اخبار مسیح کے مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور اس اخبار کو ہندوستانی مسلمانوں کی آواز اور ان کے مسائل کا ترجمان بنانے کی پوری کوشش کی۔ یہ اخبار مختلف مسائل کا شکار ہو کر بند ہو گیا۔ اخبار مسیح کے بند ہو جانے کا غالب فدائی کو بڑا افسوس رہا، لیکن ان کے اندر کا صحافی خاموش بیٹھنے پر کسی صورت میں آمادہ نہیں تھا۔ قوم وملت کی خدمات انجام دینے کے لیے وہ کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے ہمیشہ تڑپ رہے تھے۔ قوم کی خدمت کے یہی پرخلوص جذبات جب خارجی اور عملی صورت اختیار کرتے ہیں تو وہ 1960ء میں ایک نئے اخبار ’’صراط‘‘ کے پیکر میں سامنے آئے۔ دہلی سے ہفتہ وار صراط کا اجراء غالب فدائی کا ایک غیر معمولی فیصلہ تھا۔ انہوں نے یقین واعتماد، خلوص ونیت، اور ملت کی خدمت کے بے پناہ جذبے کے ساتھ اس اخبار کو جاری کیا۔

’’صراط‘‘ پندرہ برس تک کامیابی کے ساتھ شائع ہوتا رہا، ان پندرہ برسوں کے دوران صراط کے صفحات میں نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن سنائی دیتی رہی بلکہ عالم

اسلام کے مسائل کی بازگشت بھی سنی جاتی رہی۔ صراط مسلمانانِ ہند کے ساتھ ساتھ دنیا کے دوسرے خطوں میں آباد مسلمانوں کے مسائل و مصائب کے علاوہ مختلف میدانوں میں ان کی ترقیاتی پیش رفت کی تصویر بھی دکھاتا رہا۔ 1960ء سے 1975ء تک عالم اسلام میں جو بھی اہم اور قابل ذکر چیز وقوع پزیر ہوتی رہی، اس کا عکس ہمیں 'صراط' کے مختلف شماروں میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ غالب فدائی اخبار صراط کے مدیر اور اداریہ نگار کی حیثیت سے اپنے فرائض بخوبی انجام دی ہیں۔ وہ ایک ذمہ دار صحافی ہیں، اس کا انداز وخاص طور پر صراط کی فائلوں سے لگایا جا سکتا ہے اس لیے کہ صراط کی ادارت بلاشریک غیر سے ان کی ذاتی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ صراط میں کئی دیگر حضرات کے مضامین اور فیچرس بھی شامل ہوتے تھے، اس طرح غالب فدائی نے اپنے اخبار کے مخصوص کردار اور اس کی شناخت کو ہمیشہ بنائے رکھا۔

غالب فدائی 1960ء میں اخبار صراط جاری کرنے سے پہلے کئی دوسرے اخبارات ورسائل میں ایک صحافی کی حیثیت سے خدمات دیے ہیں۔ یہ تمام اخبارات مختلف اداروں کی ملکیت تھے اور ان میں غالب فدائی کی حیثیت عموماً نائب مدیر کی تھی، جب کہ صراط ان کا ذاتی اخبار تھا، یہاں انہیں اظہار خیال کی مکمل آزادی تھی اور یہ بھی اختیار حاصل تھا کہ وہ اس میں اپنی پسند اور انتخاب کے مطابق مضامین شامل کریں۔ غالب فدائی پندرہ سال تک مسلسل یہ ہفتہ وار اخبار نکالتے رہے۔ اس طرح ایک صحافی کی حیثیت سے صراط ان کا شناخت بناتا ہے۔ صراط 1960ء سے 1975ء تک مسلسل نکلتا رہا، 1975ء میں بعض ذاتی اور خاندانی مجبوریوں کی وجہ سے جب انہیں دہلی سے وشاکھاپٹم واپس جانا پڑا تو صراط بھی جاری نہ رہ سکا۔

ڈاکٹر مقبول فاروقی لکھتے ہیں:

> ''غالب فدائی صاحب بڑے Committed صحافی تھے۔ انہوں نے بڑے خلوص اور محنت کے ساتھ کئی برس تک ''صراط'' کو جاری کیا رکھا اور عوامی شعور کو بیدار کرنے اور قومی اور بین الاقوامی حالات سے قارئین کو آگاہ کرنے کی قابل قدر خدمات انجام دیتے رہے۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ اخبار کو جاری رکھنے کے لیے اچھے خاصے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اتنے مالیے کی فراہمی غالب فدائی صاحب کے بس سے باہر کی چیز تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کچھ عرصے

تک کامیابی سے چلنے کے بعد صراط کی اشاعت بند ہوگئی۔''5

جہاں تک ظاہری صورت کا سوال ہے صراط عام ہفتہ وار اخبار کی طرح نہیں ہوتا تھا بلکہ ماہناموں کی سائز 25x19 سنٹی میٹر میں شائع ہوتا تھا اور ماہنامہ رسالوں کی طرح اس کی جلد بندی ہوتی تھی۔ ہر شمارہ 24 صفحات پر مشتمل ہوتا تھا اور اس پر کسی نہ کسی ممتاز شخصیت کی تصویر شائع ہوتی تھی، جس پر کوئی مفصل تعارف یا مضمون ابتدائی صفحات میں شامل ہوتا تھا۔ سرورق پر ایک طرف مشمولات کی فہرست بھی دی جاتی تھی۔ صراط کا زرسالانہ چھ روپے اور فی شمارہ کی قیمت پچاس روپے ہوتی تھی۔ سرورق ہی پر یہ درج ہوتا تھا کہ یہ ایک سیاسی اور تہذیبی رسالہ ہے اس کی مشمولات میں خاصا متنوع پایا جاتا تھا۔ غالب فدائی رسالے کے بنیادی مزاج کو قائم رکھتے ہوئے قارئین کی دلچسپی کو بھی پیش نظر رکھا کرتے تھے۔ صراط کی مشمولات میں عالم اسلام کی خبروں کو سب سے زیادہ نمایاں حیثیت حاصل تھی، اس ذیل میں ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کے علاوہ بیرونی مسلم ممالک کے احوال وکوائف کی تفصیلات کو بھی درج کیا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ حفظان صحت کھیل کود اور دیگر تہذیبی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔

غالبؔ فدائی نے صراط کے ہر شمارے میں ہندوستانی مسلمانوں کے حالات و مسائل کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی مسائل پر اظہار خیال کرتے رہے۔ وہ صراط کے تقریباً ہر شمارے کے ذریعہ مسلم ممالک کے سیاسی، تہذیبی وثقافتی حالات اور وہاں وقوع پذیر ہونے والی صورت حال سے لوگوں کو آگاہ کرتے رہے، اس سے فائدہ یہ ہوا کہ ہندوستانی عوام وخواص کے سامنے مسلم ممالک کی صحیح تصویر آئی۔ اور دوسرے یہ کہ خود مسلم ممالک کے سربراہوں نے صراط کی ان خدمات کا بطور خاص نوٹ لیا، کئی مسلم ممالک نے غالب فدائی کی صحافتی خدمات اور ملت اسلامیہ کے ساتھ ان کے جذباتی لگاؤ کے پیش نظر انہیں سرکاری طور پر اپنا مہمان بنایا۔ ہندوستان کے بہت کم صحافیوں کو ایسا اعزاز حاصل ہوا ہوگا جیسا کہ غالب فدائی کو حاصل ہوا۔ ایک صحافی کی حیثیت سے ان کی طویل قومی اور ملی خدمات کا نہ صرف ہندوستان کے مختلف گوشوں میں اعتراف ہوا، بلکہ بیرون ممالک میں بھی ان کی غیر معمولی عزت افزائی ہوئی۔ 1964ء میں سعودی حکومت کی دعوت پر غالب فدائی سرکاری مہمان کی حیثیت سے سعودی عرب گئے۔ وہاں انہوں نے مکہ مکرمہ جاکر عمرہ کرنے کی سعادت حاصل کی اور پھر وہاں سے مدینہ تشریف لے گئے۔ سعودی عرب سے واپسی کے وقت انہوں نے اردن، شام، عراق، اور لبنان کی حکومتوں کی

دعوت پر ان تمام ممالک کا بھی دورہ کیا۔ 1969ء میں غالب فدائی کو الجزائر، تونس، مصر، ترکی سعودی عرب، سوڈان، اردن، شام، عراق، اور ایران کی حکومتوں نے اپنا مہمان بنایا، اس دوران میں انہوں نے فلسطین کا بھی سفر کیا۔ 1983ء میں حکومت سعودی کی دعوت پر فریضہ حج ادا کیا اور اس طرح وہ آرزو بھی پوری ہوگئی جو ہر مسلمان کے دل میں مچلتی رہتی ہے۔

ایک صحافی کی حیثیت سے غالب فدائی نے جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ یقیناً نہایت قابل ذکر اور قابل تحسین ہیں۔ انہیں جو قومی اور بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی وہ بہت کم صحافیوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اردو ادب میں غالب فدائی کی صحافتی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔

حوالے:

1۔ فن صحافت از عبدالسلام خورشید، ص۔ 136

2۔ ابلاغیات از ڈاکٹر محمد شاہد حسین، ص۔ 44

3۔ ابودانش محمد غالب فدائی مختصر تعارف، مشمولہ، آتشِ احساس، 1990، ص۔ 7

4۔ ابودانش محمد غالب فدائی مختصر تعارف مشمولہ، آتشِ احساس، 1990، ص۔ 8

5۔ غالب فدائی ساحلی آندھرا کا ایک گم نام ادیب وشاعر از ڈاکٹر نشاط احمد، ص۔ 12

منظر شہاب کا شعری اختصاص

عشرت شیریں

ریسرچ اسکالر شعبہ اردو کولہان یونیورسٹی چائباسہ

اردو کے مؤقر رسائل اور جرائد بالخصوص شاہراہ میں جس شاعر کی غزل ونظموں نے 1950 عیسوی کے آس پاس قارئین کے دلوں پر گہرا اثر پیدا کیا ان کا نام منظر شہاب ہے، ان کے زمانے میں شائع شدہ چند نظموں نے نوجوان شعراء میں انہیں ایک مقام عطا کر دیا، منظر شہاب نے جب شاعری کی ابتدا کی وہ زمانہ ترقی پسندی کا زمانہ تھا اس وقت کے تمام شعراء عوام سے بڑے جوش وخروش کے ساتھ مخاطب ہو رہے تھے یعنی کہ عوامی شاعری کا چلن تھا لیکن منظر شہاب نے اپنے لہجے میں وہ گن گرج نہیں پیدا کیا بلکہ نرمی اور نازکی سے کام لیا مثال کے طور پر 1948 میں شائع ہونے والی ان کی ایک نظم سنہرے لمحے ملاحظہ کریں:

سنہرے لمحے۔۔۔
نئی سحر کے سنہرے لمحے۔۔۔
رخ جہاں سے ردائے ظلمت ہٹا رہے ہیں۔۔۔
ردائے عظمت ہٹا رہے ہیں۔۔
فضا کو زرّیں بنا رہے ہیں۔۔

یہی لہجہ انہوں نے آگے بھی قائم رکھا انہوں نے تخلیق کے معاملے میں بہت سست روی اختیار کی بسیار گوئی سے اپنا دامن بچائے رکھا مگر جو لکھا ہے اسے اردو دنیا بھلا نہیں سکتی وہ بالواسطہ اظہار کی شاعری کرتے ہیں ترقی پسند تحریک کا دامن بھی تھاما رومانی رنگ کو جگہ بھی دی مگر شاعری کو شاعری ہی رہنے دینے پر اتفاق کیا؟ ماحول کے ساتھ چلنے کا ہنر معلوم تھا انہیں اس بات کا یقین تھا کہ انہوں نے شاعری کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ کریں

تیرے اشعار میں عجب تاثر ہے شہاب

رگ افکار کو تو خونِ جگر دیتا ہے

منظر شہاب کی شاعری بالخصوص نظمیہ شاعری پر فیض احمد فیض کا رنگ نظر آ تا ہے فیض ہی کی طرح منظر شہاب نے بھی غمِ جاناں اور غمِ زیست کا اظہار اپنے شاعری میں پیش کیا۔ ڈاکٹر شمش الضحی شمش جالوی منظر شہاب کی شاعری کے محاسن بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''زمانہ طالب علمی ہی سے شعروشاعری کا ذوق دامن گیر رہا ہے ترقی پسند تحریک سے بھی باضابطہ منسلک رہے ہیں مگر حقیقت نگاری کے شعار کو انہوں نے متوازن رکھا ہے۔ غمِ جاں غمِ زیست کے جس خوبصورت امتزاج کی مصوری وہ کرتے رہے ہیں اس سے فیض احمد فیض کے شعری آہنگ کی یاد تازہ ہوتی ہے شعری اسلوب میں ایک ایسی حلاوت اور کشش انگیز نرمی نمایاں نظر آتی ہے۔ جس کی وجہ سے قاری بے ساختہ متوجہ ہوتے ہیں منظر شہاب نے ترقی پسندانہ فکر و نظر سے گہرے دلچسپی اور سرگرم وابستگی کے باوجود شعری لطافتوں اور جمالیات ذکاوتوں کو واقعیت میں شعاری پر قربان نہیں کیا ہے۔ انہوں نے شعری حسن کو برقرار رکھتے ہوئے عصری زندگی کے بصیرت کو پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شعری لہجے میں تند و تختی اور برہمی و بیزاری نہیں ملتی زندگی سے الفت و مسائل حیات سے رغبت کا میلان ملتا ہے''

(بہار کی اردو شاعری پر ترقی پسند تحریک کا اثر' ڈاکٹر شمس الضحی شمس جالوی' ص110)

کسی بھی شاعر کی شاعری اس کی ذاتی زندگی سے متاثر ضرور ہوتی ہے۔ منظر شہاب کی زندگی میں جو حادثات واقع ہوئے انہوں نے انہیں ''خون چکا قصہ مرا'' میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے دیکھیے یہ تراشہ:

''ان حادثات میں میری روح میں زہر گھول دیا۔ اعتبارات کی دنیا پارہ پارہ ہوگئی اور میں کٹی پتنگ کی طرح فلک میں بے سمت ڈولتا رہا مایوس'' تنگ دل' بیزار'' (خون چکا قصہ میرا)۔

منظر شہاب کی شاعری میں رجائیت ہے قنوطیت نہیں۔ رجائیت بھی برائے نام نہیں ہے۔ ان کی شاعری میں امید کی جو کرنیں نظر آتی ہیں وہ خیالی یا مصنوعی نہیں بلکہ ان کے اپنے

احساسات سے پھوٹتی ہیں۔ایسا نہیں کہ یہ یاسیت بالکل ان کی شاعری میں نہیں کیونکہ وہ بھی انسان ہیں انسانیت کے جذبے سے معمور ہیں۔انہیں بھی غم ہوتا ہے' غصہ آتا ہے۔درد ہوتا ہے نا امیدی ہوتی ہے مگر انہوں نے اس یاسیت کو اپنی رجائیت پر غالب آنے نہیں دیا دیکھیے یہ اقتباس:

"منظر شہاب تہذیب فن کے شاعر ہیں یہ بات زور دے کر اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اج کی شاعری میں خوش کلامی کا عنصر انق ہو چکا ہے اور زبان و بیان کے حسن کو روایتی ذہن کی علامت سمجھ کر یہ نظر تحقیر دیکھا جا رہا ہے،منظر شہاب زندگی کی تلخ حقیقتوں کے اظہار کے لیے بھی شیری بیانی کو ضروری سمجھتے ہیں''

(مضمون جب شاعر کہے پیراہن جاں چاک رہے تیز ہوا میں"

مشمولہ تمثیل نو دربھنگہ ڈاکٹر امام اعظم' جولائی 2018 تا جون 2019 شمار 70 سے 73)

اس سلسلے کے منظر شاہ صاحب کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

زیست گلزار صحیح درد کا صحرا بھی تو ہے

اس زیر سے لگا آپ کا دریا بھی تو ہے

روز اور شب ظلم کے پنجوں پہ سسکتے ہوئے

دل بے زار کا کچھ اور تقاضا بھی تو ہے

تقسیم کا سانحہ اور اسے اس سے پیدا شدہ حالات یعنی فرقہ وارانہ فسادات' تشدد پسندی کی بنیاد پر معاشرے کو تقسیم کر کے سیاستدانوں نے فائدہ اٹھایا اور اپنے مسائل حل کیے سماج کو کیا نقصان ہوا اس سے ان سیاست دانوں کو کوئی دلچسپی نہیں۔لیکن شاعر کا ہنر اور فن نے اسے اتنا حساس بنا دیتا ہے کہ آس پاس ہونے والے واقعات سبحان جان رہ ہی نہیں جا سکتا یہ سیاستدان جو نسلی مذہبی اختلافات کو ہوا دے کر سماج کے ماحول میں نفرت کی گندگی پھیلاتے ہیں اس سے منظر شہاب کو انسانی قدروں کا پاس تھا وہ سمجھتے تھے کہ اس نفرت عداوت تنگ نظری کے خلاف محاذ قائم کرنا لازمی ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں اس بات کا اظہار خیال بھی کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ منظر شہاب ایک حساس اور انسانی قدروں کی پامالی پر افسردہ رہنے والے انسان تھے۔عشق اور معاملات عشق کا تصور جو منظر شہاب صاحب کے یہاں ہے اس روایتی نہیں کہا جا سکتا بلکہ ان کا محبوب اج کا محبوب ہے اسے اج کے سماجی پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے عشقیہ شاعری تجربے کی بنا پر کی ہے ہوائی کللے نہیں باندھے ہیں۔اشعار ملاحظہ کریں ۔

شیشہ تھا دل وہ ٹوٹ گیا پھر بھی بار بار
تم کیوں یہ کہہ رہے ہو تمہاری خطا نہیں
اللہ رے جسم یار کی خوبی کے خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیراہن تمام
فریب کار سہی دل کا غمگسار تو تھا
وہ ایک خیال جو برسوں رہا گماں کی طرح
وہ بے زبان تکلم و بے صدا ترسیل
خاموش رہ کے بھی سب کچھ کہا کہا سا ہے

شاعری کے فن پر انہیں دسترس حاصل ہے انہوں نے جو بھی لکھا خواہ وہ غزلیں ہوں نظمیں ہوں قطعات ہوں یا دوسری اصناف ہمیشہ فن کا پاس رکھا ہے فنک مجروہونے نہیں دیا ہے جبکہ وہ دور ایسا تھا جب فن میں طرح طرح کے تجربے ہو رہے تھے نئ نئ اصناف کے موجد بننے کی دوڑ مچی ہوئی تھی مگر منظر شہاب نے جس سن پر طبع از مائی کی اسے اس کی اصل حیت میں تجربہ نہیں کیا فن کے سلسلے میں ان کا خیال ملاحظہ کریں ۔

مطلوب ہو کر شاہد معنی کی تجلّی
الفاظ کی صدرنگ قبا چاہیے یاروں
شاداب نہیں رود سے ہے گلزار ادب بھی
پھولوں کو تر و تازہ ہوا چاہیے یاروں

منظر شہاب کی شاعری کا خمیر حقیقت شعاری اور شاعرانہ فن کے خمیر سے تیار ہوا ہے جس نے منظر شاہب کو شناخت دلائی زندگی کی حقیقتوں کا جس خوش اخلاقی سے وہ منظر کشی کرتے ہیں اور جس انداز سے ناکامیوں کا ردعمل پیش کرتے ہیں اس کا ثانی نہیں ۔ان کی غزلیہ اور نظمیہ دونوں شاعری میں یہ رنگ دیکھنے کو ملتا ہے اور یہی ان کی شاعری کا اختصاص ہے۔

ناولٹ: ایک مختصر تعارف

شبانہ پروین

ریسرچ اسکالر، کولہان یونیورسٹی، چائباسہ

اردو میں ناول کا فن انگریزی ادب کی دین ہے۔ ناولٹ بھی انگریزی لفظ ہے جس کے معنی مختصر ناول کے ہیں۔ انگریزی کا لفظ Novel لاطینی لفظ Novella سے لیا گیا ہے۔ اس لفظ Novella کی اساس پر انگریزی لفظ (Novelette) کی بنیاد پڑی چودہویں اور سولہویں صدی میں اٹلی میں ناول لکھے جا رہے تھے۔ اس حد کے ایک مشہور ادیب Giovanni Baccacio جیوانی بکاشو تھے جن کے قصوں کو Novella سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ناویلا کے سلسلے میں J.A.Guddon لکھتے ہیں:

''ناویلا بنیادی طور پر از قسم مختصر افسانہ ہے یہ نصر میں گویا رزمیہ داستان ہے جو بوکاشو Baccaecio کے ذریعے اپنی ارتقائی منزل تک پہنچی''

بکاشو ایک مجموعہ ڈا کامران Decameron کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں چھوٹے چھوٹے قصے تھے۔ ان قصوں کو افسانوی ادب کا ارتقا تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ 18 ویں صدی تک ناویلا کے لیے کوئی اصول یا ضوابط متعین نہیں ہوئے تھے لیکن 18 ویں صدی کے اواخر اور 19 ویں صدی کے اوائل میں نابلا ایک مخصوص فارم میں لکھا جانے لگا۔ یہ ہیت دوسرے مما لک کی بنسبت جرمنی میں زیادہ مقبول ہوئی۔ انا ویلا میں پیش کی گئی زندگی میں حقیقت پسندی تو کم تھی البتہ تصنع اور تخیل کی امیزش زیادہ نظر اتی ہے۔ اکثر ہیروں کی دلیری، کامرانی اور شجاعت کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ تو طے ہے کہ سب سے پہلے ناویلا کی روایت اٹلی سے ملتی ہے لیکن وقت کے ساتھ نابلہ میں بدلاؤ شروع ہوئے اور یہ فارم جرمنی، فرانس، امریکہ، انگلینڈ اور روس میں ترقی پا تا رہا۔ انسائیکلو پیڈیا اف برٹانیکا کے مطابق:

''اطالوی لفظ (Novella) جس کے معنی روایتی کہانی کے برعکس
صرف انفرادیت کی حامل تخلیق کے نہیں بلکہ کم از کم موجودہ واقعات و حالات
کو بھی پیش کرنے کا فریب دیتی ہے۔ یعنی روزمرہ کے حالات زندگی کی

تشریح کرنے کا بھی فریب دیتی ہے۔جب یہ لفظ انگریزی زبان میں منتقل ہوا تو اس نے کسی حد تک اپنا دہراپن قائم رکھا۔18ویں صدی قبل جب ناول کے موجودہ معنی وتصور باقاعدہ تسلیم کر لیے گئے تو انگریزی زبان میں منتقل (جگہ پانے)ہونے کے باوجود اس کا پرانا دہراپن بااعتبار اس کی تعریف قائم رہا-1

لفظ ناول ناول سے ہی اخز کیا گیا ہے اور یہ نام ایسے ناولوں کو دیا گیا جو چھوٹے کینواز پر محیط تھے۔جبکہ ادب میں ناولٹ کے نام سے کسی صنف کا تذکرہ نہیں ملتا۔ان سائیکلو پیڈیا اف برٹانیکا میں بھی ناول پر تذکرہ ملتا ہے لیکن کا الگ سے کوئی ذکر نہیں ہے۔دیکھیے یہ اقتباس:

"اس (ناول) کے علاوہ بھی طبع زاد نثر کی دو صنفیں اور ہیں مختصر کہانی جو تقریبا 50 صفحے تک زخیم ہو۔اور زیادہ زخامت والی قسم جو مختصر کہانی (افسانہ) اور ناول کے درمیانی حیثیت رکھتی ہے۔جس کے لیے انگریزی زبان میں پیڈول طویل مختصر افسانہ کے علاوہ یا کر یہہ اواز پیدا کرنے والے کم حیثیت لفظ ناولٹ کے علاوہ کوئی اصطلاح نہیں ہے اور اس لیے فرانسیسی لفظ Nouvell بھی استعمال ہوتا ہے۔یہ چیز بہر حال یاد رکھنی چاہیے کہ اطالوی لفظ Novella اور جرمن اصطلاح Nouvella بھی اسی ضمن میں مستعمل ہیں جنہیں ہم مختصر افسانے کہتے ہیں"-2

لیکن ناولٹ کے متعلق اب تک جتنی تعریفیں سامنے ائی ہیں وہ پوری طرح سے اعتماد کے لائق نہیں ہیں۔ناول اگر چھوٹے کینواز پر محیط ہو تو اسے طویل افسانہ کیوں نہ کہا جائے۔کیا ان دو اصناف کے لیے ایک ہی اصطلاح قبول کر لی جائے۔کیا کسی صنف ادب کو زخامت کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے؟ یا ناولیٹ کی تعریف میں یہ کہہ دینا کہ ناویلٹ ایک طویل افسانہ یا مختصر ناول ہے جو 20 ہزار الفاظ پر محیط ہے، کافی ہوگا؟ ان سوالوں کے جواب اگر ناقدین نے دینے کی کوشش کی ہے تو وہ نامکمل ہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے ناول بھی ہیں جو کئی کئی جلدوں میں ہیں اور کئی ایسے بھی ناول ہیں جو درمیانی یا مختصر ہیں۔اس لیے ناویلڈ کی تعریف میں یہ جواز بہت کارامد نہیں ثابت ہو سکتا بلکہ ان سائیکلو پیڈیا کا نظریہ کہ نسا تا الثانیۃ سے قبل ایک مخصوص رجحان ومیلان کے تحت ناولٹ ناویلا اور ناویل کی شکل میں پروان چڑھا اور ناویل کے وجود میں ا جانے کے بعد اس کا رواج معدوم ہو گیا۔یعنی ناولٹ،ناول ہی کی ایک شکل ہے۔ناول پر ابتدائی زمانے میں رومانس،ناویلا،اور نہ ملے کے اثرات بہت گہرے رہے لیکن

وقت کے ساتھ اس میں تجربے ہوتے رہے اور ناول کا فن اور نکھرتا گیا۔ جیسے جیسے سماج میں تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں ویسے ویسے ناول کے فن ساخت اور مقصد پر ان کا ردعمل بالواسطہ یا بلاواسطہ پڑھتا رہا۔ کیونکہ ابتدائی زمانے میں جاگیردارانہ نظام کی عکاسی کرنے والا نوبل دھیرے دھیرے مختلف تحریکات اور انقلابات کو اپنے اندر جذب کرتا گیا۔ یعنی یہ کہ انسانی علوم اور انسانی شعور کے ساتھ ساتھ ناول بھی ارتقا کی منزل پر گامزن ہوا۔ جدید تکنیک اور تجربوں نے اسے بین الاقوامی سطح پر مقبول کر دیا اور اس میں ہو رہے نت نئے تجربوں سے سخت، ہیت اور مواد کا تیور بھی بدلتا گیا۔ نتیجتاً اس میں سے نئے نئے چشمے نکلنے لگے۔ اسی تجربے کا ایک نتیجہ Novellette، اسمال ناول، شارٹ ناول یا منی ناول ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی بھی اسی خیال سے متفق ہیں:

"ارتقا کی روایت اس کے فن میں موجود ہے تنوع، رنگا رنگی اور بوقلمونی سے اس کا وجود عبارت ہے تجربہ اس کے پن کی گھٹی میں پڑا ہے۔ اس لیے ناول کے فن میں نئی نئی شاخوں کا پھٹنا ایسی کوئی عجیب بات نہیں۔ ناول بھی ناول کی ایک شاخ ہے" 3

اس اقتباس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ناولٹ، ناول کفن کے ارتقا کی ایک منزل ہے۔ ناول کے ابتدائی نقوش کا جائز لینے کے بعد یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ناولٹ کا وجود ناول سے پہلے ہی مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے تھا۔ لیکن اس صنف کی حیثیت سے صنعتی انقلاب کے بعد ایک مخصوص فارم یا ہیت میں متعارف ہوا۔ اس کے باوجود اس سوال کا جواب گنجلک رہ جاتا ہے کہ ناول اور ناولٹ میں بنیادی فرق کیا ہے۔ کیونکہ مغربی ادب میں بھی ناولٹ سے متعلق جو بحث ہوئی ہیں اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ناولٹ، ناول اور طویل افسانے کی بیچ کی ایک کڑی ہے۔ کیونکہ اج کے اس دور میں نا تو قاری کو اتنی فرصت ہے کہ وہ ذخیم نال پڑھ سکے اور نہ ناول نگار ہی کوئی اتنی فرصت ہے کہ وہ زخیم اور کئی کئی جلدوں پر محیط ناول لکھے۔ اس لیے جب ناول نگار چھوٹے کینوس پر محدود کرداروں کی مدد سے زندگی کے کسی ایک گوشے کو اجاگر کرتا ہے تو اسے ناول نہیں بلکہ ناولٹ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ انے والے عہد میں ناولیٹ کو ایک علیحدہ صنف قرار دیا جائے گا۔

حواشی:

1-انسائیکلو آف برٹانیکا، جلد: 16، صفحہ: 673

2-ایضاً، 674

3-ڈاکٹر عبادت بریلوی: ناولٹ کی تکنیک مشمولہ نقوش لاہور، شمارہ 19-20- ص 205

رضوان واسطی کا اسلوبِ نگارش: ایک جائزہ

محمد نیر الحق

ریسرچ اسکالر، کولہان یونیورسٹی، چائباسہ

اردو شاعری کی دنیا میں جناب سید رضوان الحق، رضوان واسطی کا نام ایک پُر وقار اور مہذب شخصیت کی حامل ہے، جن کو جن لوگوں نے جانا، ان کی شاعری اور ان کی قلم کاری دونوں کو مانا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں اپنے عہد کے تمام سیاسی، مذہبی، ثقافتی اور شعری رجحان کو برتا ہے۔ ان کی شاعری میں سوز و گداز اور لفظوں کو برتنے کا سلیقہ بہت عمدہ ہے جن کے مطالعے سے قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ ان کی دلی کیفیت ہے یا شاعری۔

آپ کا پورا نام سید رضوان الحق ہے۔ ۱۰/جون ۱۹۴۶ء کو جھارکھنڈ کے شہر جمشید پور میں پیدا ہوئے۔ آپ اردو، فارسی اور انگریزی ادبیات کے عالم ہیں۔ ادبیات کے موضوع پر آپ کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں آٹوگراف، سچ (اردو، ہندی) اور ان کے علاوہ کئی کتابیں زیرِ طبع ہیں۔ صغر سنی میں ہی والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ آپ کے والد مرحوم سید افضال الحق عالمِ دین، شاعر اور حکیم تھے۔ باوجود اس کے آپ نے ایم اے، بی ایڈ کی تعلیم مکمل کیا اور پیشہ کے لئے درس و تدریس اختیار کیا۔ آپ کی شاعری نعتیہ ہو یا غزلیہ، نظمیہ ہو یا رزمیہ زبان و ادب کا حسین مرقع ہے اور دنیائے شعر و ادب میں شاہ ہفت اقلیم کی حیثیت رکھتا ہے۔ مضامین کی ندرت، افکار کی نزاکت، خیالات کی بلند پروازی، محاورات اور ضرب الامثال کے برمحل استعمال کا اسلوب حاضر خدمت ہے۔

الفاظ واصوات: شعر و سخن میں الفاظ و اصوات کو ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ہمارے افکار و نظریات، تخیلات و تصورات، جذبات و احساسات کے پرتو، الفاظ و اصوات کی شکل میں اجاگر ہوتے ہیں اور ان کی تصویر کشی الفاظ کے پیکروں سے ہوتی ہے۔ یہ الفاظ جس قدر موزوں اور مناسب ہوں گے اس کے اثرات اتنے ہی دیرپا اور پُر رونق ہوں گے۔ فکر و شعور میں جدت و ندرت کی زیادتی الفاظ و اصوات سے ہوتی ہے۔ رضوان واسطی کے ایک نعتیہ کلام کا اسلوب ملاحظہ کریں، جس میں اس کے حسن و زیبائی کے ساتھ ساتھ موزوں الفاظ و اصوات کی

معنویت کا پتہ چلتا ہے اور الفاظ میں خلوص کی گیرائی و گہرائی کا ایک جذبہ حقیقت میں قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔

زمانے بھر کے غموں کا شمار کیا کرنا
ہر ایک غم کا مداوا ملے مدینے سے
ہے خاکِ پائے نبی جو وہی خاکِ شفا
ہر اک مرض کی دوا ملے مدینے سے
ہرایک قدم پہ اندھیرا سہی مگر رضواں
ملی ہے اور ملے گی ضیاء مدینے سے

(آٹوگراف، صفحہ ۲۸)

مذکورہ اشعار کی موزونیت اور حسن ولطافت فنی، ادبی اور لسانی اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ اپنی معصیت پر جب خدائے ذوالجلال کے سامنے گریاں ہوئے ہیں تو آقائے دوعالم، رحمتِ عالم، حضرت محمد عربی ﷺ کو وسیلہ بناتے ہیں۔ اس موقع پر الفاظ گریاں کا استعمال کس مناسب انداز سے فرمایا ہے۔

ہم خطاکار ہیں، ہم گنہگار ہیں، راہ سے تیرے بھٹکے ہوئے ہیں
تیرا رضواں تیرے ہی غلاموں میں ہے ہو نگاہِ کرم کا اشارہ نبی

(آٹوگراف، صفحہ ۲۷)

زبان کی سلاست و بے ساختگی: فن شاعری میں زبان کی سلاست و بے ساختگی بھی جزولاینفک کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ اس فن کی رونق اور تابنا کی کو دوبالا کر دیتی ہے اور یہ سلاست سنجیدہ لہجہ، مخارج کی سہولت، حسن ورونق کی موجودگی، الفاظ کے حسن انتخاب، آمد طبیعت کی فراوانی اور لطافت ترکیب سے پیدا ہوسکتی ہے۔ رضوان واسطی کا کلام سلاست بیان اور لطافت زبان کا آئینہ دار ہے۔ چند اشعار ضیافت طبع کے لئے حاضر خدمت ہیں۔

شباب پر تھی تیرے انتظار کی آہٹ
دھڑک کے رہ گئی زینوں پہ پیار کی آہٹ
کہیں پہ جوالہ مکھی پھوٹنے کو ہے بیتاب
زمیں کی تہہ میں ہے کیوں انتشار کی آہٹ
کھلے دریچے رہے بے قرار آنکھوں کے
مگر نہ کانوں میں گونجی قرار کی آہٹ
گلاب، گیہوں، چنا کھڑے ہیں کیوں خاموش؟

کہیں سنائی تو دیتی ہے بہار کی آہٹ
تمہاری یاد دبے پاؤں آتی ہے رضواں
کوئی شکاری لے جیسے شکار کی آہٹ
(آٹوگراف،صفحہ ۲۷)

احســـــاس وادراک : شعروسخن میں احساس وادراک کوایک بلند مقام حاصل ہے۔کسی واقعہ یا حادثہ جانکاہ کی طرح شعروسخن بھی احساسات کو برانگیختہ کرنے اور شریانوں میں بیداری پیدا کرنے میں پیچھے نہیں۔ایک باکمال اور قادرالکلام شاعر اپنی شعروشاعری کے ذریعہ انسان کے خوابیدہ جذبات کے اندر ایسی صورتیں پیدا کر دیتا ہے جس سے عقل وخرد کے بند دروازے واہو جاتے ہیں۔

رضوان واسطی کے کلام میں بھی احساس وادراک پایا جاتا ہے۔اوراس کی دھمک دور سے ہی محسوس ہوتی کی جاتی ہے۔

اشک بن کر آسماں پر آنکھ کے چھا جاؤ گے
جب کوئی ٹوٹے کا تارہ تم بہت یاد آؤ گے
جب کبھی ساون کی شب میں گونجے گی کوئل کی کوک
تم نہ ہوگے دور رہ کر بھی بہت تڑپاؤ گے
کوئی سننا نہیں چاہے گا دل کی داستاں
اپنی ہی آواز کے پتھر سے ٹکراجاؤ گے
ذہن خوابیدہ مگر رضواںؔ سکوں دشوار ہے
موت کی آغوش میں اس طرح تم سوجاؤ گے
(سچ،صفحہ ۸۲)

اثــر انگیــزی: شاعری اور شعروسخن کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ جہاں اشعار میں جذبات، احساسات اور ادراکات کی تراکیب کی دل کشی ،لفظوں کی برمحل ساخت، علائم اور اسرار کا جمال، جملوں کا بانکپن اپنی جگہ اٹل ہیں لیکن اگر اس کے اندر قوت تاثیر نہیں تو کچھ نہیں۔ اس کے برعکس اگر ان میں توانائی کی تاثیر ہے تو اس کی عمدگی میں چار چاند لگ جاتا ہے۔ وہ نظم برائے ادب نہ رہ کر زندگی کی ایک نرالی مثال بن جاتی ہے۔ رضوان واسطی کی شاعری میں اثر وتاثیر کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جیسا کہ آپ رقم طراز ہیں:

میری باتیں ہیں قیمتی پھر بھی
کان کوئی دھرے دھرے نہ دھرے

جام آنکھوں سے بس پلاتے رہیں
پیاس کا کیا مرے مرے نہ مرے
زندگی کا جوا ہے کھیل تو لیں
چال ساری ہرے ہرے نہ ہرے
اشک پی کر ہی جی لیے رضواں
کوئی جھرنا جھرے جھرے نہ جھرے
(آٹوگراف،صفحہ ۲۷)

بہر کیف رضوان واسطی کے یہاں مختلف انداز واطوار پائے جاتے ہیں جن سے کام لے کر انہوں نے شاعری میں ایک نیا جہاں تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات: (۱) ساغرِ جم جامِ سفار، مصنف: اسلم بدر
(۲) آٹوگراف
(۳) سچ (اردو)

Md. Naiyarul Haque
Research Scholar
Kolhan University
Chaibasa(Jharkhand)

ڈاکٹر وفا نقوی کے

افسانوی مجموعے "موم کی لڑکی" کا تنقیدی جائزہ

محمد نور الہدی

ڈاکٹر سید بصیر الحسن وفا نقوی اردو ادب کے ایک اہم افسانہ نگار، شاعر، اور نقاد ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقات سے اردو ادب کو نئی جہت عطا کی ہے۔ ابھی حال ہی میں ان کا افسانوی مجموعہ بعنوان "موم کی لڑکی" منظر عام پر آیا ہے۔ ان کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ لینے پر یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ اس افسانوی مجموعے میں مختلف موضوعات، فنی خصوصیات کے حامل افسانے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ڈاکٹر وفا نقوی کے افسانوں میں سماجی، نفسیاتی، اور فلسفیانہ موضوعات نمایاں ہیں۔ ان کی کہانیاں اکثر انسانی زندگی کے تضادات، سماجی ناہمواریوں، اور انفرادی وجود کے بحران کو موضوع بناتی ہیں۔ وہ معاشرے کے اندر چھپے ہوئے مسائل جیسے طبقاتی تفاوت، جنسیت، اور روایتی اقدار کے زوال کو باریک بینی سے اجاگر کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ایک گہرا سماجی شعور نظر آتا ہے جو قاری کو محض کہانی سے لطف اندوز ہونے کے بجائے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

مثال کے طور پر، ان کے افسانوں میں عورت کے سماجی کردار، اس کی نفسیاتی کشمکش، اور مردانہ معاشرے میں اس کی جدوجہد کو کئی زاویوں سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ، وہ جدیدیت اور روایت کے درمیان پل باندھنے کی کوشش کرتے ہیں، جو ان کے افسانوں کو ایک منفرد مقام دیتا ہے۔

وفا نقوی کا اسلوب سادہ مگر گہرا ہے۔ وہ پیچیدہ فلسفیانہ خیالات کو عام فہم زبان میں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی زبان میں شاعرانہ رنگ جھلکتا ہے جو ان کے شعری پس منظر کی

عکاسی کرتا ہے۔ جملوں کی ساخت مختصر لیکن معنی خیز ہوتی ہے، اور وہ علامتوں اور استعاروں کا خوبصورت استعمال کرتے ہیں۔ ان کا اندازِ بیان ایما پر مبنی ہوتا ہے، یعنی وہ کہانی کو براہِ راست بیان کرنے کے بجائے قاری کو خود نتیجہ اخذ کرنے کی طرف راغب کرتے ہیں۔

ان کے افسانوں میں مکالموں کا استعمال کم لیکن موثر ہوتا ہے، جو کرداروں کی اندرونی کیفیت کو ظاہر کرنے میں مدد دیتا ہے۔ زبان کی یہ سادگی اور گہرائی ان کے افسانوں کو عام قاری سے لے کر ادبی ذوق رکھنے والوں تک سب کے لیے قابلِ فہم بناتی ہے۔

ان کے افسانوں کے کردار عام انسانوں سے لیے گئے ہیں، لیکن ان کی نفسیاتی گہرائی اور سماجی تناظر انہیں خاص بناتا ہے۔ وہ زیادہ تر متوسط یا نچلے طبقے کے کرداروں کو پیش کرتے ہیں، جن کی زندگی روزمرہ کے مسائل اور اندرونی جدوجہد سے عبارت ہوتی ہے۔ ان کی کردار نگاری میں حقیقت پسندی اور تخیل کا امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ کرداروں کے ذریعے وہ سماج کے مختلف رویوں اور رجحانات کو بے نقاب کرتے ہیں۔

مثلاً، ان کے افسانوں میں عورتیں اکثر مرکزی کردار ہوتی ہیں جو سماجی دباؤ کا شکار ہوتی ہیں، لیکن ان کی اندرونی طاقت اور مزاحمت کو بھی اجاگر کیا جاتا ہے۔ مرد کردار بھی ان کے افسانوں میں اہم ہیں، جو اکثر اپنی کمزوریوں اور سماجی مجبوریوں کے ہاتھوں مغلوب دکھائی دیتے ہیں۔

وفا نقوی کے افسانوں میں علامتیت کا استعمال ان کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ روزمرہ کی اشیا، ماحول، یا حالات کو علامت کے طور پر استعمال کر کے گہرے معنی پیدا کرتے ہیں۔ یہ علامتیں کہانی کو صرف واقعاتی سطح سے بلند کر کے ایک فلسفیانہ یا سماجی تنقید کی سطح پر لے جاتی ہیں۔

فنی طور پر ان کے افسانے پختہ اور منظّم ہیں۔ کہانی کا آغاز، وسط، اور اختتام ایک تسلسل کے ساتھ ترتیب دیا جاتا ہے، لیکن اختتام اکثر کھلا چھوڑا جاتا ہے تاکہ قاری خود اسے مکمل کرے۔ یہ تکنیک ان کے افسانوں کو جدیدیت سے قریب کرتی ہے. آیئے مجموعے طور پر اس افسانوی مجموعہ کا سرسری جائزہ لیتے ہیں۔

وفا نقوی کے افسانوں میں متنوع موضوعات ملتے ہیں جو سماجی، نفسیاتی، اور جذباتی مسائل کو چھوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے عنوانات ہی ان کی گہرائی اور تنوع کی طرف

اشارہ کرتے ہیں۔''جنگل راج واپس دو''، ''یہ ہماری بستی ہے''، اور ''ڈھونگی بالا'' جیسے افسانوں میں سماج کے انتشار، مذہبی منافقت، اور معاشرتی زوال کو موضوع بنایا گیا ہے۔''پریم لیتا''، ''آئی لو یو''، ''فاصلے''، اور ''چائے'' جیسے افسانوں میں محبت، جدائی، اور رشتوں کی نزاکت کو پیش کیا گیا ہے۔ ''موم کی لڑکی''، ''آنکھیں''، ''سفید داغ''، اور ''اولڈ ایج ہوم'' میں انفرادی شناخت، تنہائی، اور بڑھاپے کے مسائل کو گہرائی سے دیکھا گیا ہے۔ ''بارش''، ''شرابی''، اور ''رفیق کا مپلیکس'' جیسے افسانوں میں علامتی انداز سے زندگی کے پیچیدہ پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔

وفا نقوی کا اسلوب ان کے تمام افسانوں میں یکساں طور پر شاعرانہ اور علامتی ہے۔ وہ سادہ زبان میں گہرے خیالات کو سمیٹتے ہیں، جس سے ان کی کہانیاں عام فہم اور ادبی دونوں سطحوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں مکالموں کا استعمال کم ہوتا ہے، اور وہ زیادہ تر بیاناتی انداز میں کرداروں کی اندرونی کیفیت اور ماحول کو پیش کرتے ہیں۔ عنوانات جیسے ''چائے'' یا ''بارش'' روزمرہ کی چیزوں کو علامت بنا کر کہانی کو فلسفیانہ رنگ دیتے ہیں۔

ان کے افسانوں کے کردار عام زندگی سے لیے گئے ہیں لیکن ان کی نفسیاتی پیچیدگی انہیں خاص بناتی ہے۔ مثال کے طور پر: ''موم کی لڑکی'' میں ایک بوڑھی عورت سماجی دباؤ اور کمزوری کی علامت ہے۔

''شرابی'' میں ایک شرابی کردار کے ذریعے سماجی اور اس کے انفرادی زوال کو دکھایا گیا ہوگا۔

''اولڈ ایج ہوم'' میں بڑھاپے کی تنہائی اور بے کسی کو اجاگر کیا گیا ہے۔

ان کے کردار اکثر سماج کے پسماندہ یا نظرانداز طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے لمحات کو گہرائی سے پیش کیا جاتا ہے۔

الغرض وفا نقوی کے یہ افسانے اردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی تخلیقات سماجی شعور، جذباتی گہرائی، اور علامتی خوبصورتی کا حسین امتزاج ہیں۔ ہر افسانہ اپنے اندر ایک الگ دنیا رکھتا ہے جو قاری کو سوچنے اور محسوس کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

نیا سوٹ (انشائیہ)

ایس معشوق احمد

کیلم، کولگام، کشمیر، 8493981240

مرزا کا یہ قول آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ کیا خوب فرماتے ہیں کہ محنت کا کوئی بھی پیشہ مقدس ہوتا ہے لیکن جب حلال میں حرام مل جائے تو آرام میں خلل پڑتا ہے۔ صاحبو میں کسی پیشے کو بدنام نہیں کروں گا لیکن جن جھوٹوں نے بدنامی کو اپنا مقدر بنا رکھا ہے وہ میری ہزار کوشش کے باوجود بھی نیک نام نہیں ہوں گے۔ کچھ پیشہ ور ایسے ہیں جو کبھی ایمانداری کا مظاہرہ نہیں کرتے اور نہ اپنے قول کا پاس رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے عادات سے ثابت کیا ہے کہ وعدہ خلافی، دھوکہ بازی, جھانسے بازی اور فریب کاری کے بغیر ان کے کئے کام پورے نہیں ہوں گے۔ وہ اپنا کام کرنے میں دیر نہیں کرتے بلکہ دیر ان سے ہو جاتی ہے۔ ان میں ٹیلر ماسٹر بھی ایک ہے۔ آپ کے ذہن میں یہ سوال گردش کر رہا ہوگا کہ ٹیلر سے نیا سوٹ کا رشتہ کیسا۔۔۔۔ صاحبو !حقیقت یہ ہے کہ نیا سوٹ پہنا عورت کی ضرورت اور مرد کی مجبوری ہے۔ مجبور ہو کر ہم نے بھی نیا سوٹ خرید لیا اور بنوانے کے لئے کسی ماہر ٹیلر ماسٹر کی جانچ شروع کر دی۔ نیا سوٹ خریدنے کی نوبت کیوں کر آئی پہلے یہ سن لیجیے۔ عید آئے تو چاروں طرف ہی عید ہوتی ہے اور لوگ عید کی تیاریوں میں عید سے قبل ہی مصروف ہوتے ہیں۔ خوشیاں آس پاس ہوں تو خرید و فروخت میں اضافہ ہونا فطری ہے۔ جب آس پڑوس کے لوگ خریداری میں مصروف ہوں تو ہم جیسے قناعت پسند بھی کچھ فروخت کر کے کچھ خرید لیتے ہیں۔ جب یہ جان لیا کہ دو ماہ بعد عید ہوگی تو بڑے چاؤ سے ہم نے بھی ایک نیا کرتہ مع پائجامہ خریدا اور ایسے ٹیلر ماسٹر کی تلاش شروع کر دی جو اپنے کام میں یکتا اور ماہر ہو۔ سنا ہے کہ کپڑا اگر معمولی بھی ہو اور ٹیلر ماسٹر اچھا کاریگر ہوا تو ایسا سوٹ سی دیتا ہے کہ پہننے والا بادشاہ سے کم خوبصورت دکھائی نہیں دیتا۔ کسی کے بارے میں سنتے ہیں کہ وہ شاندار سوٹ سی لیتے ہیں تو کسی نے اپنی مہارت کی مہر ان کپڑوں پر ثبت کی ہے جو خاتون اور مرد حضرات نے پہن رکھے ہیں۔ ہمیں جب دس پندرہ ماہرین کا پتہ دستیاب ہوا تو فیصلہ کرنا مشکل

ہوا کہ اپنا نیا سوٹ کس کے پاس لے جائے۔قرعہ اندازی سے فیصلہ کیا،جن کا نام آیا سیدھے ان کے پاس یہ درخواست لے کر گئے کہ صاحب یہ نیا سوٹ ہے اس کو اس مہارت سے سی لیجیے کہ عید کے روز ہم دلہے لگے۔ٹیلر نے پہلے اپنی مہارت اور ہنرمندی کی داستان سنائی، پھر اپنے گاہکوں میں سے ان بڑے آدمیوں کا ذکر چھیڑا جو ان کے یہاں آتے جاتے ہیں۔ایک دو گھنٹے تک اپنی فتح مندی، ہنرمندی، مہارت اور کارناموں کے مشہور قصے سنانے کے بعد ہم پر ان کا جو رعب اور دبدبہ قائم ہوا اس سے ہمارے حواس جاتے رہے لیکن یہ یاد رہا کہ انہوں نے اسی بدحواسی میں ہمارا ماپ لینا شروع کیا تھا۔سر سے ٹخنوں تک اور بازو سے لے کر کندھے تک، کمزور چھاتی سے لے کر لٹکتے پیٹ تک جب سب کچھ ماپ لیا تو اپنے مونچھوں پر تاؤ دے کر فرمایا میاں چار روز کے بعد آنا اور اپنا سلا ہوا نیا سوٹ لے جانا۔مرزا کہتے ہیں ٹیلر، پبلشر، لیڈر اور قرض دار کا کبھی بھروسہ نہ کرنا۔یہ اپنے مقرر وقت پر کوئی کام نہیں کرتے اور نہ اپنے قول کا پاس رکھتے ہیں۔مرزا کی باتوں پر یقین اور ایمان لاکر ہم خاموش بیٹھے رہے اور ٹیلر کی شاپ کا رخ نہ کیا۔دس روز گزر چکے تو اچانک شوق نے انگڑائی لی کہ ٹیلر شاپ پر آویزاں انواع واقسام اور رنگارنگ کے سوٹوں کا نظارہ کیا جائے تاکہ دل بہل جائے سو اس نیت سے ٹیلر شاپ کے دیدار کو گئے۔ٹیلر کی نظر ہم پر پڑی تو دور سے آواز لگائی کہ کل آپ کا کام پکا ہوگا۔دو چار روز بعد پھر سوٹ کی یاد آئی تو نیا بوٹ پیروں میں پہن کر ٹیلر کی دکان سے ایسے گزرے جیسے مرزا غالب محبوب کی گلی جاتے تھے۔حال بھی ویسا ہی ہوا کہ سوٹ تو نہ ملا لیکن فلاں تاریخ کو آنا کی بے عزتی والا جملہ ہمارے ماتھے پر چسپاں کیا گیا سو اس روز بھی بڑے بے آبرو ہو کر ٹیلر کی شاپ سے ہم نکلے۔

ایک ماہ کے بعد آخر کار یہ خوشخبری ٹیلر نے سنائی کہ صاحب آپ کا آدھا کام ہو گیا ہے کل آیئے اور اپنا نیا سوٹ لے جایئے۔اس خوش خبری نے رات بھر سونے نہ دیا۔کروٹ بدل بدل کر نمود سحر کے دیدار کو ایسے ترس رہے تھے جیسے مہنگائی کے دور میں غریب کے بچے کھلونوں کو دیکھ کر ترستے ہیں۔تڑکے ہم ٹیلر کی شاپ پر ایسے انتظار کرنے لگے جیسے مریض سرکاری اسپتالوں میں ڈاکٹر کے منتظر رہتے ہیں۔آخر کار جیسے تیسے ٹیلر آ ہی گیا اور ہمیں اس سوٹ کے دیدار ہوئے جس کی خوبصورتی کو ٹیلر کی ناتجربہ کاری نے لوٹ لیا تھا۔سیانوں سے سنا تھا کہ عید قریب ہو اور کام کا رش بڑھ جائے تو ٹیلر اور مہنگائی بدحواس ہو کر آسمان چھونے لگتی ہے۔آج یہ نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔سفید رنگ کے سوٹ پر لال رنگ کا دھاگا استعمال ہوا تھا۔۔۔۔اس کو دیکھ کر من کی امنگ اور ذہن کی ترنگ ٹھنڈی پڑ گئی،سوٹ پہن کر دلہے جیسا خوبصورت لگنے کا

خواب ادھورا سا رہا، ارمان مہمان بن کر رخصت ہوئے اور نیا سوٹ پہن کر ہمارا حوصلہ جو آسمان کی وسعتوں میں بلند پرواز کرنے کا خواہ تھا ایک دم سے زمین پر آ گرا اور اب زمین پر بھی لنگڑا کر چل رہا تھا۔کیا سوچا تھا اور کیا ہوا۔سوٹ کی حالت دیکھ کر انور مسعود بے تحاشا یاد آئے۔ان کا واسطہ بھی ایسے ہی درزی سے پڑا تھا جو اتنا بدحواس واقعہ ہوا تھا کہ بدحواسی میں اس نے انور صاحب کی قمیص میں نیفا لگا لیا۔فرماتے ہیں۔

بخیہ تو اس سے ایک بھی سیدھا نہیں لگا
آڑا لگا دیا کوئی ترچھا لگا دیا
ٹیلر کی بدحواسیاں مجھ سے نہ پوچھیے
اس نے مری قمیص میں نیفا لگا دیا

مرزا کہتے ہیں کہ ایماندار جنت میں سچے افراد کا سردار ہوگا۔ایک تو جنت میں جانے کی لالچ اوپر سے سچ بولنے کی عادت۔۔اس لئے ہم کبھی جھوٹ کے قریب نہ گئے بلکہ سچ کے دامن کو مضبوط پکڑ لیا، کبھی کسی پر تہمت نہیں لگائی۔ویسے بھی جھوٹ نہیں بولنا چاہیے کہ خدا کے پاس جانا ہے اور وہاں اپنے کئے کا جواب دینا ہے۔یہ حماقت اور جھوٹ ہوگا اگر میں کہوں کہ ٹیلر نے بدحواس ہو کر میری قمیص میں نیفا لگا لیا البتہ جو حقیقت ہے وہ بیان کر رہا ہوں کہ بخیہ اس نے ایک بھی سیدھا نہیں لگایا تھا آڑھی ترچھی لگانے کا سبب ٹیلر سے پوچھ لیا تو فرمانے لگے کہ آج کل کا یہ فیشن ہے۔ایسے فیشن پر خدا کی مار جو شریف اور سیدھے سادے بندے کو خوار کرے۔

ہم اتنے بے شرم اور فیشن پرست واقع نہیں ہوئے ہیں کہ ایسا سوٹ زیب تن کرتے جس کی بخیہ تک سیدھی نہ ہو بلکہ سانپ کی طرح لہراتی اور بل کھاتی ہوں۔مرزا کہتے ہیں کہ میاں خراب سوٹ اور لوٹ کے قریب کبھی نہ جانا عزت میں داغ لگ جائے گا۔اپنی عزت کو بچانے کے لئے ہم داغدار شئے سے دور رہے۔ہم نے نیا سوٹ مجبور ہو کر خریدا ضرور تھا لیکن پہنا نہیں۔بعض نیک بختوں نے مشورہ دیا تھا ٹیلر سے نیا سوٹ لے لو کہ اس نے آپ کا نیا سوٹ خراب کیا ہے۔ہم جھگڑا نہیں کرنا چاہتے اور نہ اب ہمیں نیا سوٹ پہنے کا ارمان ہے سو خاموشی اختیار کئے ہوئے ان لوگوں کو مشورہ دینا ہمارا کام رہ گیا ہے جو نیا سوٹ بنوانے کے خواہش مند ہیں۔نیا سوٹ خرید کر ضرور پہنا چاہیے لیکن نیا سوٹ کسی اناڑی ٹیلر ماسٹر کے حوالے ہرگز نہ کرنا ورنہ اپنا نیا سوٹ خراب ہونے کے بعد جب کسی کو نیا سوٹ پہن کر دیکھو گے تو دل میں ویسا ہی درد ہوگا جیسے سوئی کی چھبن سے ہوتا ہے۔

اردو کالم نگاری میں ٹیکنالوجی اور نئی نسل

سید ساجد پرویز

ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، کولہان یونیورسٹی، چائباسہ، جھارکھنڈ

اردو صحافت کی تاریخ تقریباً ڈیڑھ صدی پر محیط ہے۔ ابتدا میں اردو اخبارات اصلاحِ معاشرہ، سیاسی بیداری اور تعلیمی ترقی کے محرک تھے۔ انہی اخبارات میں کالم نگاری ایک نئی صنف کے طور پر سامنے آئی جو رائے عامہ کی رہنمائی کا ذریعہ بنی۔ کالم نگاری نے وقت کے ساتھ ساتھ نئے موضوعات، نئے اسالیب اور نئے قارئین کو اپنایا۔

اکیسویں صدی میں ٹیکنالوجی نے دنیا کو ایک ''گلوبل ولیج'' بنا دیا ہے۔ اخبارات اور رسائل کے بجائے اب آن لائن پورٹلز، سوشل میڈیا، اور ڈیجیٹل ایپس نے خبر رسانی اور رائے سازی کا میدان سنبھال لیا ہے۔ ان حالات میں یہ سوال اہمیت اختیار کرتا ہے کہ ٹیکنالوجی نے اردو کالم نگاری کو کس طرح متاثر کیا ہے اور نئی نسل اس سے کس حد تک جڑ رہی ہے۔

اردو کالم نگاری کا آغاز بیسویں صدی کے اوائل میں ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، چراغ حسن حسرت، مجید لاہوری، اور بعد ازاں مجید نظامی و عطا الحق قاسمی جیسے نامور کالم نگاروں نے اس صنف کو پہچان دی۔ اس دور میں:

کالم بنیادی طور پر اصلاحی اور ادبی رنگ لیے ہوتے تھے۔

قارئین کو کالم تک رسائی صرف اخبارات یا ماہناموں کے ذریعے ملتی تھی۔

لکھاری اور قاری کے درمیان براہِ راست رابطہ تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا۔

یہ وہ دور تھا جب کالم نگاری کا مطلب تھا گہرے مطالعے کے بعد ایک ایسا مضمون تحریر کرنا جو قارئین پر فکری اثر ڈال سکے۔

ٹیکنالوجی اور اردو کالم نگاری

ٹیکنالوجی نے کالم نگاری کے خدوخال بدل دیے ہیں:

.1 ڈیجیٹل اشاعت: آج کالم صرف کاغذ پر نہیں بلکہ ویب سائٹس، آن لائن جرائد، اور سوشل میڈیا پر بھی شائع ہوتے ہیں۔

.2 فوری رسائی: کسی بھی کالم کی اشاعت کے چند لمحوں میں دنیا بھر کے قارئین تک رسائی ممکن ہے۔

.3 کثیر لسانی امکانات: اردو کالم اب رومن اردو اور ترجمہ جاتی سہولتوں کے ذریعے غیر اردو داں قارئین تک بھی پہنچ رہا ہے۔

.4 کالم کی نئی صورتیں: وی لاگ، پوڈ کاسٹ، اور مختصر ویڈیوز نے کالم کو صرف تحریری صنف تک محدود نہیں رہنے دیا۔

نئی نسل اور کالم نگاری

نئی نسل نے ٹیکنالوجی کو اپنی روزمرہ زندگی کا حصہ بنالیا ہے۔اس تناظر میں:

نوجوان اب اخبارات سے زیادہ موبائل فون اور سوشل میڈیا پر کالم پڑھتے ہیں۔

کالم نگاری کا اسلوب بھی بدل رہا ہے: سادہ زبان، مختصر جملے، اور بصری مواد شامل ہو رہے ہیں۔

نئی نسل کے کئی نوجوان بلاگرز اور آن لائن کالم نگار اب خود بھی اس صنف میں نمایاں ہو رہے ہیں۔

کالم پر فوری فیڈ بیک (likes/ comments) نے نوجوانوں کو اس صنف کی طرف مزید مائل کیا ہے۔

مسائل اور خدشات

ٹیکنالوجی نے جہاں مواقع فراہم کیے ہیں وہیں چند مسائل بھی پیدا کیے ہیں:

.1 غیر مصدقہ معلومات: سوشل میڈیا پر تحقیق کے بغیر مواد پھیلایا جاتا ہے۔

.2 معیاری کمی: مقبولیت حاصل کرنے کے لیے سطحی یا سنسنی خیز موضوعات پر لکھا جاتا ہے۔

.3 تحقیق کی کمی: نئی نسل مطالعہ اور حوالہ جاتی تحقیق سے زیادہ فوری اظہار پر توجہ دیتی ہے۔

.4 ادبی گہرائی کا فقدان: سادہ اور مختصر انداز میں بعض اوقات فکری اور ادبی گہرائی مفقود ہو جاتی ہے۔

امکانات اور مواقع

چیلنجز کے باوجود مواقع کی دنیا کھلی ہے:

عالمی سطح پر اردو زبان کی ترویج ممکن ہے۔

نئی نسل اپنے تحقیقی و تخلیقی کالم کے ذریعے اردو کو ڈیجیٹل دنیا میں نمایاں کر سکتی ہے۔

ڈیجیٹل آرکائیوز کے ذریعے کالم مستقبل کے محققین کے لیے محفوظ کیے جا سکتے ہیں۔

بین الاقوامی جرائد اور بلاگز کے ذریعے اردو کالم کا دائرہ وسیع ہو سکتا ہے۔

اردو کالم نگاری نے ٹیکنالوجی کے دور میں نئی جہتیں اختیار کی ہیں۔ یہ محض اخباری صنف نہیں رہی بلکہ ڈیجیٹل میڈیا کے ذریعے ایک عالمی شناخت حاصل کر رہی ہے۔ نئی نسل اس سفر میں نہ صرف قاری کی حیثیت سے شامل ہے بلکہ بطور لکھاری بھی اپنی شناخت بنا رہی ہے۔ تاہم معیار، تحقیق اور سنجیدگی کو برقرار رکھنا ناگزیر ہے۔ اگر نئی نسل اس پہلو پر توجہ دے تو اردو کالم نگاری نہ صرف زبان و ادب کی ترقی میں اہم کردار ادا کرے گی بلکہ معاشرتی شعور کی تشکیل میں بھی رہنما ثابت ہوگی۔

علامہ اقبالؔ کا نظریۂ فن

ڈاکٹر نثار احمد ڈار۔ پلوامہ کشمیر۔

علامہ اقبال کثیر الجہات، عظیم المرتبت اور آفاق گیر شہرت رکھتے ہیں۔اقبالؔ وہ نابغۂ روزگار ہستی تھی جو صدیوں بعد کرۂ ارض پر ظہور پذیر ہوئی۔اقبال کی شخصیت اپنی آفاقی، الہامی شاعری، علوم شرق وغرب میں وسیع مطالعہ اور دسترس، قوت خطاب، اعلی درجہ کے قانون دان اور دیگر بے مثال صفات کی بنا پر عالمگیریت کے ساتھ وجود میں آئی۔حکیم الامت علامہ اقبال نے جو تصورات پیش کئے، ان میں خودی، شاہین، مردمومن اور ملت شامل ہیں۔

اقبالؔ کے نزدیک فن کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ اجتماعی زندگی کی نشو ونما میں معاونت کرے، جس فن میں نہ زندگی کی کارفرمائی نظر آئے اور نہ فن کار کی خودی وہ اقبالؔ کے نزدیک بیکار ہے۔اقبال نے فن کے بارے میں بڑے دلکش، حسین اور دلآویز انداز سے اظہار خیال کیا ہے۔اقبال کے نقطہ نظر سے مجرو حقیقت نگاری یا واقعات جذبات کو جوں کا توں بیان کرنے کا نام فن نہیں اس کے لیے رمزیت وایمائیت کا عنصر بہت ضروری ہے۔ان کے نزدیک شاعری میں یہ کمال نہیں کہ ایک واقع یا تجربہ جیسا کہ وہ نظر آتا ہے یا محسوس ہوتا ہے اسے بالکل اسی طرح بیان کردیا جائے بلکہ گویائی کی معراج یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے ردعمل کے طور پر غور وفکر اور حیرت و استعجاب کی نئی نئی صورتیں پیدا ہوں جیسا کہ اقبال کہتے ہیں۔

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرف تمنا، جسے کہہ نہ سکیں رو بہ رو

اقبالؔ کے خیال میں فن کی تکمیل کی منزل ایک دشوار منزل ہے، اس سے کامیاب گزرجانا اتنا آسان نہیں جتنا عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔وجہ یہ ہے کہ انسان کے بعض محسوسات و جذبات اس قدر لطیف اور نازک ہوتے ہیں کہ الفاظ کا بار نہیں اٹھا سکتے۔دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ بعض اوقات الفاظ اس احساس کو پوری طرح سے معنویت سمیت پیش کرنے سے

قاصر رہتے ہیں۔ایسی صورت میں احساس سے لطف اندوز ہونے کے لئے صرف وسعت مطالعہ سے کام نہیں چلتا بلکہ آدمی کو وجدانی یا باطنی شعور کا سہارا لینا پڑتا ہے۔علامہ کی رائے یہ ہے کہ ایسے مواقع پر فکر و مطالعہ سے ذرا ہٹ کر اپنے قلب اور ذوق سخن کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔
اقبالؔ کے نظریۂ فن کے متعلق مولانا سید ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں:

''اقبال علم و فن شعر و ادب اور زندگی کے دوسرے مسائل کے بارے میں ایک خاص رائے رکھتے تھے جو آن کے خیالات و تجربات کی بنیادوں پر قائم ہوتی تھی۔ان کی ایک رائے یہ تھی شعر و ادب کا ملکہ اور ذوق سلیم خدا کا عظیم عطیہ اور نا قابل تسخیر ہتھیار ہے۔جس سے افکار و معاشرت میں انقلاب لایا جا سکتا ہے۔اور فاسد ماحول کے خلاف دلوں میں غضب و انتقام اور طبعیتوں میں اضطراب پیدا کیا جا سکتا ہے۔اور پھر غلط نظریات کی جڑ کاٹ کر صالح اور صحت مند اقدار کی آبیاری کی جاسکتی ہے،اس لئے شاعر و ادیب کے قلم میں وہ تاثیر اور قوت تسخیر ہونی چاہیے جو عصاء موسی ، ید بیضا اور دم عیسیٰ میں تھی ،اسے دلبری اور قاہری کے ساتھ عالم انسانیت میں پیغامبری کا رول بھی ادا کرنا چاہیے۔(۱)

('نقوش اقبال' صفحہ ۹۸ مصنف مولانا سید ابوالحسن ندوی سن،اشاعت مجلس نشریات اسلام کراچی نمبر ۱۸)

اقبالؔ کے نزدیک فنی تحریک کا محرکِ اول خود فنکار کی داخلیت ہے۔اگر فرد کی داخلی کیفیت یا باطنی شعور بے جان ہو تو پھر خارجی زندگی کا کوئی پہلو خواہ وہ کتنا ہی معنی خیز ،حیات افروز اور دل آویز کیوں نہ ہو فنی تخلیق کا روپ نہیں دھار سکتا۔اقبالؔ کے خیال میں فن کے اس باطنی شعور یا وجدان کا موثر اظہار فنکار کے اخلاص یا خون جگر کے بغیر ممکن نہیں۔فن کو اثر آفرین بنانے کے لئے خلوص و احساس کی صداقت بہت ضروری ہے۔اس کے بغیر لازوال فن تخلیق نہیں ہوسکتی اور نہ کوئی فنکار حیات جاوید ہوسکتا ہے۔حضرت علامہ اقبال اپنی نظم مسجد قرطبہ میں فرماتے ہیں۔

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

اقبالؔ کے نزدیک فن کی غایت یہ ہے کہ وہ حیات انسانی کے لیے مسرت بخش اور حوصلہ مند ہو'اگر فن پارے میں یہ اوصاف نہ ہوں تو علامہ کے نزدیک وہ بے معنی اور مہمل ہے۔فن اور فنکار کی حیات ابدی کے لیے ضروری ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے لیے دائما روح

پرور اور حیات خیز ہو۔علامہ فن کا مقصد بتاتے ہوئے کہتے ہیں۔

مقصود یہ ہنر سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

علامہ اقبال زندگی کا شاعر ہے اور فن کو اس کا خادم جانتا ہے اقبال نے زندگی اور فن کے رشتے کی صراحت بڑے صاف لفظوں میں یوں بیان کی ہے۔

علم و فن از پیش خیزان حیات
علم و فن از خانہ زدان حیات

زندگی اور فن کے اس رشتے میں اقبال نے حیات کو جو بلند مقام دیا ہے اس کا احساس ان کی تصور حیات کائنات کی بنیاد بھی ہیں اور ان کے نظریہ فن کا مرکزی نقطہ بھی۔اقبال کے فن کے نظریے کے متعلق شیخ محمد علی رقمطراز ہیں

''اقبال آرٹ برائے آرٹ کے قطعی قائل نہ تھے وہ آرٹ کو زندگی سمجھتے تھے''۔

(نظریات افکار اقبال صفحہ 667 مصنف شیخ محمد علی نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد)

اقبال کے نزدیک ہر فن کا مقصد زندگی کی تاریکیوں میں نور بھرنا اور انہیں زیادہ سے زیادہ حسین بنانا ہے۔فرد اور معاشرے کو پستی سے بلندی کی طرف لے جانے اور اسے حیات ابدی کا سوز بخشنا، اسے انقلاب کی لزتوں سے آشنا کرنا اور ہر ایک نئے دور کی جستجو میں سرگراں رکھنا اس کا کام ہے۔اقبال کے ان اشعار میں فن کے اعلیٰ مقاصد کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

۱- گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر
وائے صورتگری و شاعری و نائے و سرود!
۲- خون رگ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانہ حافظ ہو کہ بت خانہ بہزاد۔
۳- فطرت کے نوامیس پہ غالب ہے ہنر مند

شام اس کی ہے مانند سحر صاحب پر تو
۴-الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

''اقبال نے ادب برائے ادب، اور ادب برائے زندگی، کے موضوعات پر اپنے خیالات کا تفصیل سے اظہار کیا ہے۔علامہ اقبال کے نزدیک فن برائے فن کا نظریہ فریب ہے۔حرف سازی ہے، ایک ایسا خوش رنگ پھول ہے جس کا ذائقہ بڑا کڑوا اور اور جس کے اثرات نہایت مہلک ہیں۔وہ ایک جسم ہے بے روح، بیجان تصویر ہے جو متحرک ہونے پر بھی عالمی تصاویر سے گزر کر عالم اجسام میں قدم نہیں رکھ سکتی''۔

(مطالعہ اقبال،صفحہ 274 مصنف گوہر نوشاہی بزم اقبال لاہور 1983)

ایک اور بات جس پر اقبالؔ بہت زور دیتے ہیں یہ ہے کہ فن میں محض جذبات پرستی نہیں ہونی چاہیے اور فنکار کو افلاطون جیسے لوگوں کی تقلید نہیں کرنی چاہیے آرٹ روح پرور حیات بخش ہونا چاہیے نہ کہ افیون کے دریا میں غرق۔آرٹ کا کام حقیقت کو متشکل کرنا ہے۔اقبال کا فن اب اس معیار کے مطابق ہے وہ زندگی اور اسکے ظہور کا بیان بھی موت کی زبان سے ادا کرنے سے اعتراض نہیں کرتا۔اس جہاں میں اک معیشت اور سوا فتاد ہے روح کیا اس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے۔

کیا وہاں بجلی بھی ہے دہقان بھی ہے خرمن بھی ہے۔
قافلے والے بھی ہیں اندیشہ رہزن بھی ہے۔

''اقبال برائے فن کے نظریے کے سخت خلاف ہیں۔اس سلسلے میں لکھتے ہیں''
جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آرٹ کا منتہائے مقصود خود آرٹ ہے وہ نادانستہ طور پر گمراہ کرنے اور ہماری زندگی اور توانائی کو فنا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے لیے ازبس ضروری ہے کہ ہم ایسے نادان دوستوں سے ہوشیار رہیں''۔

(جہانِ اقبال صفحہ 280 اور عبدالرحمٰن طارق)

خود علامہ اقبال ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''تمام انسانی سرگرمیوں کا انتہائی مقصد زندگی ہے۔ پرشوکت، پرقوت، مالا مال زندگی تمام انسانی فنون کے سامنے یہی مقصد ہونا چاہیے۔ اور ہر چیز کی قدر اس کے حیات بخش قابلیت کے مطابق مقرر کی جانی چاہیے۔ بلند ترین آرٹ وہ ہے جو ہماری سوئی ہوئی قوت ارادہ کو بیدار کرے اور ہر ہمارے اندر امتحان کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی قوت پیدا کرے۔ ہر وہ چیز جو نیند لاتی ہے جو ہماری آنکھیں بند کر دیتی ہے اور ہمیں آس پاس کی چیزیں دیکھنے نہیں دیتی جس کو قابو میں لانے پر زندگی کا انحصار ہے، زوال اور محبت کا پیغام ہے۔ آرٹ کی خاطر آرٹ کا واہم تنزل اور ادبار کی ایک عیارانہ ایجاد ہے۔ جو زندگی اور قوت کی طرف سے بہکا کر ہمیں دوسری جانب لے جاتی ہے''۔

(بحولہ ادبی دنیا لاہور جون 1934)

علامہ اقبالؔ شاعری کی تخلیقی خصوصیات کو بھی سراہتے ہیں وہ افلاطون کی طرح فن کو نقل سے تعبیر نہیں کرتے۔ ایک رومانی شاعر کی حیثیت سے وہ حسن فطرت کے دلدادہ ہیں۔ لیکن آن کی رائے میں فن فطرت نقل نہیں، کیونکہ فنکار کا عملی تخلیق ہے اور تخلیق کی نقل مختلف چیزیں ہیں۔ اقبالؔ کے نزدیک مقاصد کی تخلیق کی خاطر حقائق کے خلاف مزاحمت زندگی اور صحت مند ہے۔

فطرت کی غلامی سے کر آزار ہنر کو
صیاد ہیں مردانِ ہنر مند کہ نخچیر!

علامہ اقبال کی رائے میں فطرت کا چربہ اتارنے والا فن کار دریوزہ فطرت ہے اور فطرت کی بنیاد پر ایک نئی عمارت کھڑی کرنے والا فنکار فطرت کو از سرِ نو تخلیق کرتا ہے۔ اور اپنی ہستی کی راز ہائے سربستہ عیاں کر دیتا ہے۔ ایسے فنکارانہ تخلیقات ابدی حسن کے مالک ہوتی ہیں۔ انسان نے افادی فنون کے ذریعے فطرت کی نقل کرنے کے بجائے اسے سنوارنے اور اس میں اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال زندگی کے شاعر ہیں اور ہنر کو مقاصد حیات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ بقول ان کے آرٹ ایجاد ہے نہ کہ تفریح، چنانچہ فنکاروں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے فنون میں زندگی کے مقاصد کو پوری طرح ملحوظ رکھیں۔ دلکش آرٹ جب موت کا نقشہ کھینچتا ہے اور اس کو بڑھا چڑھا کر دکھاتا ہے تو وہ سخت تباہ کن ہو جاتا ہے۔ آرٹ زندگی کا معاون ہے اور زندگی اقبال کے نزدیک تار نفس کے برقرار رہنے کا نام نہیں، نہ محض گردش شام وسحر سے اس کا شمار ہوسکتا ہے۔ بلکہ زندگی ہے مظاہرات سے بہت بلند ایک عظیم تر حقیقت اور تخلیق کائنات کا راز

ہے۔ زندگی کا سب سے بڑا مظہر انسان ہے جو خالق عالم کی قدرت کا بہترین نمونہ ہے۔ علامہ کے نزدیک ہنر کا مقصد زندگی کو خوشگوار بنانا اس میں حسن اور دلکشی پیدا کرنا، اس کی محرومیوں کو شادمانی سے، ناکامیوں کو کامیابی سے اور ظلمتوں کو روشنی سے بدل دینا ہے۔ اور اس کے لئے فطرت پر قابو پانے اور رکاوٹوں پر غالب آنے کا عزم وقوت ہے۔ چنانچہ علامہ کا نظریہ ہے کہ اہل ہنر نوع انسان کے لئے رحمت ثابت ہوتے ہیں، ان کا ربط اپنے ماحول کے ساتھ دوستانہ ہوتا ہے اور ایسا بلند ہنر وراس رنگ میں ڈوب جاتا ہے۔ اقبال نے زندگی کے ہر پہلو کو ایک فلسفیانہ اساس قائم کر کے اسلامی نقطہ نظر سے دیکھا ہے۔ اقبال کا طرز تحریر نہ تو مناظرانہ رہا اور نہ عذر ومعذرت خواہانہ۔ انہوں نے نہایت جرات کے ساتھ تعمیر خودی کے فلسفے کو بیان کیا کہ جس سے مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عظمتِ رفتہ کو بحال کر سکیں۔ اس کے لیے انہوں نے ''مردِ مومن'' کی اصطلاح کا تصور بھی پیش کیا' وہ مردِ مومن جس کی جلوت اور خلوت مکمل اسلامی رنگ میں ڈھلی ہوئی ہو۔ اقبالؔ تمام عالمِ اسلام کو زندہ و بیدار دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہماری پرانی عظمت کی بازیافت کے لیے ان کے دل میں بے پناہ تڑپ ہے۔ انسان کے اندر عزم و یقین پیدا کرنے کے لیے علامہ اقبال نے خودی کو سب سے بڑا جوہر کہا ہے۔ چنانچہ علامہ کے نزدیک وہ ہنر بے حقیقت ہے جس میں تعمیر خودی کا جوہر پوشیدہ نہیں اور زندگی کو نکھارنے والا ہنر وہی ہے جو خودی کو بیدار کرے اور اس کا محافظ بنے۔

سرور و شعر سیاست کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیر بندی خاکی سے ہے نمود آن
بلند تر ہے ستاروں سے آن کا کاشانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی
خودی جب ادب و دین ہوئے بیگانہ

اقبال کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی خودی تک رسائی حاصل کریں اور اپنے اعجاز ہنر سے فطرت کو حیران کر دے۔ علامہ کے نظریہ فن میں مقصد حیات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ جو فن کی نوعیت، افادیت اور معیار کو جانچنے کی کسوٹی ہے۔ یہ مقاصد جس قدر اہل ہوں گے اتنا ہی ہوگا فن اتنا ہی معیاری ہوگا۔ کیونکہ زندگی کے عظمت مقاصد حیات کی نوعیت پر منحصر ہے

اور یہی اعلیٰ مقاصد ہنر کی افادیت کو پرکھنے کا معیار ہوتے ہیں چنانچہ علامہ یہ چاہتے ہیں کہ ہنر اور پاکیزہ مقاصد ہنر سے باخبر ہو۔

اے ز راز زندگی بیگانہ خیز
از شراب مقصدے مستانہ خیز
مقصدے از آسماں بالا ترے
دلربا، دلستانے، دلبرے

علامہ اقبال غلامانہ ذہنیت اور نقالی کو فن کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں کیونکہ غلامی زندگی کے سرچشموں کو خشک کر دیتی ہے۔ غلامی کا ہنر زندگی کی عظمتوں سے ناآشنا ہوتا ہے اور بیمار تخیل انسان کو زندگی سے بیزار بنا دیتا ہے۔ اس کا قلم موت کی نقش گری کرتا ہے۔ اس کا نغمہ سوز حیات سے خالی اور کسی بیوہ کی فریاد کی مانند ہوتا ہے۔ اس کا دل عزم و یقین سے، اس کا ذہن لذت تحقیق سے اور اس کا ہنر قوت تخلیق سے محروم ہوتا ہے اور اس قسم کا ہنر استحکامِ خودی کی منزل سے بہت دُور رہتا ہے۔

اقبالؔ مسلمانوں کے فن تعمیر کی عظمت و جلال شان و شوکت، جمال و جلال اور پختگی و استحکام پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ مسلم فن تعمیر میں جس چیز نے اقبال کو بہت زیادہ متاثر کیا وہ ان تعمیرات کا جلال و جمال اور ان کو بنانے والوں کا جذبۂ ایمانی اور صداقت اور پاک ضمیری ہے۔ اقبال لکھتے ہیں:

''میرا عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات شاعری یا مصوری یا موسیقی یا معماری ان میں سے ہر ایک زندگی کا معاون اور خدمت گار ہے۔ اس بنا پر آرٹ کو ایجاد و اختراع سمجھتا ہوں نہ کہ محض علی تفریح''۔

(تفسیر اقبال صفحہ 35، مصنف ڈاکٹر محمد ریاض مقبول اکیڈمی 199 سرکلر روڈ چوک انارکلی بازار لاہور 1988)

علامہ کا نظریہ فنون لطیفہ کے متعلق عام نظریہ فن سے متعلق ہے۔ وہ ایسے فن کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے جس کا دائرہ عمل صرف حسن و جمال کے مظاہر کو موزونیت کے سانچے میں ڈھالنا ہو اور مقصد محض ذہنی انسانیت کو لذت اور ذوق نظر کو تسکین پہنچانا ہو کیونکہ ایسا فن معاشرے میں سکون و جمود کی ایک ایسی فضا پیدا کر دیتا ہے کہ انسان کے سینے میں طلب جستجو کی آگ ماند پڑ جاتی

ہے وہ بصیرت باقی نہیں رہتی کہ وہ اپنے راہ منزل کو واضح طور پر پہچان سکے اور مصائب زمانہ پر قابو پا کر اپنے دنیا خود بنا سکے۔اقبال اس فن کے حق میں ہیں جس کا تعلق انسان کی زندگی سے ہو اور جو معاشرے کی اصلاح و ترقی کا وسیلہ ہو۔المختصر اقبال کا نظریہ فن مقصدی بھی ہے اور ہمارے مذہبی عقائد و افکار کے عین مطابق بھی۔علامہ کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ زوال پذیر معاشرے میں عاشقانہ شاعری،رقص و موسیقی اور مصوری وغیرہ فروغ پاتی ہیں۔

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علم نباتات

اقبال کی شاندار نظم مسجد قرطبہ سے ان کے نظریہ فن کی بڑی حد تک وضاحت ہوتی ہے۔اس سلسلے میں گوپی چند
نارنگ رقمطراز ہیں:

''اقبالؔ نے جس چیز کو خون جگر کہا ہے وہ اس کا فنی اخلاص ہے،جس کی پرورش کے جذبے کی آغوش میں ہوئی۔مسجد قرطبہ میں وہ کہتے ہیں کہ ہنر کے معجزے آنی اور فانی ہیں۔سوائے ان کے جن کی تہ میں جذب دورن کی کارفرمائی ہوتی ہو''۔

(اقبال کا فن،ص 127 ،مصنف گوپی چند نارنگ ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس دہلی،1983)

علامہ اقبال کا نظریہ فن ان کے فلسفہ خودی کا ایک اہم حصہ ہے۔وہ فن کے لیے قوم کے تعمیری پہلو کی عکاسی کو ضروری سمجھتے ہیں۔اقبال فن کے حافظ حقیقی کے مخالف نہیں ہیں۔لیکن ان کے نزدیک یہ فن ان کی ایک صفت تو ہوسکتی ہے مقصد نہیں۔فن کا مقصد زندگی کے حقائق کو لامحدود امکانات کو آشکار کرنا ہے۔مصوری نقاشی،شاعری،تعمیر،ادب موسیقی،رقص سب فنون جمیلہ ہیں،فنکار خواہ ان میں سے کسی بھی فن سے تعلق رکھتا ہے۔اس میں سنجیدگی اور خوداعتمادی کے ساتھ یقین اور خلوص کا جذبہ ہونا لازم ہے یہ محض سخن سے متعلق نہیں،تمام فنون لطیفہ اس میں آجاتا ہیں۔

سینہ روشن ہو تو ہے سوز سخن عین حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

☆☆☆

منیر احمد جامیؔ کی تخلیقی جامعیت

عبداللہ سلمان، بنگلور

سنجیدگی، متانت، سادگی، خلوص، محبت، ملنساری، منکسر المزاجی اور خودداری جیسے الفاظ کو جب میں تحریر کرتا ہوں تو ان الفاظ کے ساتھ ایک نام سامنے ابھر کر آتا ہے جسے لوگ منیر احمد جامیؔ کہتے ہیں۔ منیر احمد جامیؔ ۱۹۷۰ء میں شاعری کے آسمان پر نمودار ہوئے اور مسلسل اپنی ادبی روشنی پھیلا رہے ہیں۔ آپ کو شاعری، مضمون نگاری اور تصوف سے خاص لگاؤ ہے۔ آپ بنگلور دوردرشن اور آل انڈیا ریڈیو کے اردو پروگراموں سے کافی عرصے سے جڑے رہے۔ بنگلور کے ادبی پروگراموں میں اکثر آپ نظر آتے ہیں۔ آپ کے ادبی دامن میں 'نقش لاثانی' نعتوں کا مجموعہ ۱۹۸۳ء میں اور 'حرف تمام' حمدوں کا مجموعہ ۱۹۸۷ء میں اسی طرح خالص تخلیقی واختراعی شعری مجموعہ 'اختراع' ۲۰۰۴ء میں کرناٹک اردو اکادمی سے شائع ہوکر اپنے قارئین سے داد تحسین وصول کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کئی کتابوں کے مرتب ومصنف ہیں اور اسی کے ساتھ ماہنامہ 'طرز تحریر' بنگلور کے مدیر اعلیٰ بھی ہیں۔ روزنامہ سیاست کا ادبی ایڈیشن ان ہی کی تخلیقی کاوشوں کا شاہکار ہوا کرتا تھا۔ اُردو پروگراموں کی نظامت کا فریضہ بھی بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں۔ آپ بہت ہی خوش اخلاق انسان ہیں دوسروں کی مدد کرنا خاص کر ادبی تعاون کرنا ان کی پہچان ہے۔ بارہا میں نے ان سے مختلف ادبی موضوعات پر گفتگو کیا ہے ہمیشہ رہنمائی کی ہے۔ ظاہر سی بات ہے جس کا تعلق تصوف وطریقت سے ہو وہ یقیناً ایک اچھا و پاکیزہ انسان ہوگا۔

جامی صاحب روایتی شاعری کے خلاف ہیں، ان کے یہاں بامقصد شاعری کی اہمیت ہے۔ لفظیات کے زور پر شعر کہنے کو کمال نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ شاعری میں جب تک خون دل نہ ہو تب تک آدمی کو شاعری نہیں کرنا چاہئے کہتے ہیں:

خون دل جامیؔ جسے پیارا نہ ہو

شعر کہنے کی وہی کاوش کرے

جامی کی غزلوں میں زندگی کا حقیقی عکس نظر آتا ہے۔زبان کی شوخی، بیان کی دلکشی اور اچھوتا انداز صرف شاعر کو ہی منفرد مقام عطا نہیں کرتا بلکہ قاری کو بھی متحیر اور عجیب کیفیت سے دوچار کر دیتا ہے۔سہل آسان اور ایسے الفاظ جو احساسات و جذبات کے ترجمان ہوں اور سیدھے قاری کے دل میں اتر جائیں اور اندرون کو جھنجھوڑ کر رکھ دیں، بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

پانی سے بنتے ٹوٹتے ان بلبلوں سے سیکھ
دو دن کی زندگی کا سبق حادثوں سے سیکھ
زندگی کا عذاب کتنے دن
روح کی اضطراب کتنے دن
حادثوں سے بچائے گی جامی
تجربوں کی کتاب کتنے دن

یقیناً حادثات ہماری زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں اس سے ہمیں درس عبرت حاصل کرنا چاہئے اور جو زندگی ملی ہے اس کا صحیح استعمال کرنا چاہئے۔اور انسان کے پیش نظر ہمیشہ یہ بات رہنی چاہئے کہ آدمی ایک پانی کا بلبلہ ہے۔اس کی زندگی اس کے ہاتھ میں نہیں ہے یہ کب پرواز کر جائے اس کا کسی انسان کو علم نہیں۔

منیر احمد جاؔمی تنہائی پسند، نام ونمود سے کافی دور رہنے والی شخصیت کے حامل ہیں۔یہ ہمیشہ متفکر نظر آتے ہیں لیکن ہاں ! چہرے کی مسکراہٹ گفتگو کے درمیان ہمیشہ ملحوظ خاطر رہتی ہے۔یہ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے بھی ہوں تو بے تکلف دوستوں کا پورا خیال رکھتے دکھائی دیتے ہیں، کہتے ہیں:

اپنی ہی تنہائی میں اک دن اتر جاؤں گا میں
خود ہی چہرہ اور خود آئینہ بن جاؤں گا میں

آج کے دور میں ایسے شعراء خال خال ہیں جو غزل کے عیوب ومحاسن سے مکمل طور پر آگاہ ہیں اور ان تمام پابندیوں کے باوجود ان کی غزل میں گہرائی وگیرائی اور تغزل وتصوف کی وہ وجد انگیزی نظر آتی ہے جو سامع وقاری کے ذہن ودل پر ایک دیرپا تاثر

چھوڑتا ہے جس سے قاری و سامع جھوم جھوم اٹھتا ہے اور یہ کیفیت ایک روشن شاعری کے لئے ضروری ہے۔

منیر احمد جامی کے فن کی معنویت و اہمیت اس لئے اور بڑھ جاتی ہے کہ وہ صرف ایک شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ وہ ایک مصلح ہیں۔ معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو وہ اپنے شعر وسخن کے ذریعے سے واضح کرتے ہیں اور اس کی اصلاح کے لئے مشورے بھی دیتے ہیں۔ اس لئے یہ بات بلاتردد اور بے جھجھک کہی جاسکتی ہے کہ اس دور میں منیر احمد جامی کے فکر وفن کی معنویت مزید بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے اس پر کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

اس بات سے شاید کم لوگ واقف ہوں کہ منیر احمد جامؔی نے جہاں حمدیں، نعتیں، غزلیں، نظمیں، مرثیے، قصیدے لکھے ہیں وہیں انھوں نے منقبتیں بھی لکھیں ہیں۔ ان کی کتاب ''اجتماع منظومات''، ہے، جس میں انھوں نے اولیاء اللہ کے تذکرے لکھ کر اپنی عقیدت و محبت اور منقبت نگاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ یہ منظوم سوانح پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی ان کو منقبت نگاری سے خاص لگاؤ ہے ورنہ اس طرح کی منظوم سوانح حیات ان کے گہربار قلم سے نہ لکھا جاتا۔ ان کی غزلوں کی طرح ان کی منقبت میں بھی تازہ کاری کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ ان کے اس فن سے لگاؤ کا بین ثبوت ہے۔ اسی طرح انھوں نے قصیدہ بردہ شریف کا منظوم اُردو ترجمہ بھی کیا ہے جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بہترین ترجمہ نگار بھی ہیں۔

ایں سعادت بزورِ باز ونیست - تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بہرحال! ان کے کلام میں عروضی رکھ رکھاؤ، زبان وبان کی احتیاط، اعلیٰ خیالات، عمدہ نظریات، الفاظ کی مناسبت اور نشست و برخاست، سہل اور عام فہم تراکیب، تشبیہات و استعارات، غرض کہ ایک اچھی شاعری کے لئے جن لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے وہ سبھی پائے جاتے ہیں۔

یہ حقیقت بھی سب پر عیاں ہوچکی ہے کہ آج کے دور میں ایسے شعرا کمیاب ہیں جو شاعری کے عیوب ومحاسن سے مکمل طور پر آگاہ ہیں اور ان تمام پابندیوں کے باوجود ان کی شاعری میں گہرائی و گیرائی اور تغزل وتصوف کی وہ وجدانگیزی نظر آتی ہے جو سامع وقاری کے ذہن ودل پر ایک دیرپا تاثر چھوڑتا ہے جس سے قاری وسامع جھوم جھوم اٹھتا ہے اور یہ کیفیت ایک روشن شاعری کے لئے ضروری ہے۔

شعر وادب سے جامؔی صاحب کی وابستگی فطری ہے بلکہ شعر گوئی آپ کا محبوب مشغلہ ہے اور نعت گوئی سے مداومت و رغبت آپ کی طبع اور بزرگوں کے فیضِ محبت کی مرہون منت ہے۔ میری دانست میں نعت گوئی یا سیرت نگاری کے لئے سب سے اہم شرط حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت اور خیال حفظِ مراتب ہے جب تک یہ نہ ہو کلام کے تمام داخلی و خارجی محاسن بھی اس کو وہ مہک اور دل گدازی نہیں بخش سکتے جو سید الانبیاء کی نسبت متوقع ہے، اس کے برعکس فاسد جذبات کا اظہار، رکیک تشبیہات و استعارات کا استعمال کیف و سرور کی جگہ ذہن پر بوجھ بنتا ہے اور طبیعت کو مکدر کر دیتا ہے۔

ان امور کو ملحوظ رکھ کر جب ہم منیر احمد جامؔی کی منظوم سیرت ''وجہ کل حیات و سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' دیکھتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ آپ کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے قلبی لگاؤ ہے اور آپ کا کلام اس والہانہ لگاؤ کو منعکس کر رہا ہے، یہ ان کے وارداتِ قلبی کی عکاسی ہے جو پڑھنے اور سننے والے کے دل پر براہ راست اثر کرتی ہے۔ بعض اشعار تو ایسے بے ساختہ ہوئے ہیں کہ مرحبا کہنے کی طبیعت چاہتی ہے۔

حضرتِ جامؔی کے کلام سے عیاں ہے کہ آپ کو فن پر دسترس حاصل ہے، لیکن جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے آپ سادہ بیانی کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ادق سے ادق مباحث بھی آپ نے حیرت انگیز سادگی سے بیان فرمائے ہیں اور سادگی کے باوجود کلام میں حلاوت، برجستگی گہرائی و گیرائی بھی پائی جاتی ہے۔

آیئے! اب ہم ان کی حمدیہ و نعتیہ شاعری کا ایک سرسری جائزہ لیتے ہیں اور دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے کلام میں وہ کون سی خوبیاں ہیں جس کی وجہ سے ان کا کلام مقبول خاص و عام ہے۔ اور ناقدین فکر و فن نے ان کے کلام کی تعریف و تصدیق فرمائی ہے۔

جب ہم ان کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ جامی نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے ہوئے قرآنی آیات و احادیث، کائنات عالم، انفس و آفاق سے خوب استفادہ کیا ہے اور ساتھ میں اخلاص و محبت کو کوٹ کوٹ کر اپنے سخن میں سمونے کی کوشش کیا ہے جس کی وجہ سے ان کا کلام اپنا مقام بنالیا ہے۔ دیکھئے کہتے ہیں:

سمجھ میں جامؔی کے آتا نہیں یہ راز ترا
تُو پاس رہتا ہے پھر بھی ہے جستجو تیری

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کے شہ رگ سے بھی قریب ہوں۔قرآن میں مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِيۡدِ فرمایا گیا ہے۔

جامؔی صاحب گرچہ تمام اصنافِ سخن میں برابر لکھتے رہے ہیں لیکن چند سالوں سے انھوں نے اپنی شعری صلاحیت کے اظہار کے لئے حمد،نعت اور بزرگانِ دین،اولیاء اللہ کی منقبت کے میدان کا انتخاب کیا ہوا ہے اور اپنی ذات اور محنت کو اس پر صرف کر کے اپنے لئے وسیلۂ نجات اور ترقی درجات کا سامان کیا ہے۔حضرت جامی نے اپنے اندرونی جذبہ اور ذات نبوی سے شیفتگی کی بنا پر حضرت حفیظ جالندھری و حضرت محسن کاکوروی کے نقش قدم پر چل کر اس کو اپنی ذات کے لئے وقف کر دیا جس کی بہار کو خزاں اور جس کے کمال کو زوال نہیں۔اس میں کامیابی و ناکامی کا سوال نہیں اس راہ کا ہر چلنے والا خواہ رفتاں و خیزاں چلے کامیاب و بامراد ہی رہے گا۔

بہر حال اس وقت میں جامؔی کے شعری فن پاروں کا تذکرہ نہ کرتا تو یہ بے انصافی ہوتی اس لئے مختصراً میں نے کر دیا ہے۔اصل موضوع کی طرف آتا ہوں وہ ہے جامی صاحب کی کتاب ’’تذکرۃ الصالحین‘‘ یعنی کرناٹک کے صوفیاء کرام کا تذکرہ،اس کتاب میں جامی صاحب نے ریاست کرناٹک کے مشہور صوفیاء کرام کا جامع تذکرہ لکھا ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ ریاست کے اکثر اضلاع کے بارے میں بھی تفصیل سے لکھا ہے۔اس کتاب کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جامؔی صاحب شعر و سخن کے ساتھ ساتھ نثر لکھنے پر بھی قادر ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ان کو اس نعمت سے بھی نوازا ہے۔کتاب کی زبان عام فہم ہے۔چھوٹے چھوٹے لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ادق عبارت سے پرہیز کیا گیا ہے۔

Abdullah Salman

Mob: 9341378921, **E-mail:** salman_pbh@rediffmail.com

26, Haines Road, 1st Floor, Egyptian Block, Bangalore -560051

داستان الف لیلہ ولیلی اور ہندوستانی جمالیات

حفیظ الرحمٰن، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

ایک ہزار اور ایک رات پر مبنی داستان کا نام ''الف لیلہ ولیلی'' ہے جسے ایرانی اور ہندوستانی اثرات کی حامل تصنیف قرار دیا جاتا ہے اس میں ہندوستانی تہذیب ومعاشرت کے جمالیاتی پہلو جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایران میں 'ہزار افسانہ' اور عربی میں 'القصص' کے نام سے منظر عام پر آنے والی کتابوں کے ماخذات الف لیلہ کی جانب ہی اشارہ کرتے ہیں۔ یہ متعین کرنا تو بہت مشکل ہے کہ ان کہانیوں کے اصلی تخلیق کار کون لوگ ہیں دراصل انہیں مختلف ادوار اور مختلف علاقوں میں لکھا گیا ہے۔ کہانیوں کے مندرجات میں مختلف تہذیب کے مرقعے پائے جاتے ہیں جن میں عربی، ایرانی، ہندی، یونانی اور ترکی کی تہذیبیں شامل ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں درج ہے:

''غرض معلوم ہوا کہ الف لیلہ کے متداول صورت میں ایک حصہ بغداد کا اور ایک مصر کا شامل ہے۔ OESTRUP نے ان افسانوں کی گروہ بندی تین جداگانہ طبقوں میں کی ہے۔ ان میں سے پہلا حصہ فارسی ہزار افسانہ کی دیو پری کی کہانیوں اور کتاب کے تمہیدی قصے پر مشتمل ہے دوسرا حصہ ان افسانوں کا ہے جو بغداد سے آئے تھے اور تیسرا ان کہانیوں پر مشتمل ہے جن کا اصل کتاب میں بعد میں اضافہ کیا گیا۔''

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد سوم، لاہور: دانش گاہ پنجاب، 1968، ص 132)

الف لیلہ کو صدیوں کے عمل میں کئی گمنام مصنفوں نے مکمل کیا جن کے بارے میں تاریخ خاموش ہے۔ پہلی بار علم دوست بادشاہ ہارون رشید کے دور میں الف لیلہ کو یکجا کرنے کی باقاعدہ کوشش کی گئی اور ہزار افسانہ کے نام سے پہلی بار فارسی زبان میں مرتب کیا گیا جسے بعد میں 'بیت الحکمت' ایک تاریخ ساز ادارے سے ان کہانیوں کو عربی زبان میں منتقل کیا گیا۔ الف لیلہ کی بازیافت فرانسیسی سیاح گالاں GALLAND کی مرہون منت سمجھا جاتا ہے جس کے ترجموں نے یورپ کو ایسی گراں قدر تصنیف سے نوازا جو درحقیقت ایک بادشاہ مہر وافروز، وزیر داد اور اس

کی خادمہ کی کہانی ہے۔منظوم کہانی کا آغاز یوں تو صدیوں پہلے یونانی اور مصریوں کے یہاں ہو چکا تھا اس لیے یہ خیال بھی بعید نہیں کہ اس داستان میں ان تینوں تہذیبوں کے عناصر موجود نہ ہوں جہاں تک اردو کی بات ہے تو الف لیلہ کے یوں تو متعدد تراجم ہوئے لیکن سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت رتن ناتھ سرشار کے ترجمے کو حاصل ہوئی چونکہ وہ خود بھی صاحب طرز ادیب تھے جن کا داستانوی انداز کا ناول فسانہ آزاد اردو کی معروف کہانیوں میں شمار کیا جاتا ہے

الف لیلہ و لیلی میں عربی شاعروں کا کلام بھی کہانی کی موزونیت کے اعتبار سے شامل کیا گیا تھا رتن ناتھ سرشار نے بھی ترجمے میں اپنے طور پر اردو اور فارسی کے مختلف شاعروں کے علاوہ اپنے کلام کو بھی کہانیوں کے موضوعات کے اعتبار سے شامل کیا ہے اور اسے اپنے رنگ میں ڈھال لیا ہے۔ یوں الف لیلہ اردو تہذیب اور ہندوستانی مزاج میں رچی بسی ہمارے سامنے آتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسی زبان میں لکھی گئی تھی۔سید وقار عظیم اس باب میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''اردو میں ترجمہ کرتے وقت ہمارے داستان گویوں نے ان میں بہت سے اضافے کیے ہیں۔ یہاں تک کہ اردو ترجموں اور فارسی اصل کا مقابلہ کیا جائے تو ترجموں کی ضخامت اصل سے دوگنی ہوگئی ہے۔؛؛

(وقار عظیم،سید، ہماری داستانیں،الوقار پبلیکشنز ،2002, ص 167)

جبکہ ڈاکٹر ابوالحسن منصور نے اصل زبان کے قریب رہنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کا ترجمہ زبان کی چاشنی اور روزمرہ کی رنگینی سے تو محروم ہے لیکن ایک مختلف عربی زبان کا ذائقہ ہم تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس میں پڑھنے کا لطف چاہے کم ہو لیکن ترجمے میں بھی اصل کی خوشبو باقی رہتی ہے، انتظار حسین اور سید وقار عظیم نے بھی اس طویل داستان کا ایک انتخاب شائع کیا تھا لیکن اب وہ بازار میں دستیاب نہیں ہے۔

جہاں تک جمالیات اور مذکورہ داستان میں ہندوستانی تہذیبی جمالیات کی بات ہے تو داستان کا تعلق جن ظاہری صفات سے ہوتا ہے ان میں ایک عنصر سراپا نگاری بھی ہے داستان کی زبان میں سراپا نگاری کے لیے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان میں نغمگیت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے سراپا محبوب کے خیالی جمال اور خوبصورتی کا عکاس ہوتا ہے جس میں اس کے جسمانی اعضاء کو بھی تشبیہ اور استعاروں کی مدد سے بیان کیا جاتا ہے، الف لیلہ میں بھی ایسے ہی الفاظ اور شعری

تراکیب کا استعمال کیا گیا ہے جس سے ایک جمالیاتی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً رشک ماہ، جادو نگاہ، ماہ پارہ، خورشید رخسارہ، رعنا شمائل، زیبا خصائل، عود و عنبر، مشک اذفر، نور عین، زیب و زین اور ماہ لقا، گلگوں قبا جیسے الفاظ گیت کی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں ذیل میں ایک مثال ملاحظہ ہو جس میں نوجوان کی معشوقہ کا ذکر ایسے ہی شعریت کی مثال ہے:

,, وہ اس کی صورت زیبا کی عاشق و مفتوں، یہ اس لیلی طلعت کے مجنوں۔ دونوں معشوق، دونوں عاشق، دونوں عذرا، دونوں وامق۔،،

(رتن ناتھ سرشار، مترجم، الف لیلہ، جلد چہارم، کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2010, ص، 92)

سراپا نگاری میں شاعرانہ تمثیلیں کسی بھی چیز کو حسین بنا سکتی ہیں مثلاً لبوں کو پنکھڑی قرار دینا اور دانتوں کو یاقوت سے تعبیر کرنا ایک اہم شعری رویہ ہے۔ الف لیلی میں ہندوستانی عناصر کی ایسی بہت سی ترکیبیں ملتی ہیں جن میں سامنے والے کی خوبصورتی کو بیان کرنے کے لیے اشعار کا سہارا لیا گیا ہے یہاں بھی نسوانی اعضا کو جن تشبیہات سے بیان کیا گیا ہے وہ دلی اور لکھنو کے خاص ماحول کی نشاندہی کرتی ہیں، سراپا نگاری کے ضمن میں ہمیں دوسری داستانیں بھی سرفہرست نظر آتی ہیں جن میں باغ و بہار کی شہزادی دمشق فسانہ عجائب کی ملکہ مہر نگار اور آرائش محفل کی حسن بانو اپنے حسن و جمال میں نظیر نہیں رکھتیں۔ الف لیلہ میں بھی جہاں جہاں شہزادی اور پریوں کے سراپے بیان ہوئے ہیں وہاں ان کے احساس جمال کو بیان کرنے کے لیے فارسی کے ایسے موٹے موٹے الفاظ ملتے ہیں جو نادر ترکیبوں کی شکل میں سامنے آئے ہیں مثلاً نار پستاں، ابرو خمدار شمشیر ابدار، بوٹا سا قد و قامت، بلند بالا، رخسار تاباں، لب لعل شکر خار شک یاقوت احمر، دردنداں غیرت سلک گہر وغیرہ۔ اب ذرا کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جن میں سراپے کی ہندوستانی صورت فارسی تشبیہات کے ساتھ یوں نظر آتی ہے:

سر و درباغ بیک پائے فنا دست نگر
بہر رکاب تو دود گر بودش پائے دگر
ز ابروان تو بے اختیار می ترسم
بہ مرتضی کہ ازیں ذوالفقار می ترسم
گل سا رخسار، گول گول بدن

گات جس طرح قمقمے روشن

(ایضاً، جلد دوم، ص132)

الف لیلہ کا اسلوب ہندوستانی اور ایرانی مٹی سے گوندھا ہوا ہے اس لیے ہمیں ان میں ایسے ہی جمالیتی مرقعے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ سراپا نگاری کے باب میں اس داستان کے سبھی کردار مثالی ہیں چاہے وہ پریوں کا کردار ہو یا شہزادیوں کا ان سب کی پیشکش نسوانی اعضا کی خوبصورتی سے عبارت ہے جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

''بلند و بالا سینہ ابھرا ہوا، رخسار نرم نرم، چمکدار، صورت شکل ملیح۔ کالے کالے بالوں کے بیچ میں اس کا چہرہ چمک رہا تھا اور سینے کی اٹھان کے اوپر اس کے دانت دمک رہے تھے۔،،

(ابوالحسن منصور احمد، مترجم، الف لیلی کے شاہکار قصے، لاہور: الفیصل ناشران، 2005، ص67)

,,میں نے ان میں سے ایک کو اپنے ساتھ لیا جس کا چہرہ خوبصورت، آنکھیں سرمگیں، بال کالے کالے، آگے کے دانت کشادہ، ادائیں مکمل، بھویں ملی ہوئی تھیں۔،،

(ایضاً، ص93)

,,لڑکی کیا گویا لچک دار شاخ تھی، وہ گل نازی رنگ کی قمیض پہنے ہوئے جس پر صنعا کی ساخت کی ایک قبا پڑی ہوئی، سرخ قمیض میں سے اس کے بدن کی سفیدی جھلک رہی تھی، قمیض کے نیچے سے انار کے مانند دونوں پستان چمک رہے تھے۔۔۔

ایا میر المومنین! اس کے گلے میں سرخ سونے کا ایک تعویز دونوں پستان کے بیچ میں لٹک رہا تھا ماتھے پر تسبیح کی طرح گیسو لٹک رہے تھے۔،،

(ایضاً، ص128)

الف لیلہ کسی ایک شخص سے منسوب نہیں بلکہ ترجمے کی صورت میں سامنے آئی اس لیے یہاں چیزوں کی تفصیل نہیں ملتی چاہے کرداروں کی بات ہو یا ان کے سراپے کی ان تمام چیزوں کی جمالیاتی جھلکیاں بہت محدود ہیں۔ صرف لفظوں اور ترکیبوں کے سہارے جو مرقعے پیش کیے گئے ہیں وہ تقریباً ایک جیسے ہیں۔ ان کی پوشاک اور رنگ ڈھنگ بھی ایک سا ہے یہ کردار اپنے گہنوں اور کپڑوں میں بھی مختلف نہیں لگتے۔ داستان میں کبھی تو لگتا ہے جیسے کسی ایک ہی ماہ رو کا عکس بار بار نام بدل کر استعمال ہوا ہے۔ شادیوں کی رنگارنگی اور رسموں میں بھی یکسانیت نے

اس داستان میں جمالیاتی فکر کو نئے انداز میں پیش نہیں کیا ہے۔اس کی وجہ اس دور کی جمالیات کا وہ مشترکہ تجربہ تھا جو ہر اس داستان کا حصہ بنا جس میں اظہار کی صورتیں کہیں تمثالی انداز میں نظر آتی ہیں اور کہیں مثالی بن جاتی ہیں۔ ہندوستانی شعراء کے ہاں حسن کے یہ سارے تجربے لب و دنداں، خم کاکل اور کہیں سر وقد جیسی تشبیہات کے لبادے میں موجود ہیں۔ایسے ہی ایک قصے میں ایک دلہن کا سراپہ ملاحظہ ہو جس کی ہر پوشاک اس کے روپ کو نئے رنگ میں تو سامنے لاتی ہے لیکن یہ رنگ داستان میں ہر جگہ ایک سا ہے:

,, جب وہ اس لباس میں باہر نکلی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاند نکل آیا اس کے بال کالے کالے تھے، رخسار نرم نرم، ہنس مکھ، سینہ ابھرا ہوا پہلو اور کلائیاں نرم نرم اور وہ منہ دکھائی کی دوسری پوشاک پہنی ہوئی تھی۔

پھر انہوں نے تیسری پوشاک بدلی اور گھنے بال اس کے اوپر چھوڑ دیے اور کالی اور لمبی لٹیں بکھیر دیں جو کالی رات کی طرح سیاہ اور طویل معلوم ہوتی تھی۔۔

اب انہوں نے چوتھی پوشاک بدلی تو وہ نکلتے ہوئے سورج کی طرح سامنے آئی اور ناز و ادا سے جھوم جھوم کر چلنے اور غزالوں کی طرح دیکھنے اور اور اپنی پلکوں کے تیروں سے دلوں کو پاش پاش کرنے لگی۔

پھر وہ پانچویں پوشاک میں نکلی مثل ایک پیاری لڑکی کے، گویا وہ بید کی چھڑی تھی یا پیاسا ہرن اور اس کی لٹوں کے بچھو رینگ رہے تھے۔۔۔،،

(ایضاً،ص135)

داستان کی سب سے بڑی خوبی وہ طلسماتی دنیا ہے جس میں جادو ٹونے سے لے کر جنوں اور پریوں کے کارنامے تک موجود ہیں۔طلسمات کے اس سفر میں جب جذبات داخل ہوتے ہیں تو دو دنیائیں دریافت ہوتی ہیں۔

ایک دنیا میں کارنامے ہیں اور دوسری دنیا اظہار کی محتاج دکھائی دیتی ہے داستان کی زبان جس طرح عورت کے اظہار سے مکمل ہوتی ہے وہاں مرد محبوب کے روپ میں اور عورت محبوبہ کی صورت میں نظر آتی ہے۔ داستان کی عورت رسم عاشقی کے تمام قاعدے پورے کرتی ہے جسے بیان کرتے ہوئے اس کی فطری شرم و حیا کو بھی بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔عورت کا یہ روپ جن زادی کی صورت میں ہو یا بنت آدم کی شکل میں سامنے آئے ان دونوں کا مقصد ہی اظہار ہے

جو جسمانی سطح کا بھی ہوسکتا ہے اور روحانی انداز میں بھی دکھائی دے سکتا ہے۔ الف لیلہ کے ایک قصے ''ضمر ہ اور اس کی محبوبہ'' میں ایک نسوانی کردار کا رسم عاشقی کے مطابق اپنے محبوب کا بے صبری سے انتظار کا نقشہ ملاحظہ ہو:

,, مجھے ایک ایسے شخص سے محبت ہے جو میرے ساتھ انصاف نہیں کرتا میں اسے چاہتی ہوں اور وہ مجھے نہیں چاہتا۔ میں راتیں تارے گن گن کر کاٹتی ہوں اور اسے میری پرواہ نہیں جب میں اس کے گھر کی دیواروں پر سورج دیکھتی ہوں تو سمجھتی ہوں کہ وہی ہے اور اگر میری نظر اس پر اچانک پڑ جاتی ہے تو میں ہکا بکا ہو جاتی ہوں میرے بدن سے روح اور رگوں سے خون نکل جاتا ہے اور میں ہفتے دو ہفتے کے لیے پاگل ہو جاتی ہوں۔،،

(ایضاً،ص128)

داستان کی تہذیب میں اظہار کا کوئی معیار متعین نہیں اس لیے ابتذال کی حد سے گزر جانا عیب معلوم نہیں ہوتا داستانوی دنیا میں امرد پرستی عام ہے جو ہر خوبصورت مرد اپنے ہم جنسوں کے لیے باعث راحت بنتا ہے۔ اسی طرح نسوانی کردار بھی ایک دوسرے میں ایسے مدغم نظر آتے ہیں جس کی وجہ عورتوں کی وہ جنسی مسرت ہے جو پورے معاشرے کے تناظر میں تسکین بن کر سامنے آتی ہے۔ یہ ہندوستانی معاشرے کی وہ تصویر ہے جس میں نوابوں کی زندگیاں اور ان کا اپنی بیگمات سے سرسری تعلق خواہش کی شکل میں ضرورت بن کر جھلکتا ہے۔ داستان کا یہی پہلو ہمیں بعد ازاں افسانے میں بھی نظر آتا ہے جہاں عورت کا اپنی ہم جنس سے تعلق موجود ہے۔ اس ضمن میں عصمت چغتائی کا لحاف فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس داستان میں ضمر ہ کی محبوبہ بھی ایسی ہی عورت ہے جسے کنیز کی قربت نئی دنیاؤں سے متعارف کروانے لگتی ہے تو وہ کچھ وقت کے لیے مرد کی محبت یوں فراموش کر دیتی ہے:

,, وہ آئی تو مجھے لپٹ گئی نوچنے، کھسوٹنے اور دانتوں سے کاٹنے لگی اس کے بعد ہم دونوں تنہائی میں بیٹھ کر شراب پینے اور دسترخوان بچھنے کا انتظار کرنے لگے۔ سرور بڑھتا جاتا تھا کبھی وہ میرے اوپر چڑھ بیٹھتی اور کبھی میں اس کے اوپر نشے کی حالت میں اس نے میرے ازار بند پر ہاتھ مار کر اسے کھول دیا۔ ہم میں غیرت تو تھی ہی نہیں اسی ہاتھا پائی میں میری ازار نیچے سے کھسک گئی۔،،

(ایضاً،ص189)

جہاں تک منظر نگاری کی بات ہے تو داستان الف لیلہ کا جمالیاتی رنگ پھولوں ،خوشبوؤں اور رنگوں سے مزین ہے یہ مناظر لفظی تمثال نگاری سے داستان کو طلسماتی فضا عطا کرتے ہیں۔ الف لیلہ میں ایسے بہت سے مناظر ہیں جن میں تشبیہات واستعارات کا بھرپور استعمال کہانی کی چکاچوند بڑھا دیتے ہیں۔ سنگ مرمر کے فرش اور راہ داریاں دلی کے معاشرت کی مکمل عکاس ہیں۔ یہاں باغات اور فطرت کی تمام رعنائی نہ صرف قصے کو ماورائی بناتے ہیں بلکہ جنت کی خوبصورتی کا خیال آفرین احساس بھی ملتا ہے۔ حاسداور محسود،، کی کہانی میں بھی کچھ ایسا ہی منظر موجود ہے جس میں محل کے 40 مخزن ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ جہاں ہر قسم کے پھلوں اور باغوں کی بہتات ہے۔سرشار نے الف لیلہ لکھتے ہوئے اپنے تخیل سے خوب کام لیا یہی وجہ ہے کہ ایک طرف وہ پھلوں اور پرندوں کا ذکر کرتے ہوئے اس منظر کو چیزوں کی خوبصورتی سے اجاگر کرتے ہیں۔ دوسرے مخزن میں درختوں کو فرش قرار دینا ہی پورے منظر کی خوبی کو تمثیل سے سجایا گیا ہے۔ داستان گو یہاں پھولوں کی قسموں اور خوشبوؤں کا سہارا لے کر جمالیاتی احساس اجاگر کرانا چاہتا ہے:

,,میں نے دیکھا کہ وہاں جنت کے مانند ایک مکان ہے اور اس میں ایک باغ ہے جس کے درخت ہرے بھرے اور پھل پکے ہوئے اور چڑیاں گاتی ہوئی اور پانی بہتا ہوا ہے۔۔سیبوں کا رنگ سرخی مائل زرد ہے پھر میری نظر سیبوں پر پڑی جن کی خوشبو کے آگے عنبر اور مشک مات تھے۔ میں نے دوسرا مخزن کھولا اور اس میں داخل ہوا میں نے ایک بہت بڑا میدان دیکھا جس میں بہت سے کھجور کے درخت تھے اور ایک نہر بہہ رہی تھی جس کے کنارے چنبیلی اور صدا بہار اور نسرین اور نرگس اور تلسی کے درخت فرش کی طرح بچھے ہوئے تھے۔،،

(ایضاً،ص94)

باغوں کی جمالیات کو داستانوں میں بڑی خوبصورتی سے دکھایا جاتا ہے۔ باغ چاہے زمینی ہو بہشتی یا پھر طلسمی ہر داستان میں نت نئے باغات پائے جاتے ہیں اگر ہم ''سب رس،، میں باغوں کی ترکیب حسن دیکھیں تو وہ سراسر تمثیلی ہے جس میں پھولوں ،کلیوں اور ہاروں کی مناسبت سے کرداروں کو متعارف کروایا گیا ہے۔اس تمثیلی انداز سخن سے ذہن میں کوئی نقشہ نہیں بنتا محض لفظوں کی صورت گری ظاہر ہوتی ہے۔ دوسری طرف الف لیلہ کے باغات بہشت بری کا نمونہ دکھائی دیتے ہیں۔ان باغوں کا طلسم ہندوستانی معاشرت کا عکس بن کر سامنے آتا ہے۔ایسا ہی

ایک باغ گلزارارم ہے جہاں کی ہر چیز کوترکیبوں اورتلمیحات سے بیان کیا گیا ہے۔ بارہ دری، باد بہاراور بوئے گل جیسی ترکیبیں ہندوستانی معاشرت کا منظرپیش کرتی ہیں۔

اس داستان کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باغ کی اصل جمالیاتی تصویر پھلوں، پھولوں، کیاریوں اور میووں اور نظاروں سے ہی نہیں بلکہ بارہ دری سے مزین سنگ مرمر کے فرش، چشمے اورفوارے بھی بہت معنی رکھتے ہیں الف لیلہ میں ایک جگہ ایسے ہی ایک باغ کا تذکرہ ملتا ہے جس میں تشبیہاتی انداز اپنایا گیا ہے۔ اس کی نسبت طلسماتی باغات کی رونق کچھ اور قسم کی ہے جہاں چیزوں کی ماورائی حیثیت بتانے کے لیے مبالغے سے کام لیا گیا ہے درحقیقت ان طلسماتی باغات مافوق الفطرت دنیا سے تعلق رکھتے ہیں جن میں خیال آفرینی کی آمیزش اس درجہ کی جاتی ہے کہ اس پر اصل کا گمان نہیں ہوتا البتہ باغ کا تمثیلی اور جمالیاتی خاکہ ضرور آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ ذیل میں دی گئی مثالوں سے دو مختلف باغات کی جمالیاتی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے:

,,باغ کی روشوں پر رنگین پتھر کا فرش بنا ہوا کہ مانند قالین گلزار کے دکھائی دیتا اور دونوں طرف بارہ دری کے دو چشمے تھے جن سے سینکڑوں فوارے چھوٹتے اور اس باغ میں درختوں میوہ دار پر ہزاروں طیور خوش آواز چہک رہے تھے۔،،

(ایضاً،227)

,,اس کے دروازے محراب دار ہیں گویا وہ ایک محل ہے اور اس پر انگور کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں اور ان میں رنگ برنگ انگور لگے ہوئے ہیں جو سرخ ہیں یاقوت معلوم ہوتے ہیں اور جو سیاہ ہیں آبنوس۔۔۔آلو بخارے حسینوں کے سے رنگ والے اور اور ناشدانے جن سے دانتوں کی زردی دور ہو جائے۔،،

(ایضاً،228)

باغات اور محلات داستانوں کا لازمی جزو ہیں یعنی یہ وہ مقامات عیش و عشرت اور آرامگاہیں ہیں جن میں بادشاہوں کا جاہ وجلال اور جمال دونوں نظر آتے ہیں اسی طرح جنات اور ماورائی مخلوق کے لیے بھی طلسماتی محلات دکھائے جاتے ہیں جن کی جمالیاتی حیثیت کسی سے کم نہیں ہے۔ اگرچہ یہ ماورائی کردار ہوا میں اڑتے ہیں اور جادوئی کمالات دکھاتے ہیں لیکن ان کی رہائش گاہیں بھی طلسمات سے آراستہ نظر آتی ہیں۔ ریشم واطلس، کمخواب، زمرداور موتیوں سے سجا سجایا محل خود اپنے اندر جنت جیسی خوبیاں رکھتا ہے۔

داستان کا ایک بڑا وصف قصہ حسن و عشق بھی ہے یہی وجہ ہے کہ داستان حسن و عشق کے بیان کے بغیر ادھوری سمجھی جاتی ہے۔''سب رس'' میں تمثیلی انداز سے کرداروں کی جمالیاتی حیثیت بیان کی گئی ہے اس کے برعکس الف لیلہ میں حسن عشق کے مظاہر اپنے ماحول میں سانس لیتے ہیں۔ اس ضمن میں ہمیں ہندوستانی معاشرے کی اقدار کو فراموش نہیں کرنا چاہیے جہاں کنیزوں اور غلاموں کی زندگیاں ان کے مالکوں کی ضرورتوں سے بندھی ہوئی تھی۔ کہیں یہ ضرورت شہزادوں اور شہزادیوں کی جنسی زندگی بنتی ہے تو کہیں پریاں کسی آدم زاد پر عاشق ہو کر اسے قید کر لیتی ہیں۔ ایسی صورتحال میں معاشرے کی ایک اور تصویر کنیزیں اور لونڈیاں ہیں جو بادشاہوں کا دل بہلانے کا ذریعہ بنتی ہیں یا قصے میں کسی نئے واقعہ کا آغاز ہی ان سے ہوتا ہے۔ الف لیلہ کی دنیا زاد کو ہم فراموش نہیں کر سکتے جو وزیر زادی کے ہمراہ آئی۔ قصے میں اس کی موجودگی ہندوستانی معاشرے کی سماجی حالت کی تصویر ہے۔ وزیر زادی شہزاد کا بادشاہ کے دل پر قابض ہو جانا بھی ان ایک ہزار ایک رات کی کہانیوں کے باعث ہے جن میں وہ اپنی سخن گوئی سے کامیاب رہی۔ ڈاکٹر گیان چند داستان کی ان کہانیوں میں عشق کو متحرک جذبہ قرار دیتے ہوئے اسے صحت مندانہ سمجھتے ہیں:

متعدد کہانیوں کا موضوع حسن و عشق ہے۔ یہ نہ صرف کنیزوں سے کیا جاتا تھا بلکہ شریف لڑکیوں کے ساتھ بھی کوئی جھجک نہ تھی۔ عموماً یہ عشق صحت مند ہے۔ اس کا انجام قید شرعی پر ہوتا ہے۔ بعض حصوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امرد پرستی بھی ایسی کچھ مذموم نہ سمجھی جاتی تھی۔،،

(گیان چند ڈاکٹر، اردو کی نثری داستانیں، کراچی: انجمن ترقی اردو، 1954, ص، 463)

داستان میں عورت کی زبان سے اظہار محبت ایسی کھلی حقیقت ہے جس سے ہماری داستانیں بھری پڑی ہیں۔ پریوں کا شہزادوں پر عاشق ہونا وہ رویہ ہے جو 'اندر سبھا' میں بھی نظر آتا ہے عورت کی جمالیاتی حیثیت ایک طرف لیکن دوسری جانب اس کے اظہار کی صورتیں داستان میں برہنہ ہو کر سامنے آتی ہیں۔ جو مرد کے حسن و جمال پر ایک نظر ڈالتے ہی فدا ہو جاتی ہے۔ یہ عورت اپنے محبوب کے سرعام بوسے لیتے ہوئے بھی نہیں چوکتی یہاں عرب معاشرہ بھی ہندوستانی ماحول اور معاشرت کا پروردہ نظر آتا ہے جس میں عورت کا حسن و جمال جنسی حوالوں سے سامنے آیا ہے۔ اردو کلاسیکی شاعری میں بالخصوص غزل کا لب و لہجہ بھی عورت کی طرف سے اظہار محبت سے لبریز ہے جس میں ہمیں مرد بزدل کھلاڑی کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ اس داستان

میں بھی جنسی تشنگی عورتوں کی شخصیت اور سوچ پر حاوی نظر آتی ہے۔نسوانی کرداروں کی یہ خیال آفرینی ان کی بے باکی اور جنسی ناآسودگی کا اظہار ہے۔:

,, شہزادی نے جو اس کے حسن و جمال پر نظر ڈالی تو ہزار جان سے عاشق ہوگئی کہا کیوں جی تم ہی نے کل ابا جان سے درخواست کی تھی کہ ہمارا تمہارے ساتھ نکاح ہو یہ کہہ کر لپٹ کر بوسہ لیا۔،،

(سرشار، الف لیلہ، جلد سوم، ص220)

,, میں برابر اسے محبت اور ترکیب سے آمادہ کرتی رہی یہاں تک کہ وہ مان گیا اور اقرار کر لیا۔ میں اس رات اس کی رانوں کے نیچے سوئی اور مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ مجھے کس قدر فرحت ہو رہی ہے۔،،

(ایضاً، ص221)

مردوں کی مردانگی سے زیادہ ان کے ظاہری حسن کے لفظی مرقعے الف لیلہ کے جمالیاتی طرز احساس کا خاصہ ہیں۔ بدرالدین حسن بھی ایسا ہی طرح دار مرد ہے جس کا حسن و جمال جن و انس کے لیے ترغیب سے کم نہیں ہے۔ قصے میں بادشاہ بھی اس کا حسن دیکھ کر دل ہار جاتا ہے اور دوسری داستانوں کی طرح جن زادیاں بھی اس پر لٹو ہو جاتی ہیں۔ جس پر پری عاشق ہو کر اسے دیو کی مدد سے اٹھوا لیتی ہے مردوں کے حسن و جمال کی یہ تعریف ہمارے ہاں مثنویوں میں بھی نظر آتی ہے۔ داستان کا کینوس مثنوی کا مقابلہ نہیں کر سکتا اس لیے کہ مثنوی شعری اسلوب میں بڑی بات کو محدود لفظوں میں کہنے کا فن رکھتی ہے اور داستان طویل پیرائے میں جمالیاتی اظہار کرتی ہے بدرالدین کے حسن کو جنت کے غلمان سے تشبیہ دی گئی ہے، اس کی اس لاجواب خوبصورتی کی جو تعریف کی گئی ہے وہ مقامی تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار ہے۔ ذیل میں دی گئی دونوں مثالیں اس کے کردار کی تشریح کرتی ہیں۔:

بادشاہ نے وزیر نورالدین کے بیٹے بدرالدین حسن کو دیکھا اور وہ اسے پسند آیا اور اس سے محبت کرنے لگا اور رعایا کا یہ حال تھا کہ انہوں نے اسے پہلی بار اس روز دیکھا جب کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ بادشاہ کے پاس گیا اور انہیں اس کے حسن کا علم ہوا اور وہ راہ میں کھڑے رہے کہ واپسی پر اسے دیکھیں اور اس کے حسن و جمال اور قد کو دیکھ کر خوش ہوں۔،،

(ایضاً، ص128)

,,اس مقبرے میں مسلمان جن رہتے تھے۔ان میں سے ایک جنیہ نے حسن کو سوتے دیکھا اور اسے اس کے حسن و جمال پر حیرانی ہوئی اور وہ کہنے لگی کہ سبحان اللہ یہ تو جنت کے لڑکوں میں سے معلوم ہوتا ہے۔،،(ایضاً،ص 129)

داستانوں میں مردوں کی یہ طرح داری مسلم تہذیب میں امرد پرستی کے رجحانات کی ترجمان ہیں یہ مثالیں 'باغ و بہار' اور 'آرائش محفل' میں بھی موجود ہیں۔مسلم تہذیب کے یہ رجحانات مرقع دلی کی چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔جن میں دلی کی اندرون خانہ زندگی بے نقاب ہوئی ہے۔دلی کا ہر گلی کوچہ عشرت کدہ تھا جہاں عاشق و معشوق مستی کے عالم میں سر عام اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔عرس میلے ٹھیلے اور تقریبات کی رونقیں ان لونڈوں سے آباد تھیں۔ بزرگوں کے تکیے، خانوادے اور چاندنی چوک تک ایسی چہل پہل رہتی تھی گویا ہر جگہ سامان تعیش ہو۔عورت اپنے مقصد حیات کے لیے بن سنور کر آتی اور مرد لونڈے بازی کے شوق میں مارے مارے پھرتے۔ان امرد پرستوں میں رجی امرد، میاں ہنگا، درگاہی اور سلطان امرد کے نام قابل ذکر ہیں۔سلطان امرد کی شکل میں دلی کی صورت گری کا احوال ملاحظہ ہو جس کی کم عمری اس عشرت کدے کی زبوں حالی کا ثبوت ہے۔:

سلطان امرد بھی ایک ہے۔سبزہ رنگ اور بارہ سال کی عمر کا۔رقص میں عجیب و غریب ادائیں اور شوخیاں کرتا ہے۔اس کے گانے کی سحر کاریاں ایک دنیا کو مفتون اور خلقت کو مجنون کیے ہوئے ہیں۔۔۔ایک رات صبح تک ہمارے صاحبوں کی محفل کی رونق رہا اور جی بھر کر اس کی صحبت میسر آئی۔ساری رات عشرت و انبساط میں کٹ گئی۔اس کے ساتھ پھر مل بیٹھنے کی حسرت کے کانٹے یاروں کے دلوں میں موجود ہیں۔،،

(خواجہ عبدالحمید یزدانی، ڈاکٹر، مترجم، مرقع دہلی، نواب درگاہ قلی خاں، لاہور:1988،ص 92)

دلی کی معاشرت کی یہ جھلکیاں داستانوی عناصر کی صورت میں نظر آتی ہیں تو حیرت نہیں ہوتی۔

کیونکہ اردو داستان گو نے شعوری یا لاشعوری طور پر چاہے کسی بھی حقیقی یا غیر حقیقی ملک کا نقشہ کھینچا ہو اس کی طبعی جمالیات میں ہندوستانی اور اسلامی تہذیب کی آمیزش اور اس کے تہذیبی جلوے، نقاشی، موسیقی، رقص، فن تعمیر کی جمالیات، زبان و بیان اور اسالیب کی جمالیات کی

سحرانگیزی عام ملتی ہے اس بارے میں پروفیسر شکیل الرحمٰن لکھتے ہیں۔:

,, ہند مغل جمالیات میں داستانی فضا، داستانی رومانیت اور داستانی سحر آفریں واقعات و کردار کی جو اہمیت ہے ہمیں معلوم ہے سنسکرت اور پراکرتوں کی کہانیاں اور عربی و فارسی حکایتیں اور داستان اپنی بے پناہ رومانیت کے ساتھ اسی جمالیت کے پس منظر میں موجود ہیں۔ ہند مغل جمالیات نے شاعری، مصوری، صورتگری، مجسمہ سازی، فن تعمیر اور عوامی گیتوں اور نغموں میں داستانیت کو شدت سے جذب کیا ہے۔،،

(شکیل الرحمٰن پروفیسر، ادب اور جمالیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2011, ص108)

غرض سرشار کے اسلوب میں لکھی گئی اس داستان کا تناظر بھی عرب اور ہندوستانی معاشرت کے تال میل سے مل کر بنا ہے۔ جس میں دو تہذیبوں کا رنگ موجود ہے۔ اگرچہ یہ قصہ خوانی کی روایت سے منسوب ہے لیکن دیگر داستانوں کی طرح اس میں بھی داستان گوئی کے تمام عناصر موجود ہیں۔ جن میں تخیل، منظر نگاری، سراپا نگاری، علامت اور ماورائی دنیا آباد ہے۔ یہ دنیا طلسمات سے شروع نہیں ہوتی بلکہ بالواسطہ اس کا تعلق قصوں کی شکل میں مافوق الفطرت عناصر سے ملتا ہے۔ ایک ہزار ایک رات کی یہ کہانیاں ہندوستان کی تہذیبی جمالیات کی علمبردار ہیں۔ جن میں داستان کے لوازمات اپنے مخصوص اسلوب کی صورت میں واضح ہوتے ہیں۔

احمد سجاد بحیثیت صحافی

ڈاکٹر فرحت جبیں، نیا سرائے، رانچی۔ جھارکھنڈ

سرزمین جھارکھنڈ کا ایک معتبر نام پروفیسر احمد سجاد ہے جو مختلف الجہات شخصیت کی حیثیت رکھتے آپ کی شناخت اردو ادب میں بحیثیت ناقد و محقق سے کی جاتی ہے کثیر تعداد میں شائع شدہ تحقیقی و تنقیدی مقالات و کتب اس کی شاہد ہیں۔ ان کا ایک پہلو اردو صحافت سے بھی منسلک ہے۔ ڈاکٹر احمد سجاد نے صحافت کے میدان میں بھی اپنا مقام بنایا۔ ڈاکٹر احمد سجاد نے اپنا پہلا ادبی رسالہ "ابلاغ ۱۹۸۴ء میں رانچی سے شائع کیا۔ غالباً جولائی۔ اگست کا زمانہ تھا۔ اس کی طباعت اور اجراء سے پہلے موصوف نے اس کی حنابندی کی زبردست تیاری کی ہوگی جبھی اس کی مجلس مشاورت میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری، گوپی چند نارنگ، پروفیسر عبدالقوی دسنوی، ابن فرید اور ڈاکٹر عبدالمغنی شامل ہیں۔ جب کہ اس کے مدیر خود پروفیسر احمد سجاد اور معاون مظفر مہدی تھے نگراں میں سلیمان صادق کا نام درج ہے۔ کتابت محمد حنیف رحمانی نے کی تھی، اب جن کا انتقال ہو چکا ہے لیکن پرانے لوگوں کے مطابق اس زمانہ میں پورے بہار میں ان کی کتابت کی دھوم تھی۔ دفتر، پروفیسر موصوف کے دولت کدہ پر ہی تھا۔ اداریہ موصوف نے "مضراب" کے عنوان سے لکھا تھا، جس میں مندرجات سے متعلق انہوں نے لکھا تھا۔ یہاں نہ صرف یہ کہ قدیم و جدید کی کوئی چھن دیکھا نہیں کھینچی گئی ہے بلکہ ایسے مضامین و مقالات کو بھی جگہ دی گئی ہے، جس سے بہت سے قارئین کی طرح ممکن ہے، مدیر حقیر کو بھی جزوی یا کلی اختلاف ہو۔ ہماری یہ کوشش بھی ہوگی کہ ہر شمارے میں ایسے معروف و مستند ادباء و شعرا کی تحقیقات اور ان کے خصوصی مطالعہ کا بھی اہتمام کیا جائے جنہیں ارادی یا غیر ارادی طور پر آج تک دوسرے رسائل نے یا تو نظر انداز کیا ہے یا دہ اہمیت نہیں دی ہے، جس کے وہ مستحق ہیں، چنانچہ اس شمارے میں پرکاش گاری کی پانچ غزلوں کے خصوصی مطالعہ سے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ بعض مضامین میں تخلیقات کی اہمیت اب اس لئے تاریخی نوعیت کی ہوگئی ہے کہ ان کے مضمون

نگار مضمون حوالہ کر کے خود اللہ کے حوالے ہو گئے، مثلاً جمیل مظہری مرحوم کا مضمون " خیال کی روا اس مضمون کا جواب ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب سے روئے خیال" موصوف کی زندگی میں ہی مکمل کر لیا تھا۔ افسوس کہ ان کی طباعت ان کی زندگی میں نہ ہوسکی۔ اسی طرح محمد حسن عسکری مرحوم کا مضمون " بیسویں صدی کی جدیدیت کا ایک تجزیاتی مطالعہ " ان کے معرکتہ الآرا مقالے کا اہم ترین جز و ہے، جو ان کی زندگی ہی میں حاصل کر لیا گیا تھا۔ یہ مضمون بجا طور پر حسن عسکری مرحوم کے زندگی بھر کے مطالعہ کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے۔ جیلانی کامران اپنے مخصوص نقطہ نظر کے لئے معروف ہیں۔ "ادب اور بنیادی انسانی اقدار" میں انہوں نے جن سوالات کو اٹھایا ہے، وہ یقیناً قابل غور ہیں۔ ضیاء عظیم آبادی نے "عرفان آگہی میں اپنے تخلیقی انداز کار کو جس طرح پیش کیا ہے، اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔ تحقیقی مقالوں میں تذکروں کی تاریخی وادبی اہمیت، بنگلہ دیش کا عصری ادب۔۔ افسانہ "اور " غالب صدی سے اقبال و پریم چند صدی تک اردو تحقیق " اہم ترین مقالے ہیں۔ اس طرح نظم وغزل کی جملہ تخلیقات کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ قارئین کو یہاں بھی مسرت وبصیرت کا وافر سامان ملے گا۔"

احمد سجاد از مہراب (اداریہ) جلد- اشمارہ ا۔ ابلاغ، ششماہی، رانچی - ۱۸۹۱ء ص ۹۶۰۱) اداریہ کو یہ آخری جملہ اس بات کا غماز تو ہے کہ اس کے مدیر کا تعلق تعمیری ادب" کی تحریک سے رہا ہے لیکن پورے ادارے میں احمد سجاد صاحب نے اس کا اعتراف کرنا تو دور اس کی طرف اشارہ تک نہیں کیا، جس کی وجہ سے " ابلاغ " کا اداریہ بھی عام ادبی رسائل جیسا ہی ہو گیا ہے، جس میں انہوں نے ادبی صورت حال کا ذکر کرنا مناسب سمجھا۔ اس میں انہوں نے دو باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

ا۔ موجودہ چلتے ہوئے ادبی نعروں اور گروہوں میں سے کسی کی کھل کر حمایت یا مخالفت نہ کی جائے تو پھر اس کا حشر معلوم۔ (یعنی کسی بھی غیر جانب دار ادبی پرچہ یا رسالہ کا جاری رکھنا ممکن ہی نہیں۔ دراصل آپ کا اشارہ ترقی پسندی اور جدیدیت کے نام پر ہونے والی گروہ بندیوں کی طرف ہے۔ جب کہ یہ حقیقت پوری اردو دنیا جان چکی تھی کہ یہ گروہ بندی اب قصہ پارینہ ہو چکی تھی۔ اب ادیبوں و شاعروں کی ایک بالکل نئی نسل ادب کی کمان سنبھال چکی تھی۔ مشہور ادیب و ناقد گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے:

"نئے افسانے کی موجودہ صورت حال یہ ہے کہ آٹھویں دہے میں نئے لکھنے والوں کی پوری کھیپ

سامنے آچکی ہے۔ احمد یوسف، مسعود اشعر، قمر احسن، شوکت حیات، ظفر اگانوی، حسین الحق، رشید امجد، صغرا مہدی، رضوان احمد علی باقر، شمس الحق عثمانی، حمید سہروردی، سلام بن رزاق، کنور سین، سائرہ ہاشمی، انور قمر، علی امام شفق، انور خان، فیاض رفعت، اکرام باگ، بشیر باگ، سید محمد اشرف، طارق چھتاری، شفیع جاوید، انیس رفیع، انور رشید محمد منشاء یاد، مرزا حامد بیگ، طاہر نقوی اور کئی دوسرے۔ ان میں بعض نام زیادہ نمایاں ہیں، بعض کم، بعض کے مجموعے سامنے آچکے ہیں بعض کے نہیں بعض تخلیقی توانائی سے متصف ہیں، بعض عاری، بعض استعاراتی کہانی کے فن کو جانتے ہیں بعض نہیں۔ بعض کے یہاں جزوی تبدیلیاں نظر آتی ہیں، بعض کے یہاں کچھ بھی نہیں۔ بعض تخلیق کے خارجی اور داخلی رشتوں میں ہم آہنگی اور نئے انسان کے شخصی اور سماجی مسائل کے تئیں بیدار مغزی کے ذہنی کے دعوے دار ہیں، بعض نسجاً خاموش ہیں لیکن یہ تمام لکھنے والے ایک بجھے ہوئے الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، بغاوت کی آگ ٹھنڈی پڑ چکی ہیں۔ ان کے یہاں روایت سے انحراف کا مسئلہ اتنی باغیانہ شدت لئے ہوئے نہیں ہے، جیسا کہ پندرہ بیس سال پہلے تھا، اس لئے ان سے کسی بڑی جست کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔ یوں بھی ہر نئی نسل پچھلی نسل سے انحراف کرتی ہے اور اس سے پہلے کے ادب کی بازیافت کرتی ہے۔ پس چوں کہ پچھلی نسل شدید طور پر باغیانہ تھی، اس لئے ممکن ہے ہے کہ جدید تر نسل کا انحراف کسی نہ کسی اعتدال کی تلاش میں ہوگا۔ اور یہ فطری بھی ہے۔ لیکن جو بات اس وقت تشویش ناک ہے، وہ اوسط درجے کی ذہنی Mediocrit کی یلغار ہے، جس کے باعث علامتی اور تمثیلی کہانی کے مقلدین کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ ان کے ہاتھوں اس کہانی کے مستقبل کو شدید خطرہ درپیش ہے۔ اب علامتی تمثیلی کہانی بھی ایک فیشن بن گئی ہے۔ اور بہت سے لکھنے والوں نے اسے رواجاً اختیار کر رکھا ہے۔ اس سے نئے لکھنے والوں کی تخلیقیت اور نئی کہانی دونوں کو نقصان پہنچا ہے۔"

(گوپی چند نارنگ۔ نیا افسانہ: روایت سے انحراف اور مقلدین کے لئے محمد فکریہ مشمولہ۔ اردو افسانہ، روایت و مسائل۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ ۲۔ دسمبر۔ ۱۹۸۰ء ص ۴۳۷)

یہ وہ صورت حال تھی جو تعمیری ادب کی تبلیغ کے لئے شائد سب سے مناسب تھا، اگر ابلاغ کا ادار یہ موجودہ سیاسی، سماجی، تہذیبی و ادبی صورت حال پر ہوتا اور انسانیت کے تحفظ اور بقا کے لئے ادیب کی ذمہ داریوں کا احساس دلا پاتے تو یہ رسالہ اور اس کے مدیر کے طور پر احمد سجاد

کی شخصیت یاد رکھی جاتی۔ اداریہ پر مزید کچھ لکھنے کے بجائے، ہم اس کے مشمولات پر نظر ڈالتے ہیں، پہلا مضمون مرحوم حسن عسکری صاحب کا ہے حسن عسکری صاحب کا شمار دانشور ناقدین میں کیا جاتا رہا ہے، ان کا اپنا ایک الگ نقطۂ نگاہ تھا، جس سے اختلاف ممکن ہے لیکن اسے آپ نظر انداز نہیں کر سکتے لیکن ہماری مشکل یہ ہے کہ اس کی اشاعت کو تقریباً چالیس سال گذر چکے ہیں، جب کہ جدیدیت پر ہونے والے مطالعات، بذات خود کئی طرح کی تغیرات سے گذر چکے تھے۔ بہر حال حسن عسکری صاحب کے مضمون کی تمہید آج بھی لائق توجہ ہے، میں یہاں اسے پیش کر رہی ہوں:

یہ دور بہت ہی پے چیدہ ہے اور نہایت اہم اہم تو اسلئے ہے کہ مغرب نے اس دور میں موٹر، ہوائی جہاز، ریڈیو ٹیلی ویژن، ایٹم بم، ہائڈروجن بم، مصنوعی سیارے اور اس قبیل کی چیزیں ایجاد کر کے اپنی مادی طاقت کا مظاہرہ کیا ہے اور یہ بھی دکھا دیا ہے کہ مغرب کے پاس نفسانی خواہشات کی تسکین کا کتنا کچھ سامان موجود ہے، ان مظاہروں سے مشرق کا ذہن بھی شدید طور پر متاثر اور مرعوب ہوا ہے اور مشرق بھی بڑی تیزی سے مغرب بنتا جا رہا ہے۔ یہ دور پے چیدہ اس لئے ہے کہ یہ دور نہ تو محض عقل (جزوی) کا دور ہے نہ ہی محض سائنس کا، نہ محض اشترا کیت کا نہ محض بے دینی کا۔ اس دور کی حقیقت یہ ہے کہ سارے رجحانات اور سارے افکار اپنے تضاد کے باوجود، بہ یک وقت موجود ہیں اور ان کے اندر کسی قسم کی درجہ بندی نہیں ہے۔ بلکہ سب کو ایک ہی سطح پر عمل کرنے کی آزادی ہے۔ عموماً ایک ہی شخص کے ذہن میں دو بالکل متضاد رجحان کام کرتے رہتے ہیں، اسے کبھی ایک طرف لے جاتے ہیں کبھی دوسری طرف۔ خود ہمارے یہاں یہ حال ہو گیا ہے کہ علماء گمراہی کی ایک شکل کا مقابلہ کر کے اسے رہاتے ہیں تو ساتھ ہی دوسری شکل نمودار ہو جاتی ہے۔ پھر تیسری، پھر چوتھی۔ مذہب کی مخالفت کا زمانہ دراصل پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء کے ساتھ ختم ہو گیا ہے اور اب جدیدیت کا وہ دور آیا ہے کہ جب جھوٹے دین اور جھوٹی روایتیں ایجاد کی جارہی ہیں اور ہر جھوٹا دین، اصلی دین ہونے کا دعوی کر رہا ہے۔

(محمد حسن عسکری۔ بیسویں صدی کی جدیدیت کا ایک تجزیاتی مطالعہ مشمولہ بخشش ماہی ابلاغ رانچی-۱۸۹۱ء ص ۱۱۶۳۱)

صورت حال میں تبدیلیاں ضرور آئی ہیں لکن بنیادی حقائق اپنی جگہ قائم ہیں،

مغرب نے وقت اور حالات میں جو تبدیلیاں کی ہیں اہل مشرق نے ان کا اس طور اثر قبول کیا ہے اور اسی قدر ہوئے اس سے مرغوب رہے ہیں۔ پروفیسر جیلانی کامران کا مضمون " ادب اور انسانی اقدار " ایک روایتی نوعیت کا ادبی مضمون ہے۔ انسان نے جب سے ساتھ رہنے کی شروعات کی ہے، کچھ نہ کچھ قاعدے باہمی زندگی کو ہموار بنائے رکھنے کے لئے بنتے چلے گئے ہیں۔ یہ گروہ جیسے جیسے مضبوط، یہ قاعدے بھی مضبوط ہوتے چلے گئے۔ جب گروہ کا ہر فرد یا کم از کم ان کی اکثریت ان کا از خود احترام کرنے لگے تو انہیں قدر کی حیثیت حاصل ہوتی چلی جاتی ہے، اپنی خوشیوں، اپنے دکھوں اور خوف کا اظہار کرنے کے لئے ایک اشارتی زبان وجود میں آتی چلی گئی، اور متذکرہ بالا قدریں، ان سے جڑتی چلی گئیں۔ یہ اولین معشرتی قدریں تھیں، جو لوک گیتوں اور لوک کتھاؤں سے جڑ کر ادب کا حصہ بنتی چلی گئیں، روز افزوں سے ایسے افراد بھی معاشرے میں موجود تھے جو خود کو ہر قاعدے سے برتر سمجھتے ہیں۔ نیک اور بد کا تصور یہیں سے عام ہوا اور ان کی آویزشیں بھی، جو بعد کے دنوں میں ہماری مثنونیات وفسانوں کا موضوع بنیں۔حق و باطل کی جنگ میں حق کی فتح اور باطل کی شکست، ان کا اخلاقی سبق ہوتا تھا اور ہر حال میں باطل کے خلاف حق کی جنگ میں انسان کو ہمیشہ حق کا ساتھ دینا چاہئے، یہی بنیادی انسانی قدر ہے۔ باقی کے مضامین اور تخلیقات و تجزیوں اور تبصرات میں بعض بہت اعلی پائے کی ہیں، بعض اوسط اور بعض بس بھرتی کے کل ملا کر یہ ایک اوسط درجہ کا روایتی ادبی پرچہ بن کر رہ گیا ہے۔ ایک استاذ محقق ناقد، دانشور اور سماجی کارکن کے طور پر ان کی شخصیت جو مقام و مرتبہ حاصل ہوا ایک مدیر کی حیثیت– سے "ابلاغ" انہیں اس مقام کا حامل نہیں بنا پایا۔بعض حضرات بتاتے ہیں کہ اس کا دوسرا شمارہ بھی شائع ہوا تھا لیکن وہ مجھے حاصل نہ ہو پایا، جس کے لئے شرمندہ ہوں۔ بعض مجلوں اور رسائل کی ترتیب وتزئین کی ذمہ داری بھی انہوں نے ادا کی ہے، مثلاً، مدرسہ منیر الاسلام کا مجلّہ ایک یادگار ادبی مجلّہ کہا جا سکتا ہے، بہر حال ڈاکٹر احمد سجاد کے ادبی وعلمی سرمائے میں اسے بھی ایک اضافہ کہا جا سکتا ہے۔

دبستان برار کے شاعر

''فصیح اللہ نقیبؔ صاحب کی شاعری کا تحقیقی جائزہ''

محمد انصار حسین محمد حسین

اردو ادب کی تاریخ تقریباً چار صدی پر مشتمل ہے۔جس میں شمالی ہند،جنوبی ہند اور دکن جیسے علاقوں کے نام سرفہرست نظر آتے ہیں۔اردو ادب کی نشونما و ترقی میں ہندوستان کے دیگر علاقوں کا بھی نمایاں کردار رہا ہے ان علاقوں میں وسط ہند سے ریاست مہاراشٹر کے علاقہ برار کا اپنا ایک مقام ہے۔برار کا علاقہ وہ سرسبز و شاداب علاقہ ہے جہاں سے ہمیشہ اردو ادب کی نشونما و آبیاری ہوئی ہے۔اور یہ بڑے بڑے شعرا و ادباء کی جائے پیدائش رہا ہے۔جن کی ادبی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔برار کی تمدنی تاریخ سے متعلق ڈاکٹر سید نشیطؔ لکھتے ہیں۔''وسط ہند میں آباد خطہ برار کی تمدنی تاریخ کے آثار لگ بھگ ایک ہزار قبل مسیح تک پھیلے ہوئے ہیں۔معلوم تاریخ کے مطابق حکومت کندن پور کے زمانے میں برار کی تہذیب و معاشرت کو بڑا فروغ حاصل ہوا تھا۔

(ڈاکٹر سید یحیی نشیطؔ،غزلستان شعرائے برار ص۱۹)

علاقۂ برار کے دیدار فانیؔ،غلام حسین ایلچپوری،باقرؔ،موضوعؔ،عبدالحئی خان سارمؔ، موسویؔ،نواب محمد نامدار جرنیلؔ وغیرہ شعرا کا تعلق ولیؔ،سراجؔ،آبروؔ،مرزا مظہر جاں جاناں کے عہد سے رہا ہے۔شمالی ہند اور جنوبی ہند میں رونما مختلف تحریکوں کا اثر علاقۂ برار کی شاعری پر بھی دکھائی دیتا ہے۔جیسا کہ منظور حسین شورؔ کی شاعری میں علی گڑھ تحریک کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔برار میں عبدالرؤف شاہ پانڈھرکوڑوی کی شاعری میں علی گڑھ تحریک کے فکر و افکار نظر آتے ہیں۔

غرض کے اردو ادب کے ابتدائی زمانے سے آج تک علاقہ برار نے اردو ادب کی ترقی میں اپنا اثاثہ چھوڑا ہے یہاں ولیؔ،میرؔ،غالبؔ کے اثرات بھی ہیں اور مختلف تحریکوں کے

نظریات بھی۔علاقہ برار ایہام گوئی، اصلاح زبان، ترقی پسند تحریک، علی گڑھ تحریک یا حقیقت پسندی سبھی ادبی تحریکات کے اثرات سے مجلّہ دکھائی دیتا ہے۔البتہ جدیدیت کا رنگ کم ہی نظر آتا ہے۔عصر حاضر نے مابعد جدیدیت کا رنگ قبول کیا ہے۔علاقہ برار کے استاذ الاساتذہ فصیح اللہ نقیبؔ کی شاعری میں جدیدیت کی کرنیں نہ صرف علاقہ برار بلکہ برصغیر کو روشن کیے ہوئے ہیں۔

؎ نقیبؔ میں ہے غزل کی رچی بسی خوشبو
ولی کا سلسلہ ارض دکن کا رشتہ ہے

فصیح اللہ خان نقیب ۵/اپریل ۱۹۴۷ء کو مہاراشٹر میں ضلع بلڈانہ کے قصبہ پیپل گاؤں راجہ میں پیدا ہوئے۔ان کے والد محترم کا نام ساجد اللہ خان ہے۔ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی کے سینٹرل اردو مڈل اسکول میں حاصل کی۔مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے آکولہ آ گئے۔یہاں ملٹی پرپز اسکول میں داخلہ لیا۔بعد از ان ناگپور یونیورسٹی سے بی۔اے اور ایم۔اے(اردو/ فارسی) کی ڈگری حاصل کی۔۱۹۶۸ء میں درس وتدریس کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔۱۹۸۳ء میں خان محمد اصغر حسین جونیئر کالج آکولہ میں بطور اردو اور فارسی کے لیکچرر تقرر ہوا۔ ۲۰۰۰ء میں بطور پرنسپل پروموشن ہوا اور ۲۰۰۶ء میں وظیفہ یاب ہوئے۔

کتابوں کے مطالعے اور شاعری سے لطف اندوز ہونے کا شوق بچپن ہی سے اپنے ماموں عبداللطیف خان صاحب سے لگ چکا تھا اور شعری و ادبی نشستوں سے رغبت اسکولی تعلیم کے دوران ہی بڑھتی چلی گئی۔آکولہ میں منعقد ادبی نشستوں اور مشاعروں میں سامع کی حیثیت سے شرکت کرتے رہے۔ادبی محفلوں اور استاد شاعروں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا سلسلہ چلتا رہا اور ان آفتابوں اور مہتابوں کی روشنی میں علمی و ادبی منازل طے کرتے چلے گئے۔پہلی غزل ۱۹۸۴ء میں کہی۔پہلی ہی غزل سے نقیبؔ صاحب کی تخیل
پردازی اور شاعری کا معیار نکل کر سامنے آتا ہے شعر ملاحظہ فرمائیں۔

دلوں میں بغض وحسد کا غبار ہوتا ہے
تو جیب نقد ونظر تار تار ہوتا ہے
زمانے بھر سے شکایت نقیبؔ ہے تم کو
ہٹاؤ، چھوڑو بھی، جانے دو یار ہوتا ہے

سرپرستی کی بات چھڑی ہے تو ناچیز بتانا چاہتا ہے کہ مجھے بھی موصوف کی سرپرستی

میں رہنے کا شرف حاصل ہوا لیکن یہاں صرف یہ بتانا مقصود نہیں ہے بلکہ نقیبؔ صاحب کی اس خوبی کو سامنے لانا چاہتا ہوں جو دوران تعلیم میں نے محسوس کی۔ اکثر مشاہدہ رہا ہے کہ اگر کوئی شخص چاہے کتنا ہی بڑا افسر ہو، تاجر ہو یا کوئی اور پیشے سے منسلک ہو اور ساتھ ہی شاعر ہو تو "شاعر" اس کے پیشے پر غالب ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں شاعر کو بس موقع چاہیے کہ وہ "عرض ہے" کہہ کر شعر سنانے شروع کر دے۔ مجھے یاد ہے کالج کے زمانے میں کبھی دوران تدریس یا تفریحی اوقات میں نقیب صاحب نے کہا ہو کہ "عرض ہے"، ایک شعر سماعت کیجئے، میرا شعر ہے۔ صرف اور صرف پڑھائی پر توجہ دلائی۔ نصاب پڑھاتے وقت یہ عالم ہوتا کہ لفظ کے بال کی کھال نکال کر رکھ دیتے۔ دقیق و بلیغ الفاظ کو سہل کر کے اس طرح پیش کرتے کہ ذہن نشین ہو جاتے۔ کسی بھی موضوع سے متعلق ان کی معلومات مثلِ سمندر ہوتی۔ سینکڑوں طلبہ ان سے مستفید ہوئے۔

آکولہ و قرب و جوار کے کئی نومشق شاعر نقیب صاحب سے اپنے کلام کی اصلاح کرواتے ہیں۔ کئی شعرا ایسے ہیں جو نقیبؔ صاحب کے شاگرد رہے ہیں اور آج خود بطور شاعر معروف ہیں۔ جن میں بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر امیر سرورؔ، ضمیر احمد ضمیرؔ، عرفان ظفرؔ، نعیم فرازؔ، انس نبیلؔ، ارشاد حیدرؔ، معین گوہرؔ، سلیم سحرؔ وغیرہ کا شمار ہے۔ کئی درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔ نقیبؔ صاحب کا مقام ادبی حلقوں میں جید شاعر کا ہے اسی نسبت سے نقیب صاحب استاذ الاساتذہ کے مقام پر فائز ہیں۔ آکولہ و قرب و جوار میں ہونے والی نشستوں اور مشاعروں میں صدر کی حیثیت سے مدعو کیے جاتے ہیں۔ طبیعت اجازت دے نہ دے آپ ادبی محفلوں کو سرد ہونے نہیں دیتے۔ اسی مزاج کا موصوف کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

؎ سخن فہموں کے جذبے سرد پڑتے ہیں نقیب اٹھو
چلو پھر بزم یاران سخن گرمائے دیتے ہیں

نقیب صاحب بیک وقت کامیاب شاعر ہیں اور نثر نگار و تنقید نگار بھی۔ آپ کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا شعری مجموعہ "سپیاں" ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ کلام "اشک موتی کروں" ۲۰۲۱ء میں منظر عام پر آیا۔ مختلف رسائل اور روزناموں میں بھی ان کے کلام شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً انقلاب، اردو ٹائمز، اردو نیوز ممبئی، ایوان اردو، پاکیزہ آنچل، قرطاس، کتاب نما، شگوفہ، اردو میلا وغیرہ۔ نثر میں "ایک شخص ایک شاعر" غنی

اعجاز''ان کا اولین نثری نمونہ ہے۔اس کتاب پر موصول تبصرے اور خطوط پر مشتمل کتاب'' شخص وعکس''۲۰۰۲ء میں مرتب کی۔ ۲۰۱۱ء میں غنی اعجاز صاحب کے کلام کو یکجا کر کے'' ناشنیدہ '' کے نام سے شائع کیا۔ ۲۰۱۵ء میں ضمیر ساجد کی مرتب کردہ کتاب ''غزلستان برار'' میں معاون مرتب کی حیثیت سے نمایاں کردار ادا کیا۔ ۲۰۱۷ء میں نقیب صاحب کی کتاب ''تاثرات'' شائع ہوئی جس میں خاکے اور ادبی مضامین ہیں۔

نقیب صاحب کے شعری مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی قطعات اور فردیات بھی۔آپ نے کئی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔نقیب صاحب کی تخلیقات میں ہر قسم کے موضوع شامل ہیں۔شاعر اپنے اردگرد جو محسوس کرتا ہے، انھی تجربات ومشاہدات کو قلم بند کرتا ہے۔شاعر سماج کا ایک حساس شخص ہوتا ہے جو اپنے احساسات کی ترجمانی اپنی شاعری میں کرتا ہے۔ایک دیانت دار معلم ہونے کے ناتے اور فرض شناس، اصلاحی پہلو نقیب صاحب کی شاعری میں جابجا ملتے ہیں۔نقیب صاحب اپنی شاعری کے ذریعے خلوص، ایثار، اخوت، جذبہ ہمدردی، مساوات اور وسیع القلبی ، ادب و احترام کا سبق دیتے رہے ہیں۔اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

یہ دور وہ نہیں پھر بھی شریف زادوں کے
بزرگ سامنے گر ہوں تو لب نہیں کھلتے

کچھ ہمیں آئے نہ آئے یہ ہنر آتا ہے
ہم ادھڑتے ہوئے رشتوں کو رفو کرتے ہیں

آپ اپنی مثبت سوچ اور اسلاف کی روایت دیرینہ واقدار کو نئی نسل میں منتقل کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔شعر گوئی کے ساتھ شعر فہمی کا یہ عالم ہے کہ دیگر شعرا کے اشعار سے ایسے پہلو نکال کر سامنے لاتے ہیں کہ انھیں بھی اس بات کا علم نہیں ہوتا ہے۔ نومشق باصلاحیت نوجوان شعرا وادبا کی نہ صرف حوصلہ افزائی کرتے ہیں بلکہ تنقید برائے اصلاح بھی کرتے ہیں۔ان کا مقصد ملت کی تربیت واصلاح اور کردار سازی ہے،جس کے مدنظر ایسے شعرا وادبا تیار کرنا ہے جو نقیب صاحب کا نظریہ حیات لے کر چلیں اور سماج میں تحلیل اخلاقی گراوٹ اور جذباتی بے حسی اور دین واسلام سے بے رغبتی کو عوام الناس پر منکشف کر کے اسے اپنی شاعری کے ذریعے کافور کریں۔

؎ جب بھی کہیں غرور کسی سر میں آئے گا
لکھ لیجیے کہ وقت کی ٹھوکر میں آئے گا

شاعری میں غزل کو دیگر اصناف کے مقابل ہمیشہ ہی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اپنے لطیف ترین تجربات واحساسات اور واردات زمانہ کی ترجمانی کے لیے غزل ہی کا سہارا لیا گیا ہے۔نقیب صاحب کے نزدیک بھی غزل کی وہی قدر و قیمت ہے جو اردو ادب میں، شاعری میں ابتدا سے غزل کو رہی ہے۔غزل کی مقبولیت کے تعلق سے خود نقیب صاحب رقم طراز ہیں۔

''غزل کی مقبولیت میں زبان و بیان کی موشگافیوں محرکات آفرینی، محاورات کے برمحل استعمال صنائع بدائع کے سلیقہ مندانہ صرف، قافیہ ردیف کی بے مثال پیوستگی اور ایہام کا وہ کارنامہ ہے جس کے سبب غزل نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھا اور تمام تر مخالفتوں کے باوجود نہ صرف یہ کہ اپنے آپ کو سرسبز وشاداب رکھا بلکہ اپنے قرینے تنوع اور انفرادیت کو ثابت بھی کیا ہے۔'' (اشک موتی کروں، فصیح اللہ نقیب ص ۳۲)
غزل کی پسندیدگی کے تعلق سے نقیبؔ صاحب کہتے ہیں ''غزل میری مرغوب ومحبوب صنف سخن ہے۔'' (سیپیاں، فصیح اللہ نقیب ص ٦)
نقیبؔ صاحب غزل سے متعلق یوں شعر کہتے ہیں۔

؎ غزل ہے رنگ بھی نکہت بھی رعنائی بھی نزہت بھی
شگفتہ گل پہ ہے خوش رنگ تتلی دیکھتے رہنا

غزل کے تعلق سے ان کے فکر وخیال کی کرنیں ان کے کلام سے پھوٹ کر اردو ادب کے وسیع وعریض علاقے پر پڑ رہی ہیں۔اپنے تخلیقی شعور کو خود اپنے شعر میں قلم بند کیا ہے۔

؎ خیال وذہن پہ برسے نقیبؔ موتی سے
غزل میں شعر کی صورت وہ سیپیاں رکھ دیں

نقیب صاحب کے اشعار میں تنوع ہے۔آپ نے عام بول چال کے الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے اور دقیق الفاظ کا بھی۔کہیں آپ کی شاعری عام قاری کی دسترس میں ہے تو کئی اشعار کو سمجھنے کے لیے لغت کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔الفاظ کے رکھ رکھاؤ کے ہنر میں آپ کی مہارت کی دلیل خود آپ کے اشعار ہیں۔قدیم اردو کے الفاظ بھی موصوف نے اپنی شاعری میں

استعمال کر کے دورِ حاضر کو اس سے آشنا کروایا ہے۔

؎ کیوں میرؔ کے ہوتے نہیں اشعار پرانے
بیمار نئے ہیں و لے آزار پرانے

؎ انحرافات ہیں اصولوں کے
اختلافات ان سے ذاتی نئیں

آسان لفظوں میں شعر کہنا مشکل ہے کیونکہ اس میں خیال کا صاف ہونا بہت ضروری ہے آسان لفظوں سے سننے والا مطلب آسانی سے نکال لیتا ہے۔شاعر کے لیے آسان لفظوں میں اپنے خیال کو ظاہر کرنے کے لیے مشکل ہوتی ہے۔ موصوف کو اس ہنر میں مہارت حاصل ہے۔ یہ شعر سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے۔

؎ میری ہر ایک بات چلو جھوٹ ہے نقیبؔ
پر کیا کسی کا سچ بھی تمھاری نظر میں ہے

اس کے برعکس موصوف کے کلام میں اردو کے دقیق و بلیغ الفاظ کا بھی استعمال نفاست و نزاکت کے ساتھ ہنر مندانہ طریقے سے کیا گیا ہے۔شعر کی بلاغت اس کے معانی اور حسن لطافت کو سمجھنے کے لیے بالغ تصور کی ضرورت ہے۔اور زبان پر دسترس کا ہونا بھی ضروری ہے۔تب ہی سامع شاعر کے تخیل تک پہنچ پاتا ہے۔اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

؎ جرعہ جرعہ میں سو سو طرح چہرے بگڑیں
سچ کہو سچ سے زیادہ کوئی کڑوی شے ہے

؎ کس سے پائیں درسِ حمیت، درسِ اخوت، حسن سلوک
کھلنے لگے ہیں قریہ قریہ ویسے تو اسکول بہت

نقیب صاحب علم عروض میں بلا کی مہارت رکھتے ہیں۔شعر سنتے ہی ذہن میں اس کی تقطیع کر کے اس کے صحیح یا غلط ہونے کی سند دے دیتے ہیں۔نقیبؔ صاحب نے بڑے ہی ہنر مندانہ انداز میں نفاست و نزاکت کے ساتھ چھوٹی بحر میں غزلیں کہی ہیں اور طویل بحر میں بھی ۔غرض کے ہر قسم کی بحور میں آپ نے اشعار کہے ہیں۔ چھوٹی بحر کی غزلوں میں موسیقیت اور الفاظ کی تراکیب، گہرائی و گیرائی کے ساتھ کشش بھی موجود ہے۔چھوٹی بحر میں بڑی بات کہنے کا ہنر آپ کو خوب آتا ہے۔اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

؎ دیکھنا آپ کا کوئی دیکھے
ایسے دیکھا لگا نہیں دیکھا
اہل محفل کی بے خودی دیکھی
آپ نے آئنہ نہیں دیکھا

طویل بحر کی غزلوں میں فن کی بالیدگی اور فکر کی بلندی نظر آتی ہے۔طویل بحر میں خیال کی وسعت، الفاظ کا انتخاب،موسیقیت کا خیال، غزل سرائی کی صفت،علم عروض کی جھلک،وزن،ردیف وقافیہ،شعر کا حسن ونزاکت،شعری معنویت مزین کرنا یہ اوصاف استاد ہی کے ہو سکتے ہیں۔اور بلا شبہ استاذ الاساتذہ نقیبؔ صاحب ان اوصاف سے متصف ہیں۔اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

؎ سسکیوں پر تبسم رکھوں رول کر تلخیوں میں حلاوت کا ست گھول کر
دو گھڑی بزم یاراں میں ہنس بول کر چھیڑ خانی کروں زندگانی کروں

؎ نہ تو کوئی مرا ہم رشتہ نہ کسی سے میں ہم رشتہ ہوں
کسی صحرا کی ہوں اذان میں کسی گنبد کی میں صدا ہوں

؎ رخِ زرد پہ کرب جما تھا وہ کہ بزم میں بھی تنہا تھا
میں نے جو پوچھا کون ہو بھائی تو وہ بولا آئینہ ہوں

شوکت الفاظ،مضمون کی جدت،سنگ لاخ زمین، ردیف وقوافی کا برمحل استعمال ،نادر تشبیہات ، عمدہ استعارے اور جدید تراکیب ان کی زبان و بیان پر قدرت کا بین ثبوت ہے۔نقیبؔ صاحب کی شاعری سے متعلق نور احمد نورؔ پاتوری لکھتے ہیں کہ۔۔۔

”نقیبؔ مستند شاعر ہیں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتے ہیں۔اشعار کے ہر مصرعے، ہر لفظ کو ناپ تول کر استعمال کرتے ہیں۔“(عکس وشخص،ص۹۹)

اس ضمن میں نقیبؔ صاحب کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

؎ مہ جبیں ہیں انھیں بندیا کی ضرورت کیا ہے
کیوں وہ مہتاب پہ مہتاب لیے پھرتے ہیں

؎ ناخنوں سے پہاڑ کھودیں گے
جانے یہ لوگ کس صدی کے ہیں

نقیب صاحب کے شعری میلان کے تعلق سے پروفیسر ڈاکٹر زینت اللہ جاوید لکھتے ہیں۔ ''نقیب کا شعری میلان عرفان حق، شعور ذات، شعور کائنات، انسانیت پسندی، دردمندی اور جمالیاتی احساسات کے انعکاس سے مزین ہے۔ان کی فکری خصوصیات میں ماضی کی یادیں، روشن مستقبل کی بشارت، کرب و اضطراب و کیف و انبساط میں بدل دینے کی صلاحیت، مایوسی اور افسردہ دلی میں امید و رجائیت، آشوب واندوہ کے ماحول میں زندہ رہنے کا حوصلہ نمایاں ہے۔'' (''اشک موتی کروں'' ص ۱۵)

نقیب صاحب کی تخلیقات کے موضوعات کی بھلے ہی طویل فہرست ہے لیکن ان کے کلام کا بیشتر حصہ زندگی اور عکس دوراں کی ترجمانی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان اشعار سے ان کا نظریہ ادب ''ادب برائے زندگی'' کا قائل ہونا معلوم ہوتا ہے ان کی نظر میں ادب کی قدر و قیمت تفریحی نہیں بلکہ تعمیری ہے۔

؎ عکس دوراں نقیب کی غزلیں
سلسلے چند ربط و یابس کے

؎ خار ریشم کروں، آگ شبنم کروں، اشک موتی کروں، خون پانی کروں
نظم کے گام پر، یا غزل نام پر، زندگانی تری ترجمانی کروں

نقیب صاحب کی شاعری بنیادی طور پر انسانی جذبات واحساسات کی شاعری ہے جس سے سماج کو روشنی اور تابندگی ملتی ہے۔ ایک حساس شاعر زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا مطالعہ و مشاہدہ کرتا ہے، ان عوامل کے ہونے والے نتائج کو دیکھتا اور پرکھتا ہے اور سماج کے سامنے ان کے متوقع مثبت اور منفی اثرات کو اپنی شاعری کے ذریعے پیش کرتا ہے تا کہ سماج منفی اثرات سے بچ سکے۔ نقیب صاحب کی شاعری انسانی فطرت کی بہت بڑی نباض اور زمانہ شناس ہے۔ موصوف زندگی کے دکھ درد اور مسائل نہ صرف سمجھتے ہیں بلکہ اپنے اندر جذب کر کے انہیں پیکرِ شعری میں ڈھالنے کی قوت بھی رکھتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے شاعری کے حسن و کمال اور فن کا بھی باریکی سے خیال رکھتے ہیں۔ نقیب صاحب خود کہتے ہیں۔

؎ غزل کا حسن بھی قائم رہے پیغام بھی پہنچے
ادھر بھی دیکھتے رہنا ادھر بھی دیکھتے رہنا

غرض کہ آرزو ہو یا حسرت، شوخی ہو یا متانت، فلسفہ ہو یا اخلاق، غم عشق ہو یا غم

روزگار، فکر کی گہرائی ہو یا مضمون کی گیرائی، سادگی ہو کہ چالاکی، بے خودی ہو یا ہوشیاری، ذکر قناعت ہو یا فکر عاقبت، احباب کا غم ہو کہ اعزا کا ماتم، وفا کا ذکر ہو کہ جفا کا افسوس سب نقیب صاحب کی شاعری میں مقید ہیں۔ یہ ان کی شاعری کا وصف ہے کہ ان کا کلام ہر دور سے مطابقت رکھتا ہے اور خوابیدہ قوموں کے لئے زندگی کا پیغام بنتا ہے۔ شعروسخن میں فنی معراج پر فائز ہونے کے باوجود عجز و انکسار اور خاکساری کا یہ عالم ہے کہ اپنی شعرگوئی کے تعلق سے خود رقم طراز ہیں کہ۔۔۔

ے صحبتِ اہلِ فن میرا مقصد نقیبؔ
شعرگوئی تو ہے اک بہانہ مرا
ے طفل مکتب کے سوا کیا ہے مری حیثیت
چاہنے والے محبت میں غلو کرتے ہیں

حوالہ جات

۱) سیپیاں، اگست ۱۹۹۴ء، فصیح اللہ نقیب
۲) شخص و عکس، ۲۰۰۲ء، فصیح اللہ نقیب
۳) تاثرات، مارچ ۲۰۱۷ء، فصیح اللہ نقیبؔ
۴) غزلستان برار، فروری ۲۰۱۵ء ضمیر ساجد
۵) اشک موتی کروں، دسمبر ۲۰۲۱ء، فصیح اللہ نقیب
۶) ''ایک شخص ایک شاعر، غنی اعجاز''، فصیح اللہ نقیب

MOHAMMAD ANSAR HUSIAN MOHAMMAD HUSAIN

Research Scholar (Amravati University,MH)

ANSAR COLONY MUZAFFAR NAGAR AKOLA

AT POST AKOLA 444001 (MAHARASHTRA)

MOBILE NO. 8149872006

EMAIL:- ansarhusain2010@gmail.com

مسدس: فنی لوازم اور ارتقائی سفر

حافظ سید جنید قادری

(پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر شعبہ اردو کے۔بی۔این۔یونیورسٹی گلبرگہ کرناٹک)

اردو شاعری دو بڑی صنفوں میں منقسم ہے، غزل۔نظم اور قسمِ ثانی یعنی 'نظم' اردو شاعری کی وہ قسم ہے جو تسلسل و تفکر کے سبب وسعت کی حامل صنفِ سخن بنی ہو ئی ہے۔نظم میں کوئی قصہ، واقعہ یا خیال کو تسلسل کے ساتھ پیش کیا جا تا ہے کیونکہ نظم کے لغوی معنی ہی پر و نے اور یکجا کر نے کے ہے۔بطورِ ہئیت اور موضوع اسکا دامن وسیع ہے۔وہ اقسام جنھیں ادبائے اردو نے نظم کے زمرے میں شامل کیا ہے۔

1 فارسی روایت سے متعلقہ اصناف مثلاً قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی، مستزاد، مسمط، ترکیب بند اور ترجیع بند وغیرہ۔

2 موضوع کے اعتبار سے مذہبی۔تہذیبی اور سماجی افکار کو نمایاں کرنے والی اقسامِ شاعری مثلاً سلام، مرثیہ، واسوخت، شہرِ آشوب، سہرا، شادی نامہ وغیرہ۔

3 ہندی روایت سے متعلق اصناف مثلاً گیت، بارہ ماسہ وغیرہ۔

4 غیر ملکی زبانوں کے اثرات کو نمایاں کرنے والی اصناف مثلاً ترائیلے، سانٹ، ہائیکو وغیرہ

5 جدید اصناف کے تحت آنیوالی قسمیں مثلاً نظمِ معریٰ، آزاد نظم، نثری نظم وغیرہ۔

نظم کے اصناف میں سب سے وسیع اصطلاحی صنف 'مسمط' ہے۔مسمط عربی لفظ ہے جس کا مادہ 'سمط' ہے اور یہ اسمِ مفعول ہے تسمیط کا باب تفعیل کے وزن پر۔عربی لغت میں 'السمط' کے لغوی معنی یہ بتائے گئے ہیں؛ وہ لڑی جسمیں مہرہ یا موتی پروے ہوئے ہوں، زین کا تسمہ جس سے کوئی چیز لٹکائی جائے ۔مصباح اللغات میں یوں بیان کیا گیا ہے 'المسمط من

الشعر .وہ شعر جو اجزاء عروضیہ پر ہو اور قافیہ کے حروف روی کے علاوہ دوسرے قافیہ پر ہو۔(1)

اصطلاحی معنی :اصطلاح شعر میں ایک ایسی نظم ہے جو بہ لحاظِ ہئیت مختلف بندوں پر مشتمل ہوتی ہے چونکہ مسمط کی ہر ہئیت میں مقررہ مصرعوں کو ایک لڑی میں پرو کر بند کی شکل دی جاتی ہے اسی لیے اسکو مسمط کا نام دیا گیا ہے۔(2)

مسمط کے بندِ اول کے تمام مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور دوسرے بند سے تمام بندوں میں یہ التزام رکھا جاتا ہے کہ ابتدائی مصرعے دیگر قافیوں میں اور آخری مصرع بندِ اول کے قافیوں کی پابندی کرتا ہوا سے ٹیپ کا مصرع کہتے ہیں ۔مصرعوں کی تعداد کے لحاظ سے اس کی آٹھ قسمیں ہیں

تین مصرعوں کا بند: مثلث: TRIPLET

چار مصرعوں کا بند: مربع QUATERNION

پانچ مصرعوں کا بند: مخمس QUINTET

چھ مصرعوں کا بند: مسدس SESTINA

سات مصرعوں کا بند: مسبع RHYME ROYAL

آٹھ مصرعوں کا بند: مثمن OCTAVE

نو مصرعوں کا بند: متسع SPENSERIAN STANZA

دس مصرعوں کا بند: معشر ETHEREE (3)

مسمط کے تشکیلی نظام سے متعلق شمیم احمد :درسِ بلاغت: میں اپنے مضمون اقسامِ شعر میں لکھتے ہیں:

"اس کا تشکیلی نظام یہ ہے کہ تمام بند کے سارے مصرعے آخری مصرع کے سوا ھم قافیہ ہوں تمام بندوں کے آخری مصرعوں کا قافیہ پہلے بند کے آخری مصرع کا ھم قافیہ ہو. ہر بند کے قافیے مختلف ہوتے ہیں تاہم ان کے آخری مصرعے پہلے بند کے آخری مصرعے کے ہم قافیہ ہونے کی وجہ سے پوری نظم [یا تمام بندوں] کو

ایک رشتے میں پرو دیتے ہیں جس سے نظم میں معنوی ربط اور آہنگ برقرار رہتا ہے،مسمط میں تمام بندوں کے آخری مصرعوں کا پہلے بند کے آخری

مصرعے کا ہم قافیہ ہونا ایک قدیم روایت ہے جسے یقیناً بعد میں بھی برتا گیا
لیکن وقت کے ساتھ ساتھ شعری ہیئتوں میں جونت نئے تجربے ہوتے رہے
ان کی وجہ سے اس نظام میں بھی تبدیلی آتی رہی اور بعد کے بندوں کے آخری
مصرعے پہلے بند کے آخری مصرعوں کے قافیائی نظام کے تابع نہیں رہے''
(4)

مسمط کے اصول فارسی اور عربی سے اردو میں ترویج پائے ہیں مگر جدید شعراء نے روایتی اصولوں سے انحراف کرتے ہوئے مختلف ہیئتی تجربے کئے ہیں ان تجربات کی روشنی میں شمیم احمد نے مسمط اور انگریزی کی اسٹینز انظموں کا تقابلی جائزہ لیا ہے اور دونوں میں مماثلت کی نشاندہی کی ہے۔

تعریفِ مسدّس:

مسدس کے لغوی معنی: عربی زبان میں السُدُس اور السُدُس چھٹے حصے کو کہتے ہیں یہ عدد ترتیبی ہے.اور تسدیس چھ پہل بنانیکے عمل کو جبکہ: ''مسدّس'' شش پہل کو کہا جاتا ہے۔

۔وہ سطح جو چھ باہم برابر ضلعوں سے گھری ہو۔
۔وہ ریوالور جسمیں چھ کارتوس ہوتے ہوں۔

مسدس مفعول ہے بابِ تفعیل کا یہ مفرد لفظ ہے جس کی جمع مسدسات آتی ہے۔'معجم اللغۃ العربیۃ المعاصرۃ' میں مسدس کی تعریف اس طرح کی گئی ہے.: وہ شعری بیت جس کی بناء چھ اجزاء پر مشتمل ہو: (5)

مسدس کے اصطلاحی معنی: مسدس اس نظم کو کہتے ہیں جو چھ چھ مصرعوں کے بندوں کی شکل میں لکھی جائے پہلے بند کے تمام مصرعے ھم قافیہ ہوتے ہیں بعد میں آنیوالے ہر بند کے پہلے پانچ مصرعے الگ قافیہ رکھتے ہیں یعنی آپس میں متحد القوافی ہوتے ہیں اور چھٹا مصرع پہلے بند کے ساتھ ھم قافیہ ہوتا ہے۔ (6)

مسدس کی تعریف میں برج موہن دتاتریہ کیفی اپنی تصنیف کیفیہ میں لکھتے ہیں:

''اس میں چار مصرعے
جو بند کے مصرعے کہلاتے ہیں ھم قافیہ

ہوتے ہیں

پھر ایک مطلع دوسرے

قافیے میں ہوتا ہے جسے ٹیپ کہتے

ہیں'' (7)

مسدس کی تکنیک ہئیت و فن :- مسدس مسمط کی تمام ہیئتوں میں سب سے زیادہ مستعمل رہی ہے اردو شاعری میں اسے زیادہ مقبولیت حاصل ہے اور بہت سے شاعروں نے اس میں طبع آزمائی کی ہے مگر مسمط کے روایتی اصولِ قافیہ سے کچھ فرق کے ساتھ۔ مسدس کی ہئیت کے متعلق کیفی صاحب کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

''مسدس کے بارے میں دو باتوں کا دھیان رکھنا لازم ہے. ا.ٹیپ کی بیت کا قافیہ اور ردیف بند کے مصرعوں کے قافیہ اور ردیف سے جداگانہ ہونے چاہئے اور یہ کہ اگلے بند کے مصرعے اسی قافیہ ردیف میں نہ ہوں جس میں پچھلے بند کی ٹیپ تھی یہاں تنوع ہی میں حسن ادا لطف دیتا ہے ۲.معنی کے اعتبار سے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ بند کے جو چار مصرعے ہوتے ہیں وہ یا تو آپس میں برابر کے ہوں، بالکل تلے ہوئے یا دوسرا پہلے پر ترقی کرتا ہو اور چوتھا تیسرے پر اور ٹیپ یا تو چوتھے مصرعے کے تسلسل میں ہو یا سارے بند کا منتہائے ارتقاء ہو'' (8)

مسمط کے روایتی اصول قافیہ کے مطابق مسدس کے قافیوں کی وضع اس طرح ہوتی ہے۔

الف ۔ الف

الف ۔ الف

الف

الف

خطا کار سے درگزر کرنے والا بداندیش کے دل میں گھر کرنے والا

مفاسد کا زیروزبر کرنے والا قبائل کو شیر وشکر کرنے والا

اتر کر حرا سے سُوئے قوم آیا

اور ایک نسخہء کیمیا ساتھ لایا

ب - ب

ب - ب

ب

الف\د

ظالموں نے کر کے قتل بے سبب شاہِ دینؑ کا سر کیا نیزے پہ جب

دیکھ مشغول تلاوت اس کے لب ہو رہے اکثر تو حیران گر عجب

بول اٹھے بعضے لعین بے ادب

از جدا ئیا شکا یت می کند

مگر شعرائے اردو کی وضع کردہ قافیائی وضع جو بقول پروفیسر حمید اللہ ہاشمی ''یہ بڑی مفید اور کار آمد ایجاد ہے اور قوافی کی ترتیب میں ردو بدل کر کے مسدس کو طولانی اور مسلسل مضامین کی ادائی کے قابل بنا دیا ہے''۔(9)

عام طور پر 'مسدس' میں قوافی کی ترتیب اس طرح ہوتی ہے :اول چار مصرع ہم قافیہ پھر دو مصرعے مقفٰے اسی طرح دوسرے بند کے چار مصرعے مقفٰے اور پھر دو مصرعے ھم قافیہ.

الف - الف

الف - الف

ب

ب

الغرض وہ نورِ پاک حضرت خیرالوریٰ شمس کے مانند برجِ حمل میں آ گیا

شام مثلِ صبح گھر سے آپکے روشن ہوا بلکہ تھی ساری زمین اسوقت واں چہرہ نما

ہونہ کیونکر روشنی تھی آمدِ عالیجنابﷺ

صبح صادق چاہئے قبل طلوع آفتابؒ

ج - ج

ج - ج

د

د

اردو میں مسدس کی یہ شکل بہت رائج ہے۔مسدس مدو جزر اسلام۔شکوہ جواب شکوہ وغیرہ مشہور منظومات اسی طرز میں لکھے گئے ہیں اسکے علاوہ دیگر قافیائی تجربوں کی تفصیل پروفیسر گیان چند نے ادبی اصناف میں دی ہے۔مسدس کی تمام ہیئتوں اوراصولوں میں ترتیب بند و ترجیع بند کی تکنیک اپنائی جاتی ہے انہیں ترکیب بند مسدس / ترجیع بند مسدس کہا جاتا ہے اس ضمن میں صاحبِ کشّاف تنقیدی اصطلاحات لکھتے ہیں:

''اردو شاعروں نے مسدس کے نظامِ قوافی میں ایک ایسا تغیر کیا ہے جو اردو شاعری کو بہت راس آیا ہے چنانچہ مسدس کی مذکورہ شکل تو خال خال ہی نظر آتی ہے مگر اس بدلی ہوئی ہئیت میں ہماری شاعری کا نہایت قیمتی سرمایہ موجود ہے اس بدلی ہوئی ہئیت میں پہلے چار مصرے متحد القوافی کہے جاتے ہیں اور پھر دو مصرے الگ قافیے میں بصورتِ بیت مصرع کہکر ان کے ساتھ اضافہ کر دیے جاتے ہیں اور اس طرح چھ مصرعوں کا ایک بند مکمل ہو جاتا ہے اس صورت میں کوئی بھی بند اپنے کسی قافیے کے لیے کسی دوسرے بند کا محتاج یا تابع نہیں ہوتا دراصل اس قسم کی مسدس کو مسدس ترکیب بند کہنا مناسب ہے ۔مسدس کی صحیح ہئیت میں زیادہ بند نہیں کہے جاسکتے کیونکہ تمام بندوں کے چھ مصرے ھم قافیہ ہونے لازم ہیں جبکہ مسدس ترکیب بند میں زیادہ سے زیادہ بند لکھنے کی گنجائش موجود ہے کیونکہ ہر بند اپنے قوافی کے اعتبار سے دوسرے بند سے آزاد ہوتا ہے اردو میں مسدس ترکیب بند کی شکل ہی زیادہ متعارف ہے اس ہئیت میں چھ مصرعوں کا ہر بند اگر چہ ایک معنوی وحدت رکھتا ہے مگر قوافی کے اعتبار سے دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے پہلے چار مصرے ایک قافیہ میں اور بعد کے دو مصرے الگ قافیے میں'' (10)

اسمیں قافیوں کی وضع اس طرح ہوتی ہے:

الف الف الف الف ب ب / ج ج ج ج ب ب

سودا کا مرثیہ 'حضرتِ قاسمؑ' میں مسدس ترکیب بند کی یہی وضع اختیار کی گئی ہے۔

شہداء کربلا کے مراثی کا بیشتر حصہ مسدس ترکیب بند ہی کی شکل میں لکھا گیا ہے واسوخت مسدس ترکیب بند ہی کی شکل میں لکھا جاتا ہے .چند مشہور مسدسات جو ترکیب بند کی شکل میں لکھے گئے ۔جن میں حالی کا ''مسدس مدو جزر اسلام''،انیس و دبیر کے اکثر مراثی اور امانت لکھنوی کے واسوخت وغیرہ شامل ہیں ۔بقول صاحبِ کشاف تنقیدی اصطلاحات:

''علامہ اقبال کو شروع شروع میں مسدس ترکیب بند سے بہت زیادہ دلچسپی تھی اس دور میں انہوں نے ہمالہ،گل رنگین، عہدِ طفلی،مرزا غالب،ابرِ کوہسار،آفتابِ صبح،

موجِ دریا،اور نالہِ فراق جیسی مشہور
نظمیں مسدس ترکیب بند کی ہی شکل
میں لکھی''(11)

مسدس میں 'مصرع ترجیع' نظم کے طاق و جفت بندوں کے لحاظ سے ترتیب دیے گئے ہیں بندِ اول کا چھٹا مصرع' مصرعِ ترجیع نظم کے طاق بندوں میں یعنی اول،سوم،پنجم بند میں دہرایا گیا اور دوسرے بند کا چھٹا مصرع پہلے بند کے قافیوں سے نسبت رکھتے ہوئے علیحدہ 'مصرع ترجیع' لایا جاتا ہے اور نظم کے جفت بندوں چہارم،ششم،ہشتم بند میں چھٹا مصرع لایا جاتا ہے ۔سودا کا 'مرثیہِ مسدس' اسی طرز پر لکھا گیا ہے.۔اس ضمن میں افضل حسین کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

''کئی بند کی ایسی نظمیں جن کے ہر بند میں زیادہ سے زیادہ دس اشعار غزل کی طرح مع مطلع ھم قافیہ لکھ کر ٹیپ کا ایک شعر یا مصرع بطورِ گرہ لکھتے ہیں اگر ٹیپ کا شعر یا مصرع ہر بند میں مختلف آئے تو ترکیب بند مثلاً طلوعِ اسلام. اگر مکرر آئے تو ترجیع بند مثلاً بنجارہ نامہ'' (12)

مسدس کے لیے بحر و اوزان کی کوئی قید نہیں مگر مترنم اوزان استعمال کیے جاتے ہیں تا کہ محافلِ مرثیہ خوانی میں گایا جا سکے اور بسا اوقات مواد کے تقاضے کے مطابق اوزان ایسے اختیار کیے جاتے ہیں جو زیادہ رواں دواں نہ ہوں ۔مسدس کے متعلق صاحبِ کشاّف حامد اللہ افسر کے حوالے سے اس طرح لکھتے ہیں:

'' یہ وہ صنفِ سخن ہے کہ جس میں اردو شاعری کا بہترین حصہ محفوظ ہے صرف اپنے مسدس کے بھروسے ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہماری زبان نے بھی دنیا

کے گنجینۂ خیالات میں اضافہ کیا ہے اور ہماری زبان کی شاعری بھی متعدد ایسی نظمیں پیش کر سکتی ہے جو دنیا کی مستند ترین اور اعلیٰ ترین نظموں کے پہلو بہ پہلو جگہ پانے کے لائق ہے'' (13)

ساحل احمد نے اپنی تصنیف 'اردو نظم اور اسکی قسمیں' میں حامد اللہ افسر میرٹھی کی تصنیف نقدالادب کے حوالے سے مسدس کے بارے میں کچھ اس طرح لکھا ہے:

'' اردو میں جس قدر اصناف رائج ہیں ان میں سے کسی مضامین عالیہ کا اتنا وافر ذخیرہ موجود نہیں جتنا مسدس میں ہے'' (14)

مسدس کی ہئیت اردو شاعری میں زیادہ تر مرثیے کے لیے استعمال ہوئی ہے اور ایک عام تاثر یہ پایا جاتا ہیکہ مرثیے کے لیے مسدس کی جو ہئیت مخصوص ہوئی اس کی ابتدا سودا سے ہوئی بقول پروفیسر نورالحسن نقوی:

''سودا نے مسدس کو سب سے پہلے
مرثیے کے لیے استعمال کیا اور میر ضمیر
کی کوشش سے ایسا رواج ہوا کہ مرثیے
مسدس کی شکل میں کہے جانے لگے''
(15)

مگر شمیم احمد نے اس بات کا رد کیا ہے کہ یہ خیال درست نہیں کیونکہ اس سے قبل دکنی دور کی شاعری میں بالخصوص، احمد، کے ہاں مرثیوں کے لیے مسدس کی ہئیت ملتی ہے۔ (16)

حوالہ جات:

1 ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاوی مصباح اللغات ص396
2 ساحل احمد اردو نظم اور اسکی قسمیں ص30
3 ایضاً

4	شمیم احمد	درسِ بلاغت	155
5	لوئس مالوف	المنجد	ص327
6	ابوالاعجاز صدیقی	کشّاف تنقیدی اصطلاحات	ص174
7	برجموہن دتاتریہ کیفی	کیفیہ	ص298
8	ایضاً		
9	پروفیسر حمید اللہ ہاشمی	فنِ شعروشاعری اور روحِ بلاغت	ص206تا208
10	ابوالاعجاز صدیقی	کشّاف تنقیدی اصطلاحات	ص174
11	ایضاً		ص175
12	افضل حسین ایم اے ایل ٹی	تعمیری ادب نظم	ص16
13	ابوالاعجاز صدیقی	کشّاف تنقیدی اصطلاحات	ص174
14	ساحل احمد	اردو نظم اور اسکی قسمیں	ص33
15	پروفیسر نورالحسن نقوی	تاریخ ادب اردو	ص52
16	شمیم احمد	درسِ بلاغت	ص149

'قمر جمالی' کے رپورتاژ

ڈاکٹر نسرین صدیقہ (تلنگانہ)

قمر جمالی کا شمار اردو ادب کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی پیدائش 2 / اپریل / 1950ء کو حیدرآباد میں ہوئی۔ ان کے والد محمد جمال شریف اور والدہ افضل بی بی ہیں۔ انہوں نے 1964ء کو گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ اسی دوران یعنی ہائی اسکول طالب علمی کے دوران ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ گھر کی بڑی بیٹی ہونے کے ناطے گھریلو ذمہ داری قمر جمالی کے کاندھوں پر آ گئی۔ ان مشکل حالات کے باوجود انہوں نے بی۔اے اکنامکس، اور ایم۔اے انگریزی عثمانیہ یونی ورسٹی سے کامیاب کیا۔ یونیورسٹی ایم۔اے میں داخلہ لیا ہی تھا کہ محکمہ مالگزاری میں ملازمت مل گئی لیکن انہوں نے تعلیم کو جاری رکھا۔ عثمانیہ یونی ورسٹی سے ایم۔اے انگریزی کامیاب کیا اور بحیثیت جونیئر اسسٹنٹ ملازمت میں داخل ہوگئیں۔ محکمہ مالگزاری میں ترقی ہوتی رہی۔ پورے 31 اکتیس برس اپنی خدمات انجام دیتی ہوئی 2006ء کو بحیثیت تحصیلدار ملازمت سے سبکدوش ہوئیں۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ایم۔اے فارسی 2008ء میں عثمانیہ یونی ورسٹی سے کامیاب کیا۔ اور اسی سال خانگی JUNIOR COLLEGE NOESIS، ٹولی چوکی' حیدرآباد میں بحیثیتِ صدر مدرس (پرنسپل) دو سال اپنی خدمات انجام دیں۔ 2010ء میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے ملازمت سے استعفی دے دیا۔

قمر جمالی کے ادبی سفر کی ابتداء طالب علمی کے زمانے ہی میں ہوگئی۔ ان کی پہلی کہانی "اے چاند چھپ نہ جانا" ہے۔ جو رسالہ 'روداد حیات' میں شائع ہوئی۔ ان کی باضابطہ ادبی زندگی کا آغاز کہانی "فاصلے مٹ گئے" سے ہوا۔ جو 1969ء میں ماہنامہ بیسویں صدی میں شائع ہوا۔ افسانہ نگاری کی طرف باقاعدگی سے توجہ دینے لگی اور کئی افسانے قلم بند کئے۔ جو ہندوستان کے سبھی معتبر اخبار و رسائل میں اور پاکستان کے منشور، بادباں اور سخنور میں چھپ چکے ہیں۔ نہ صرف افسانہ بلکہ انہوں نے اردو ادب کے تقریباً نثری اصناف میں طبع آزمائی کی

لیکن بنیادی طور پر افسانہ نگار کی حیثیت سے معروف رہیں ہیں۔ان کی کئی تصانیف منظرعام پر آکر داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔جن میں ' شبیہ'،'سبوچہ'، ' سحاب'، ' زہاب'، ' سنگریزے'، 'انعکاس'، ' آتش دان'، 'صحرا بکف اورنواحہ ادب وغیرہ شامل ہیں۔ان کے افسانوی مجموعوں شبیہ، سبوچہ، سحاب ، زہاب اور سنگریزے (ریڈیوڈرامے) کو اردو اکادمی آندھر پردیش کی جانب سے انعام سے نوازہ گیا۔

قمر جمالی نہ صرف افسانے ، ناول لکھے بلکہ،تبصرے ،مضامین، خاکہ، انشائیہ اور رپورتاژ نگاری جیسی غیر افسانوی اصناف پر بھی طبع آزمائی کی ہیں۔قمر جمالی حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد میں منعقد ہونے والے سمینار ا ادبی جلسوں ، کانفرنسوں اور کتاب کی رسم اجراء وغیرہ جیسے جلسوں میں شرکت کرتی رہتی ہیں۔ اسی شرکت کا ثمرہ قمر جمالی کے رپورتاژ ہیں۔ ان رپورتاژوں کے عناوین درجہ ذیل ہیں۔

(ا) جلسہ تقسیم ایوارڈ، آل انڈیا میرا اکادمی، لکھنو۔1964ء

(2) بڑودہ ا گجرات میں " عورت ، مذہب اور سیاست پر بین ریاستی سہ یومی سیمنار - حیدرآباد سے نومندوبین کی شرکت۔

(3) تقریب رسم اجراء " سنگ اٹھایا تھا " ،مصنف محمود حامد زیر اہتمام، تناظر پبلیکیشنز، حیدر آباد۔اے۔پی۔

(4) ادارہ اسمیتا ، (حیدرآباد) کے زیر اہتمام،خواتین پر تقسیم ہند کے اثرات پر محترمہ ریتومین کا لکچر

(5) گنبدانِ شاہی میں یوم قلی قطب شاہ، انتالیسواں جشن آنکھوں دیکھا حال۔

(6) دکنی زبان پر جنوبی ہند کے زبانوں کے اثرات کل ہند سمینار: مدھیہ پردیش، کیرل، بنگلور اور مہارشٹرا سے نمائندگی۔

(7) مسلمانوں کے سماجی ، سیاسی اور معاشی مسائل کی یکسوئی، تعلیمی پسماندگی اور اقتدار سے بے دخلی،حکومت کی مشنری میں صفرنمائندگی۔وجوہات کی تلاش وتجاویز۔

مندرجہ بالا سات رپورتاژ جن میں ادبی اور غیر ادبی (سیمنار اور کانفرنس) دونوں شامل ہیں۔ان سات رپورتاژوں میں تین رپورتاژ خواتین کے مسائل پر مبنی ہے۔ان غیر ادبی رپورتاژوں کے علاوہ ان میں چار ادبی رپوررتاژ بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ان رپورتاژوں میں

ادبی اجلاس، ادبی اشخاص کے علاوہ ادبی اداروں کا بھی ذکر ملتا ہے۔

(۱) جلسہ تقسیم ایوارڈز، آل انڈیا میرا کادمی، لکھنؤ:

جلسہ تقسیم ایوارڈ آل انڈیا میر اکادمی کی جانب سے 6/اپریل 1997ء کو لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس جلسے کا انعقاد بہ مقام مقبول لاری منزل میں عمل میں آیا۔ اس جلسے کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ جلسہ دو حصوں میں منقسم تھا۔ یعنی مقبول لاری منزل کے سبزازار حصے میں خواتین کی محفل اور بیرون حصے میں مردانی محفل میں منقسم تھا۔ یہ دونوں اجلاس بیک وقت شروع ہوئے اور بیک وقت اختتام کو پہنچے۔ زنانی جلسے کی صدارت فاطمہ عالم علی اور صبیحہ ناز نے کی جبکہ مردانہ جلسے کی صدارت مقبول احمد لاری نے کی۔ اس جلسے میں ہندوستان کے کونے کونے سے تقریباً تین سو (300) مہمانوں نے شرکت کی۔ جن میں حیدرآباد سے ایوارڈ حاصل کرنے والوں میں مخدوم محی الدین قادری زور، ڈاکٹر سیدہ جعفر، ثمینہ شوکت، فاطمہ تاج، موصوفہ یعنی قمر جمالی، محمد علی اثر، بانو طاہرہ سعید اور زاہدزین وغیرہ شامل تھے۔ اس جلسے میں متعدد ادباء کو مختلف ایوارڈس سے نوازہ گیا۔ کل 188 انعامات یا ایوارڈس تقسیم کئے گئے۔ جیسے 'یوسف سرمست کو افتخار امام ایوارڈ'، 'سیدہ جعفر اور ثمینہ شوکت کو امتیاز نوائے میر ایوارڈ'، 'فاطمہ تاج کو امتیا میر ایوارڈ' اور 'وقار خلیل، محمد علی اثر، بانو طاہرہ سعید اور زاہدہ زین کو میر ایوارڈ' وغیرہ۔ اس طرح کل ۱۸۸ ایوارڈس متعدد قلم کاروں میں تقسیم کئے گئے۔ اس رپورتاژ میں قمر جمالی نے اس بات کو بھی واضح کیا ہے کہ " آل انڈیا میرا اکادمی کا جلیل القدر اعزاز "اعزازِ میر" اس سال (یعنی (1997) کو کسی کو نہیں دیا گیا۔

(۲) بڑودہ (گجرات) میں، عورت، مذہب اور سیاست " پر بین ریاستی سہ یومی سیمنار، حیدرآباد سے نومندوبین کی شرکت:-

یہ رپورتاژ 1997ء کو- بڑودہ گجرات میں منعقد ہوئے سہ روزہ سمینار کی روداد ہے۔ جس میں حیدرآباد سے نومندوبین نے شرکت کی۔ اس سمینار کا موضوع عورت، مذہب اور سیاست رہا۔ اس سمینار میں جن افراد کا انتخاب کیا گیا۔ ان میں اکثریت خواتین کی تھی، جن کا تعلق کسی نہ کسی اقلیتی طبقے سے تھا۔ اس سمینار کی خاص بات یہ تھی اس سمینار میں شرکت کرنے والے تقریباً تیس، پینتیس مندوبین سبھی سمینار میں حصہ لینے والے تھے۔ یہاں عام لوگوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ اس سمینار میں سبھی مندوبین اپنے اپنے میدان میں یکتا تھے اور اپنے اپنے

علاقے دلی، کیرلا، مہاراشٹرا، آندھرا پردیش اور گجرات کی نمائندگی کر رہے تھے۔

(۳) تقریب رسم اجراء "سنگ اٹھایا تھا" مصنف محمود حامد: زیر اہتمام: تناظر پبلیکیشنز، حیدرآباد۔ اے۔پی

17 دسمبر 1998ء کو حیدرآباد میں تناظر پبلیکیشنز کے زیر اہتمام ایک کتاب "سنگ اٹھایا تھا، کا رسم اجراء عمل میں آئی۔ اس رسم اجراء کی روداد کو قمر جمالی نے رپورتاژ کی شکل دے دیا۔ اس جلسے کی صدارت ڈاکٹر یوسف سرمت نے کی۔ اور نظامت قمر جمالی نے کی۔ اس جلسے میں اردو کے مشہور ادیبوں نے شرکت کی جن میں یوسف سرمست، مغنی تبسم، بیگ احساس، قدیر زماں، مصطفیٰ علی خان فاطمی اور عقیل ہاشمی وغیرہ شامل تھے۔

"سنگ اٹھایا تھا" ایک افسانوی مجموعہ ہے۔ اس کے مصنف محمد محمود حامد ہیں۔ محمود حامد اردو کے افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی اہلیہ قمر جمالی ہیں۔ اردو کی مشہور افسانہ نگاروں میں قمر جمالی کا شمار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ قمر جمالی تناظر پبلیکیشنز کی مدیر رہیں۔ تناظر مسلسل پبلیکیشنز کے تحت دہلی سے کئی کتابیں منظر عام آ چکی ہیں۔ لیکن حیدرآباد سے چھپنے والی پہلی کتاب 'سنگ اٹھایا تھا' ہے۔ اس کے متعلق مغنی تبسم کہتے ہیں.

> "..... یہ جلسہ اپنی نوع کا بالکل منفرد جلسہ ہے۔ جس میں کئی باتیں اپنی روایت سے ہٹی ہوئی ہیں۔ کتاب کے مصنف شوہر اور بیوی ناشر پبلیشر بھی اور ناظمِ جلسہ بھی اور میزبان بھی پھر ایک چھت کے نیچے دو افسانہ نگار رہتے ہوں۔ جس میں ایک بہت اچھا فن کار ہو۔ محترمہ بہت اچھی افسانہ نگار ہیں۔ اس سے ایک غلط فہمی کا امکان رہتا ہے کہ محمود حامد کی افسانہ نگاری میں کہیں قمر جمالی کا دخل تو نہیں۔ مگر "سنگ اٹھایا تھا" کے مطالعے کے بعد قاری مطمئن ہو جاتا ہے۔ کہ ان دونوں افسانہ نگاروں کی روش، اسلوب بیان نگارش اور طرز نگارش بالکل جدا ہے اور اتنی جدا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی تقلید کرنا چاہیں تو بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کا رنگ ذرا بھی قبول نہیں کیا۔ 'سنگ اٹھایا تھا' میں محمود حامد نے اپنی ذات کو ذات دیگر سے جوڑنے کا جو عمل ہے وہ بے مثال ہے۔"[1]

(تقریب رسم اجراء سنگ اٹھایا تھا از قمر جمالی، روزنامہ منصف ۱۹۹۸-۱۲-۳۰)

(۴) ادارہ اسمتا (حیدرآباد) کے زیرِ اہتمام خواتین پر تقسیم ہند کے اثرات پر ریتومینن کا لکچر:

13 ستمبر 1997ء کو حیدرآباد میں ادارہ اسمیتا کی جانب سے ایک نشست عمل میں آئی۔ یہ رپورتاژ اسی نشست کی روداد ہے۔اس جلسے یا نشست کی صدارت جیلانی بانو نے کی۔اس کے بعد ریتومینن نے خواتین پر تقسیم ہند کے اثرات کے عنوان پر بات کی۔ ریتومینن ایک غیر سرکاری تنظیم 'کالی' کی صدر ہیں۔انہوں نے خواتین پر تقسیم ہند کے اثرات کے موضوع پر ایک پراجکٹ کا کام کیا۔تاکہ تقسیم ہند کے دوران عورتوں پر ڈھائے گئے ظلم وستم یا مظالم کی تاریخ مرتب کر سکے۔جس کے لئے ریتومینن نے ہندوستانی سرحدی علاقہ پنجاب کا انتخاب کیا۔اور مہینوں پنجاب کی گلی کوچوں میں گھومتی رہیں تاکہ مواد حاصل کر سکے۔ ریتومینن نے پچاس سال سے زائد عمر افراد جن میں مرد اور خواتین دونوں شامل ہیں۔ان سے ملاقاتیں کیں اور انٹرویو لیا۔ان زبانی بیانات کی بنیاد پر تاریخ مرتب کرنے کے لئے خاصہ مواد جمع کیا۔اس پراجیکٹ کے متعلق ریتومینن کے الفاظ کو قمر جمالی کوٹ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ

''۹/اگست ۴۷ء سے ۰۳/ستمبر ۴۷ء،تک ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان کی طرف لاشوں سے بھری رفیوجی ٹرینیں چلتی رہیں۔ایک ہفتہ قبل ہندو مسلمان اور سکھ جو ایک دوسرے کی دوستی کا دم بھرتے تھے،ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔دونوں نے ایک دوسرے کی عورتوں کی عصمت ریزی کی۔بیٹیوں کے ساتھ انسانیت سوز حرکت کی جس کی مثال تاریخِ آدم میں کہیں نہیں ملتی۔شنجو پورہ کے کچھ سکھ خاندانوں میں کچھ لوگ اب بھی حیات ہیں۔جن کی آنکھیں تقسیم ہند کے واقعات دیکھنے کے بعد روشنی سے محروم ہو گئیں اور جن کی زبانی سنے ان واقعات کو قلم بند کرتے ہوئے ریتومینن نے کہا کہ قلم بھی کانپ اٹھا۔دس بارہ مردوں نے مل کر ایک ایک لڑکی لوٹا اور کچھ کو ان کے باپ بھائیوں نے خود شوٹ کر دیا کہ آبرو بچی رہے۔لڑکیوں کا صرف جنسی استحصال ہی نہیں ہوا بلکہ انھیں جسمانی طور پر ہراساں کرنے کے لئے ان کے نسوانی اعضاء کاٹے گئے "۔اس رپورتاژ میں ریتومینن کے پروجیکٹ کی تفصیلات جن کے پسِ پشت تقسیم ہند کے دوران ظلم وجبر، ستم زدہ افراد کے جذبات واحساسات پر روشنی ڈالی گئی۔

5) گنبدانِ شاہی میں یوم قلی قطب شاہ،انتالیسواں جشن،آنکھو دیکھا حال:

شہر حیدرآباد میں تر 1958ء سے یوم قلی قطب شاہ کی بنیاد پڑی۔اس وقت سے ہر سال یہ جشن ادارہ ادبیات اردو کے زیرِ اہتمام منایا جا رہا ہے۔اس کا مقصد حیدرآباد میں قومی

یکجہتی اور لسانی ہم آہنگی کی برقراری ہے۔اس جشن کی روداد ہی رپورتاژ" گنبدانِ شاہی میں یوم قلی قطب شاہ" ہے۔جو 25 اپریل 1998ء کو گنبدانِ شاہی میں منایا گیا۔سلطان محمد قلی قطب کے مقبرے کے چبوترے کو اسٹیج کے لئے منتخب کیا گیا۔جہاں ایک طرف صدر اور مہمانانِ خصوصی کے لئے اور دوسری طرف محفل موسیقی کے لئے جگہ مختص کی گئی۔اس طرح 25 اپریل 1998ء کی شام کو سلطان محمد قلی قطب شاہ کے نام معنون کی گئی۔

اس جلسے کی افتتاح پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کیا اور ڈاکٹر آنندراج ورما نے نظامت کی ذمہ داری سنبھالی۔ اس جشن میں دانشواران اردو نے شرکت کی۔ جن میں پروفیسر سیدہ جعفر، مغنی تبسم، پروفیسر شمیم جیۓ راج پوری اور مرزا اکبر علی بیگ وغیرہ شامل تھے۔

(6) دکنی زبانوں پر جنوبی ہندزبانوں کے اثرات کل ہند سمینار، مدھیہ پردیش، کیرل' بنگلور اور مہارشٹرا سے نمائندگی:

26 اپریل 1998ء کو ادارہ ادبیات اردو (پنج گٹہ) میں یوم قلی قطب شاہ تقاریب کے سلسلے میں منعقد ہونے والی ایک ادبی کل ہند کانفرس کی روداد ہے۔

(7) مسمانوں کے سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کی یکسوئی، تعلیمی پسماندگی اور اقتدار سے بے دخل، حکومت کی مشنریوں میں صفر نمائندگی۔وجوہات کی تلاش وتجاویز:

مسلمانوں کے مسائل کے موضوع پر اسمیتا کی جانب سے ایوان اردو, پنجہ گٹہ، حیدرآباد میں 13 اور 14 جون 1998ء کو دوروزہ قومی سمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔قمر جمالی لکھتی ہیں کہ مسلمان جو اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہے۔خود اپنے ہی ملک میں غیر مستحکم، غیر محفوظ اور غیر مطمئین ہوگئے۔ان کی معاشی' سیاسی' سماجی اور معاشرتی پسماندگی نے انھیں احساسِ کمتری کا شکار بنادیا اور اقتدار میں مسلمانوں کی نمائندگی صفر کے برابر ہوگئی۔ان سارے مسائل کی یکسوئی کے لے مسلمانوں کو قومی سطح پر ایک مشترکہ پلاٹ فارم پر جمع ہونے کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کو اسمیتا نے محسوس کیا۔ادارہ اسمیتا اور I.F.I.E کے اشتراک سے اس سمینار کو منعقد کیا گیا۔اس دوروزہ اجلاس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس سمینار میں ایک طرح کا مباحثہ تھا۔جس میں شرکاء کو کھلے ذہن سے اپنے خیالات کو اظہار کرنے کا موقعہ فراہم کیا گیا۔قمر جمالی رپورتاژوں میں سماجی اور سیاسی شعور بدرجہ اتم موجود ہے۔

فن رپورتاژ نگاری میں اصولی طور پر تاریخ کا حوالہ دیا جاتا ہے،تاکہ قاری کو موقعہ

کے متعلق مکمل جانکاری مل سکے۔قمر جمالی کے یہاں وقوع پذیر واقعہ کے متعلق مکمل جانکاری حاصل کی جاسکتی ہے کہ واقعہ کب' کہاں اور کسی وقت رونما ہوا؟ جیسے سوالات کا بہ آسانی جواب حاصل کیا جاسکتا ہے۔قمر جمالی لکھتی ہیں:

"بڑودہ میں ۲۲/۲۳ اور ۲۴/ جولائی کو منعقد ہونے والے اس سیمینار میں شرکت کے لئے ASMITA گروپ نے حیدرآباد سے جن افراد کا انتخاب کیا۔ان میں زیادہ تر خواتین تھیں۔جن کا تعلق کسی نہ کسی اقلیتی طبقے سے تھا۔ حیدرآباد سے (9) افراد پر مشتمل ایک قافلہ محترمہ جمیلہ نشاط کی سرکردگی میں ۲۰ جولائی کی دوپہر براہِ بمبئی بڑودہ روانہ ہوا۔2

(بڑودہ (گجرات) میں عورت، مذہب اور سیاست از قمر جمالی، روزنامہ عوام، ۱۹۹۷-۸-۷)

مندرجہ بالا سطور میں روداد سیمینار کے شرکا، سیمینار کی خصوصیت، علاقے کی نشاندہی وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل کئے جاسکتے ہیں۔قمر جمالی کے رپورتاژ نہ صرف واقعات کی تفصیل فراہم کرتے ہیں بلکہ یہ وقوع پزیر واقعات اپنے عہد کے عکاس بھی ہیں۔قمر جمالی رقم طراز ہیں:

"شہرِ حیدرآباد فرخندہ بنیاد کو پیدا ہوئے پورے چارسو برس گزر گئے۔ان چارسو برسوں میں یہاں بہت کچھ بدل گیا۔وہیں حیدرآباد کی تہذیب اور رکھ رکھاؤ میں بھی فرق آ گیا.... یا تو پھر معاشرہ حالات اور تقاضائے وقت کی نظر ہوگیا۔ہرے بھرے درخت اور پھولوں کے کنج کے درمیان ولانما مکانوں کی جگہ سیمنٹ اور کنکریٹ کے جنگل لگ گئے۔اب نہ وہ بڑے بڑے گھر اور نہ گھروں میں آنگن اور نہ ہی آنگنوں میں چنبیلی کے منڈوؤں تلے مٹی کے آلوں میں دھنسے لال گورے گھڑے جن کے مساموں سے پچڑتے ٹھنڈے پانی کی بوندوں کو دیکھ کر ہی روح میں تراوٹ آجاتی۔سہ پہر کے ساتھ ہی صحنوں میں نوار کی پلنگیں بچھ جاتیں اور موگرا، جوہی اور چنبیلی کے گجرے گوندھے جاتے اور زندگی صحنوں میں اتر آتی۔"3

(دکنی زبان پر جنوبی ہند کے زبانوں کے اثرات–از قمر جمالی، روزنامہ ہمارا عوام ۱۹۹۸/۴/۳۰ ص2)

اقتباس میں حیدرآباد کی بدلتی تہذیب کا تذکرہ کیا گیا۔جس میں اس دور کے مکانات ،آنگن اورصحنوں ں کا خوبصورت منظر دیکھا جاسکتا ہے۔قمر جمالی کے رپورتاژوں میں نہ صرف حیدرآبادی تہذیب بلکہ ایسے واقعات بھی پیش کئے گئے ہیں۔جن میں مسلم اقلیتی طبقے کی خواتین کے مسائل پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

"...... صرف حیدرآباد کے پرانے شہر ہی میں (۳۱) سلمس آباد ہیں۔ جہاں لوگ غریبی کی ریکھا کے نیچے جیتے ہیں۔ان بستیوں میں عورت کی حیثیت ایک جنس کی سی ہے ۔جو خریدی اور بیچی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانے سے حیدرآباد کا پرانا شہر معصوم بچیوں کی تجارت کا اڈہ بن گیا ہے۔ جہاں معصوم نوخیز لڑکیاں عمر رسیدہ مردوں سے بیاہی جاتی ہیں۔حال ہی میں مسرت نامی ایک لڑکی کو صرف دو مہینے کے عرصے میں تین بار بیاہے جانے کا ذکر کرتے ہوئے ریحانہ سلطانہ نے اس قاضی پر سخت تنقید کی۔جس نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنی دنیا اور آخرت دونوں برباد کی۔"4

(بڑودہ (گجرات) میں عورت مذہب اور ریاست از قمر جمالی،،روزنامہ عوام،۱۹۹۷-۸-۷۔)

قمر جمالی کی تحریروں میں کئی ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات موجود ہیں۔جو ہندوستانی معاشرے یا خاص طور پر مسلم معاشرے سے جڑے مسائل پر مبنی ہیں۔قمر جمالی کی تحریروں کا انداز نہایت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ان کے اسلوب میں شگفتہ بیانی جھلکتی ہے۔مثال کے طور پر گنبدانِ شاہی میں منعقدہ جشن کے منظر کا بیان ملتا ہے۔

"شام کے سائے تیزی سے شاہی مقبروں کے گنبدوں سے اتر کر ان کے دامنوں میں جذب ہو رہے تھے۔اورافق پر شاہ مشرق سرخ ردا اوڑھ کر زمین کی کوکھ میں چھپ رہے تھے۔اور بانیِ شہر سلطان محمد قلی قطب شاہ کے مقبرے پر سفید چاندنیوں کے فرش پر گہرے سرخ رنگ کی پاؤں گھڑی بچھائی جارہی تھی۔"5

(گنبدانِ شاہی میں یوم قلی قطب شاہ از قمر جمالی،مشمولہ روزنامہ ہماراعوام،۳۰/اپریل /۱۹۹۸)

قمر جمالی کے رپورتاژوں میں کردار کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ان رپورتاژوں میں نظر آنے والے تمام کردار ملک کے مختلف محکمہ جات سے تعلق رکھنے والی نامور شخصیتیں ہیں۔ جو اپنے اپنے علاقے یا محکمہ میں اہم اور منفرد مقام و رتبہ رکھتے ہیں۔جن میں ریتو مینن، کنا بیرن، مغنی تبسم ، یوسف کمال، بیگ احساس ،جمیلہ نشاط ،م اور ریحانہ سلطانہ وغیرہ جیسی کئی نامور ہستیاں شامل ہیں۔ان کرداروں کو قمر جمالی نے موقعہ و محل کے حساب سے دلچسپ انداز میں پیش کیا۔قمر جمالی اپنے رپورتاژوں میں مرکزی کردار ادا کرتے ہوئے نظر آتی ہیں۔

قمر جمالی کے کل سات رپورتاژ منظر عام پر آ چکے ہیں۔یہ رپورتاژ 1997ء تا 1998ء کے درمیان میں لکھے گئے۔ یہ تمام رپورتاژ مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ اجتماعی نوعیت کے حامل ہیں۔ان میں ادبی اور غیر ادبی دونوں شامل ہیں۔ یہ رپورتاژ ادبی ،تہذیبی ،سماجی، معاشی ، معاشرتی ، اقتصادی اور اسلامی نقطہ نظر کے حامل ہیں۔جن میں داخلی و خارجی کیفیات کا بیان ملتا ہے۔زبان سادہ و سلیس معلوم ہوتی ہے۔ان کی حیثیت دستاویزی ہے۔

ایک نابغہ قلمکار اور قادر الکلام شاعر
پروفیسر مولانا حکیم عبدالوہاب ظہورؔی عمری

ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری

سینیر عمری شاعر، پروفیسر حکیم عبدالوہاب ظہورؔی عمری، ادرنگی، بنگلور، کرناٹک میں 1920 میں پیدا ہوئے۔ جامعہ دار السلام عمرآباد میں 1929 میں داخل ہوئے اور 1938 میں سندِ فضیلت لے کر فارغ ہوئے۔انھوں نے جامعہ میں تعلیم کے دوران مدراس یونیورسٹی سے منشی فاضل اور افضل العلماء کی اسناد حاصل کیں۔ پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے میٹرک کامیاب کیا۔ یونانی نظامیہ طبیہ میڈیکل کالج حیدرآباد سے طبیب ماہر اور ایم ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔حیدرآباد دکن کے نظامیہ طبیہ میڈیکل کالج میں مددگار پروفیسر مقرر ہوئے۔ چند سال بعد پروفیسر کی حیثیت سے ترقی پا کر اسی کالج میں پرنسپل مقرر ہوئے۔علاوہ ازیں انھوں نے فیکلٹی آف میڈیسن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رکن، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں شعبۂ یونانی کے چیرمین بورڈ آف اسٹڈیز، ڈین فیکلٹی آف آیورویدا اینڈ یونانی کی حیثیت سے اعزازی خدمات بھی انجام دیں۔ وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد ادارۂ تاریخ وتحقیقِ طب، ہمدرد انسٹی ٹیوٹ، تغلق آباد (نواح دہلی) میں ریسرچ پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔اس کے بعد انھیں مرکزی حکومت کے مرکزی ادارہ یونانی ریسرچ انسٹیٹیوٹ، حیدرآباد کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ ان تمام عہدوں پر مسلسل مصروفیات کے دوران ان کا تحقیقی وتصنیفی کام اور مشقِ سخن کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا۔

پروفیسر حکیم عبدالوہاب ظہورؔی عمری کی شادی خانہ آبادی مولانا سید قطب الدین بختیاری کی منجھلی دختر سے ہوئی۔ وہ میرے دادا، حضرت مولانا سید شاہ صبغت اللہ بختیاری کے ہم زلف تھے۔گویا میرے والدِ ماجد کے خالو ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مجھے ان کو قریب سے دیکھنے اور ان کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقعہ ملا۔ وہ قلم کے دھنی اور تصنیف وتالیف کے

میدان کے شہسوار تھے۔ ہر وقت مادرِ علمی جامعہ دار السلام عمرآباد کا تذکرہ عقیدت ومحبت سے کرتے اور اپنی شخصیت کو جامعہ میں تعلیم اور اس کے فیضِ تربیت کا مرہونِ منت قرار دیا کرتے تھے۔

حکیم ظہورؔ ی عمری نے بہت لکھا۔ سفر وحضر میں بھی پابندی سے لکھا کرتے تھے۔ اپنے وقیع کام کی بدولت' انھیں طب کی دنیا میں بہت عزت ملی۔ تاریخِ طبِ یونانی پر ان کی ایک ضخیم کتاب ہے' جو تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور تاریخِ طب پر سب سے مستند اور معتبر سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب میں قدیم مصر، عراق، ہند، ایران، یونان' اور عہد اسلامی، اندلس، بغداد، مصر وشام' اسلامی ہند گیارہویں صدی تا برطانوی ہند اور جمہوریہ ہند میں طبی ارتقا کا سیر حاصل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان تینوں ادوار کے تفصیلی جائزے کے باعث یہ کتاب' ایک ہزار صفحات پر محیط ہے۔

حکیم عبد الوہاب ظہورؔ ی عمری کی علمی وتحقیقی تصانیف میں طبی اور اسلامی کتابیں زیادہ ہیں۔ جن میں' جابر بن حیان (1944)' قاموس القانون (1964)' یہ کتاب ابن سینا کی القانون کی عربی اصطلاحات کے انگریزی ولاطینی مترادفات پر مشتمل ہے اور ہمدرد انسٹیٹیوٹ سے شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ 'ہندوستان میں یونانی وعربی طب کے مصنفین اطبا اور ان کی تصانیف وتراجم کا تاریخ وار جائزہ' (1965) یہ کتاب' 1100 تا 1947 پر محیط ہے۔ یہ کتاب بھی ہمدرد انسٹیٹیوٹ دہلی سے شائع ہوئی۔

انھوں نے طبی کتابوں کے علاوہ اسلامی موضوعات پر بھی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔ جشنِ طلائی کے موقعہ پر صحیفہ میں ان کا ایک طویل مقالہ ''علامہ ابن نفیس کاشفِ دورانِ خون'' پر شائع ہوا تھا۔

حکیم ظہورؔ ی عمری نے لکھا ہے کہ نظامیہ طبیہ کالج سے ریٹائرمنٹ کے بعد ہمدرد فاؤنڈیشن کے صدر حکیم عبدالحمید نے اپنے ادارہء تاریخ وتحقیقِ طب میں ریسرچ پروفیسر کے عہدے پر مامور کیا اور ابن سینا کی پانچ جلدوں پر مشتمل مشہور کتاب القانون کے قدیم نایاب قلمی نسخے کا جو ایا صوفیہ' استنبول (ترکی) کی لائبریری میں موجود تھا' جس کی فوٹو کاپی ہمدرد میں محفوظ تھی، مصر ایران اور ہندوستان کے مطبوعہ مروجہ نسخوں سے تقابل کر کے ایک مکمل صحیح ترین ایڈیشن تیار کرنے کا کام سپرد کیا گیا۔ دو معاون عالموں کے ساتھ چار سال کے عرصے میں مارچ

1978 کو یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔اس کتاب کی پہلی جلد ہمدرد پریس سے شائع ہو چکی ہے۔

پروفیسر حکیم عبدالوہاب ظہوری عمری کی ترجمہ کردہ کتابیں نفیس اکیڈمی حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ چند کتابیں مکتبہ نشاۃ ثانیہ حیدراباد' کراچی اور لاہور سے بھی شائع ہوئیں۔ان کی اہم کتابوں میں 'اسلام کا نظامِ حیات'، 'تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات'، 'عالمگیر اسلامی تصور'، 'مکتوباتِ امام غزالی'، 'شعور لاشعور نو جوانوں کی نفسیات'، 'قوت ارادی فلسفیوں کے خواب'، 'مجاہد مراکش'، 'محمد عبدہ اور پان اسلامزم'، 'مصر میں اردو' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

تمام افرادِ خاندان کے امریکہ منتقل ہونے پر وہ خود بھی امریکہ منتقل ہو گئے۔امریکہ سے ایک دو مرتبہ جب ہندوستان آئے تو بڑے اہتمام سے مادرِ علمی جامعہ دارالسلام عمرآباد میں بھی حاضر ہوئے تھے۔اواخر عمر میں طویل عرصے تک بیمار رہنے کے بعد 93 سال کی عمر میں 2011 میں فلوریڈا میں ان کا انتقال ہوا۔

پروفیسر مولانا حکیم عبدالوہاب ظہوریؔ عمری نے جامعہ دارالسلام عمرآباد میں علامہ شاکرؔ نائطی سے شاعری میں تلمذ حاصل کیا تھا اور وہ ان کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ان کا شعری مجموعہ ''شیرازۂ افکار'' کے نام سے 1995 میں ادارۂ شعر و حکمت' حیدرآباد سے مشہور شاعر مضطر مجاز کی نگرانی میں شائع ہوا۔اس کتاب کا انتساب انھوں نے اپنے برادر بزرگ حکیم عبد السلام اسلم کے نام کر کے اسے مادرِ علمی جامعہ دارالسلام عمرآباد کی نذر گزرانا ہے۔'احوالِ واقعی' کے نام سے شعری مجموعے کی ابتدا میں انھوں نے لکھا ہے کہ مادرِ علمی جامعہ دارالسلام عمرآباد کی آغوش میں انھوں نے شعور کی آنکھ کھولی اور علامہ شاکرؔ نائطی کے فیضانِ صحبت میں زندگی کے دس سال گزارے۔انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ ان کی ذہنی صلاحیتوں کو ابھارنے اور فکر و نظر کو جلا بخشنے میں جامعہ کا بڑا حصہ رہا اور وہ جامعہ کے اور علامہ شاکر نائطی کے فیضانِ نظر کے وہ ہمیشہ مقروض رہیں گے۔انھوں نے جامعہ میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں مشاعروں میں شرکت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان دنوں جامعہ میں طرحی مشاعروں کے علاوہ موضوعی مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے۔انھوں نے لکھا ہے کہ غزل کے مقابلے میں ان کا ذہن جب نظم کے سانچے میں ڈھلنے لگا تو علامہ شاکرؔ نائطی نے یہ دیکھ کر نظم ہی میں طبع آزمائی پر زور دینے کا مشورہ دیا۔ان نظمیں کسان، آدم و حوا، معرکہء دل و دماغ، طب نامہ، ترانۂ فلسطین اسی نوع کی نظمیں ہیں۔

حکیم ظہوری عمری جامعہ میں جب طالب تھے تو اسی زمانے میں مصحف کا اجرا عمل میں آیا تھا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''مصحف نے میرے اندر انشا پردازی کی تڑپ پیدا کر دی اور مجھے بھی مصحف کے اوراق پر اپنی نظم و نثر کی جولانیاں دکھانے کا موقع مل گیا۔ 'مشرقی و مغربی تہذیب'، پر ایک تمثیلی طویل نظم مسلسل مصحف کے کئی شماروں میں بالاقساط چھپتی رہی۔ جامعہ سے 39-1938 میں فارغ ہونے کے بعد بجز فکرِ سخن کوئی اور مشغلہ نہ تھا۔''

مضطر مجاز ان کی شاعری کے بارے میں شیرازۂ افکار کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ حکیم صاحب بنیادی طور پر نظم کا مزاج رکھتے ہیں، اگر چہ انہوں نے کچھ غزلیں کہی ہیں لیکن ان میں بھی بیشتر غزلِ مسلسل کے فارم میں ہیں اور نظم گوئی کے مزاج کی غماز ہیں۔ انھوں نے 'معرکۂ دل و دماغ' کو ڈرامائی نظم قرار دیا ہے۔ مضطر مجاز لکھتے ہیں: ''فارسی اور عربی کے پس منظر کی وجہ سے حکیم صاحب کو زبان اور بیان پر خاصی دسترس حاصل ہے۔ ان کی زبان کی ایک اور خوبی یہ بھی ہے چونکہ ان کا تعلق جنوبی ہند سے ہے، اس لیے بعض اوقات ایسے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں جن کا تلفظ خالصتاً دکنی ہے۔ زبان کے ساتھ یہ بولڈ رو یہ زبان میں ایک طرح سے وسعت کا ضامن ہے۔'' ان کا یہ جملہ اہمیت رکھتا ہے کہ ''حکیم صاحب ایک رندِ قدح خوار ہیں اور شیرازۂ افکار ان کے خونِ دل کی کشید۔''

شیرازۂ افکار کے چار حصے ہیں۔ پہلے حصے میں 'شاخِ سدرہ' کے تحت منظومات، دوسرے حصے میں 'شاخِ غزال' کے تحت غزلیات، 'شاخِ مرجان' کے تحت طبیّات (طب سے متعلق کلام) اور چوتھے حصے میں 'شاخِ گل' کے تحت تبریکات و شادماں نغمات یعنی تہنیتی کلام درج کیا گیا ہے۔

نظم ''سلام تجھ کو جامعہ'' میں جامعہ سے عقیدت و محبت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ترانۂ بخاری' جامعہ میں بخاری کے درس پر کہی گئی نظم ہے۔ حصہ نظم میں وہ مشہور نظم بھی شامل ہے جو کسان کے موضوع پر جامعہ میں اگست 1938 کو سنائی گئی تھی جس میں 72 اشعار ہیں اور آخر میں حافظ کے شعر پر ختم کی گئی تھی۔ اس نظم کے تین شعر ملاحظہ فرمایئے:

ترے نقشِ قدم نے جگمگائے وادی و کہسار
یہ تیرے حوصلے دشت و جبل میں لالہ و گلزار
ترے قدموں کی برکت سے بیاں میں بہار آئے

ترے نغموں کی لے سننے خراماں جوئے بار آئے
مئے گلگوں جو پیمانوں میں ہے سرمایہ داروں کے
مئے گلگوں نہیں، دراصل وہ خونِ تمنا ہے!

منظوماتِ ظہوریؔ میں احسان فراموش، نوجوان نسل سے خطاب، طرفہ تماشا، احساس اور جہیز نامہ وغیرہ عمدہ نظمیں ہیں۔ان کی غزلوں کے چند منتخب اشعار درج ذیل ہیں:

آہوں نے بھری، دیدۂ پر نم نے بھری ہے
صحرا میں جو خشکی ہے جو گلشن میں جو تری ہے
سینچا ہے غم ِ دل کو، مرے خونِ جگر نے
یہ شاخِ چمن اپنی بہاروں سے ہری ہے
کاشانۂ دل غم کے چراغوں سے ہے روشن
کس شان سے اے خالق غم جلوہ گری ہے
یہ زخمِ جگر مہکے ہیں یا پھول کھلے ہیں
یا آہ سِحرؔ موجِ نسیم سِحری ہے!!
دل ٹوٹ کے بن جائے جو آئینہ ظہوریؔ
اس گوہر یکتا کی یہی دیدہ وری ہے!
دلِ حزیں نے سنائے ہیں مختصر احوال
دراز ہیں ابھی افسانے زلف برہم کے
جبینِ دہر پہ نقشِ وفا اگر چمکے
تو تابناک نظارے ہوں جذبِ باہم کے
غم اس کے لیے صیقل، حسرت ہے تپش اس کی
دل ٹوٹے تو آئینہ، ترشے تو نگینہ ہے!!
گلشن کی طبیعت کا دستور ہے دیرینہ
پھولوں کو بھی ہنسنا ہے، کانٹوں کو بھی جینا ہے
ساقی کی نگاہوں سے گردش میں ہے پیمانہ
دن رات کی مستی ہے، دن رات کا پینا ہے

اسرارِ محبت کا گنجینہ ' ظہوریؔ ہوں
کہتے ہیں دلِ شاعر حکمت کا خزینہ ہے
جس سر میں تھا سودائے فلک بوس ظہوریؔ!
اب گردشِ افلاک اسے پامال کرے ہے
کس شان ست تہذیب کے شانے پہ کھڑے ہیں
یہ لوگ تباہی کے دہانے پہ کھڑے ہیں
دشمن ہیں کہ تیار ٹھکانے پہ کھڑے ہیں
اک ہم ہیں کہ اسٹیج سجانے پہ کھڑے ہیں
شاطر کہ ادھر جوڑ کے سر بیٹھے ہیں یکسو
مہرے ہیں کہ شطرنج کے خانے پہ کھڑے ہیں

1964 میں' آمبور میں علامہ شاکرؔ نائطی کی تعزیت میں منعقدہ ایک مشاعرے میں انھوں نے جو نظم پڑھی تھی اس کے چند شعر:

اے زباں رک جا کہ اب حسنِ بیاں جاتا رہا
دل! نکل 'پہلو سے آ! دردِ نہاں جاتا رہا
مئے کدے کا ذکر کیا 'جام و سبو کی بات کیا؟
آٹھ گیا ساقی !خمارِ مئے کشاں جاتا رہا
آہ !وہ آنِ ادب، جانِ سخن، شانِ نظر
وہ ادیبِ نامور' وہ نکتہ داں جاتا رہا

مذکورہ تعزیتی مشاعرے میں 'استادِ ظہوریؔ' کے عنوان سے انھوں نے قطعات بھی پیش کیے تھے۔ایک فارسی قطعہ یوں ہے:

بفیضِ حضرتِ علامہ شاکر
نگاہم نکتہ رس، بالیدہ خاطر
یگانہ بود ' استادِ ظہوریؔ
لسان الشعرٗ ادیبِ عصرِ حاضر

دیگر طبی منظومات میں جہانِ طب' علامہ حکیم کبیر الدین' جل ترنگ' نذرانۂ عقیدت

مہدی نواز جنگ، بانی بنجارہ ہلز، قصر سر بلند اور معمارِ طب وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

پروفیسر حکیم عبدالوہاب ظہوریؔ عمری کے کلام پر علامہ اقبالؔ کے اثرات بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ علامہ اقبالؔ کی ایک مختصر مثنوی ''ساقی نامہ'' ہے۔ اسی ساقی نامے کی طرز پر انھوں نے طب کے مضامین پیش کر کے ''طباقی نامہ'' لکھا ہے۔ واضح رہے کہ یہ پیروڈی نہیں ہے بلکہ اقبالؔ کے رنگ میں طب نامہ کہنے کی ایک کوشش ہے۔ طباقی نامہ کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

طبیبا! پلا شربتِ لالہ رنگ
کہ پی کر جسے دل میں اٹھے امنگ
وہ شربت کہ جس میں ہو جوشِ جنوں
بڑھا دے جو رفتارِ دورانِ خون

پروفیسر حکیم عبدالوہاب ظہوریؔ عمری کی کتابوں میں ان کے تراجم اور طبی تصانیف جہاں اہمیت کی حامل ہیں، وہیں ان کا کلام اور اسلامیات کے موضوعات پر ان کی تصانیف اہمیت کی حامل ہیں۔

Dr. SYED VASIULLA BAKHTIARY
Associate Professor & Head, Department of Urdu
Government College for Men (Autonomous), Kadapa,
Andhra Pradesh
Email: vasibakhtiary@gcmkadapa.ac.in
Mobile: 9441905026 / 8712135940

☆☆☆☆☆

کیرالہ کے ین۔محی الدین کُٹّی
اردو نگر سے اردو ریسرچ آفیسر تک

ڈاکٹر ای۔محمد انور حسین،لکچرر اِن اردو
پی۔وی۔کے۔این۔گورنمنٹ ڈگری کالج (A)
چتور،آندھراپردیش۔517002

دوستو! یہ نام پڑھ کر غلط فہمی میں نہ رہیں کہ یہ اردو نام لکھنؤ، دہلی یا حیدرآباد والوں کے ہوں گے، بالکل نہیں۔ یہ اردو نام نہ لکھنؤ والوں کے ہیں نہ دہلی والوں کے اور نہ ہی حیدرآباد والوں کے بلکہ یہ کیرالا کے ایک مُحبّ اردو، جانِ اردو اور شانِ اردو استادالاساتذہ، جناب ین محی الدین کُٹّی صاحب کے گھر گاؤں بیٹی نغموں کی سی۔ڈی اور ان کے شعری مجموعہ کے اردو نام ہیں۔

مردم شماری کریں تو پتہ چلے گا کہ ہر شہر ہر گاؤں ہر محلے اور ہر گلی کوچے میں ایک یا انیک اردو جیسی میٹھی زبان کے شیدائی اور خادم مل جائیں گے۔لیکن اس سلسلے میں ین محی الدین کُٹّی کی بات ہی کچھ اور ہے۔اگر میں یہ کہوں تو بے جانہ ہوگا کہ خدا نے انھیں صرف اردو ہی کے لیے پیدا کیا ہے ورنہ کہاں آریائی خاندان سے تعلق رکھنے والی اردو زبان اور کہاں دراوڑی خاندان کی ملیالم زبان کے ین محی الدین کُٹّی۔صوفی صد ملیالم ماحول میں پیدا ہو کر پل بڑھنے والے ین محی الدین کُٹّی کو اگر دیکھیں یا ان کی گفتگو سنیں تو ذرا برابر بھی گمان نہیں ہوگا کہ یہ ملیالی ہیں۔صورت شکل ہی سے نہیں بلکہ زبان و بیان سے بھی وہ اصلی اور پکّے اردو والے لگتے ہیں۔تعجب کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اردو سیکھنے کے لیے دوسروں کی طرح نہ بنگلور کا رُخ کیا نہ حیدرآباد کا اور نہ ہی بمبئی کا بلکہ کیرالا ہی میں رہ کر اردو سیکھی۔

ہندوستان کی چھوٹی ریاستوں میں کیرالا جنوبی ہند کی ایک اہم ریاست ہے جس کا جنم

یکم نومبر 1956ء کو تامل ناڈو، کرناٹک اور آندھرا پردیش کی تنظیم کے نتیجے کے طور پر ہوا۔ جغرافیائی حیثیت سے اس کے حدود ایک طرف یعنی مشرق میں مغربی گھاٹیاں اور دوسری طرف یعنی مغربی میں بحرۂ عرب شمال میں کرناٹک اور جنوب میں کنیا کماری ہیں۔ زمانۂ قدیم سے ہی کیرالا نے ہر میدان میں اپنی ایک انفرادیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ جس طرح سے اس کے رسم ورواج اس کی تہذیب ثقافت اس کی علاقائی زندگی سے ہم آہنگی وغیرہ سب بالکل جداگانہ ہیں۔ اسی طرح یہاں کے لوگوں کی اردو سے دلچسپی بھی ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔

ریاست کیرالا کے تمام اضلاع میں ضلع ملاپُرم کو اردو زبان کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ جن محبان اردو نے اس کو اپنا وطن بنایا وہ سب علم دوست تھے جن میں سید محمد سرورؔ، عبدالرحمٰن ثاقب وغیرہ کافی مشہور ہیں۔ یہاں شعروسخن کی محفلوں کو سجایا تھا۔

سرزمینِ ملاپُرم پُویاتنگلؒ (بانکاڈ) جیسی پاک ہستیوں کی وجہ سے ہمیشہ ہی بلا امتیاز مذہب وملت عوام کی آنکھوں کا سرمہ رہی ہے۔ گُل والا کی ٹھنڈک نے یہاں کی خاک کو اِکثیر بنایا اور آبرو بخشی۔ اس لیے یہاں کی خاک سے جو بھی فرد اٹھا ہمدوش ثریا ہو گیا۔ فنکاروں اور دیدہ وروں کی تعداد ان گنت، عالم اور مدبر بھی بے شمار یہاں پیدا ہوئے جن پر یقیناً ایک تہذیب کو ناز ہے۔ جناب ین محی الدین کُٹّی بھی اسی سرزمین کی خاک کے ایک فرد ہیں۔

ریاست کیرالا کے ملاپّرام ضلع کا مردُم خیز موضع کوڈور (اردونگر) بھی علمی، ادبی، سیاسی، سماجی اور مذہبی سرگرمیوں کی بنیاد پر اپنے کارہائے نمایاں کی روشنی میں بیک وقت کئی میدانوں میں اپنی نمایاں پہچان رکھتا ہے۔ اس چھوٹے سے گاؤں نے جتنے اردوداں پیدا کیے ہیں اتنے کیرالہ کے کسی اور گاؤں نے شاید ہی پیدا کیے ہوں گے۔ اس طرح اردونگر نے کئی قابلِ ذکر اردو کے متعدد منتہی پیدا کیے جنھوں نے اردو زبان وادب کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں ہیں ان میں ین محی الدین کُٹّی کا نام سرِفہرست ہے۔

15/ اگست 1956ء کو ملاپُرم کے قریب اردونگر نامی گاؤں کے ایک متوسط گھرانے میں موصوف کی پیدائش ہوئی۔ والدین نے محی الدین کُٹّی نام رکھا۔ کیرالا کی اردو دنیا انھیں ین۔یم۔ کے۔ کے نام سے جانتی ہے اور اسی نام سے وہ مشہور ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے ہی گاؤں کے ایک اسکول میں حاصل کی پھر گورنمنٹ ماڈل ہائی اسکول ملاپُرم سے فارغ ہونے کے بعد کالی کٹ یونیورسٹی سے 1976ء میں ادیب فاضل کا امتحان امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ اس

کے بعد کیرالا سرکار کی جانب سے چلائے جانے والا Language Teacher Training کو اس کی کامیابی کے بعد 1980ء میں انھوں نے اردو استاد کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔اس کے بعد ترقی کرتے کرتے اپنے بل بوتے پر 1990ء میں انھوں نے میسور یونیورسٹی سے تیسرے رینک کے ساتھ ایم۔ اے اردو 1998ء میں ہماچل پردیش یونیورسٹی سے ایم۔ایڈ پاس کیا۔اس طرح جلد ہی انھوں نے اپنی ذہانت، ذکاوت اور محنت ولگن سے نہ صرف علمی دنیا میں ایک مقام حاصل کرلیا بلکہ ادبی دنیا میں بھی اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

موصوف نے اردو کو علم کی طرح حاصل کیا ہے۔اس کو روزگار کا ذریعہ ہرگز نہیں بنایا اور نہ ہی حصولِ شہرت کا۔ چند شہرت گریز حضرات بڑی خاموشی سے اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں کو بروئے کار رکھے ہوئے ہیں جو بڑی بیدار مغزی، ہوشیاری اور وقت کی نبض شناسی کا بین ثبوت ہے۔ ین محی الدین کُٹّی کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جو ہنگاموں،شوروغل سے دور رہ کر اور بعض اوقات اپنی خانگی ذمہ داریوں سے بھی گریز کر کے ہر وقت اپنی ذہنی تفریح یعنی اردو کی خدمت کی طرف مائل ہوتے ہیں اور شعروسخن کی طرف راغب ہوتے ہیں نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ۔یہی دیکھیے نا کہ ان کی اردو خدمات کا سفر 1974ء سے شروع ہوتا ہے۔

1983ء کا سال تھا لیکن ٹھیک سے مہینہ یاد نہیں۔ان دنوں میں اپنا وطن عزیز (چتور، آندھرا پردیش) سے دور ملازمت کے سلسلے میں ملاپُرم میں رہا کرتا تھا۔ اس وقت میں نے بحیثیت استاد، اردو، مشکل سے پانچ چھ مہینے ہی پڑھائے ہوں گے۔ ہنوز مجھے تدریس کا تجربہ نہیں تھا۔ایک دن مرحوم شیخ عبدالرحمٰن ثاقبؔ جو اس وقت گورنمنٹ کالج ملاپُرم میں صدر شعبہ اردو تھے۔ان کے توسط سے ین محی الدین کُٹّی سے ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

اس طرح موصوف کو بہت قریب سے دیکھنے اور ان کی شخصیت کو پرکھنے کا موقع مجھے 1983ء کے بعد ملا۔ درمیانہ قد، گورا رنگ، دبلا جسم، ڈھیلا، ڈھیلا شرٹ اور پیانٹ دیکھنے سے ملیالی نہیں کوئی انگریز لگتے ہیں۔ سادگی کی منہ بولتی تصویر ہے۔آج جب کہ ملاپُرم میں اونچے اونچے بنگلے تعمیر ہو رہے ہیں لیکن آداب کی سادگی جوں کی توں برقرار ہے۔ اس گھر کی قابل تعریف بات اس کے صاف ستھرے بڑے عہدے پر فائز ہوتے ہوئے بھی ان کے پاس نہ ایک گاڑی ہے اور نہ ہی کوئی ٹو وِیلر بعض لوگوں سے تعارف کا سابقہ عجیب انداز سے ہوتا ہے۔

اندازہ کیا تجربہ ہوا کہ یہ ایک نہایت مخلص اور شفیق انسان ہیں۔ سادہ لوح طبیعت کے مالک ہیں۔نہایت ذہین وفطین، خوش اخلاق، خوش مزاج، ملنسار، سادگی پسند، بلند کردار، کشادہ ظرف، کم آمیز، کم گو اور صاف گو انسان ہیں۔

اسی طرح اردو زبان وادب کی خدمت کو اپنا فرضِ منصبی تصور کرنا اور اس سلسلے میں اقدامات کو اپنے لیے فرض عین سمجھنا اس کے فروغ کے لیے تحریر و تقریر سے کام لینا اور ملنے والوں سے ایسی اپنائیت سے پیش آنا ان کی بلند کردار شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس گئے گذرے زمانے میں ایسی بلند کردار شخصیتیں شاذ و نادر ہی دکھائی دیتی ہیں اور مزاج کی سادگی اور قابلیت دونوں کا ایسا عمدہ امتزاج بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔اس طرح وہ موصوف سے میری پہلی ملاقات تھی اس دن سے آج تک ان سے میرا ذہنی رشتہ بدستور قائم ہے۔ ناچیز کا شمار نہ موصوف کے رشتہ داروں میں سے ہے اور نہ ہی قرابت والوں میں سے البتہ جو بات اس وقت اس موقع پر کہی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ مجھے ین محی الدین کُٹّی سے اتنی ہی محبت اور عقیدت ہے جتنی کہ مرحوم لیس۔یم۔ سرور سے رہی ہے (جو کیرالا میں موپلا قوم کے واحد اردو شاعر تھے)۔

کیرالا کی اردو تاریخ میں ایسا کوئی شخص مشکل سے پیدا ہوگا جس نے ین محی الدین کُٹّی کی طرح ہمہ گیری اور جامعیت کی سطح پر اردو اور اس کے فروغ کی تدبیریں سوچی ہوں اور علمی اقدام کی طرف توجہ کی ہو۔ اسی لیے کیرالا میں اردو زبان کے ارتقاء کی تاریخ میں موصوف کا حصہ کے موضوع گفتگو کرتے ہوئے اگر ہم کیرالا کی اردو دنیا کو موصوف کی زندگی اور سرگرمیوں سے جدا کر دیں تو بات تشنہ رہ جائے گی۔

جناب ین محی الدین کُٹّی کا نام کیرالا کی اردو دنیا میں ہرگز کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ موصوف مستقل مزاجی کے ساتھ پچھلی تین دہائیوں سے مسلسل اور انتھک زبان اردو کی ترقی و ترویج کے لیے جدو جہد کر رہے ہیں۔ اردو کے مشن کے علاوہ انھوں نے کسی دوسری تحریک اور مقصد سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھا۔ اردو کے سوا کسی اور سے دل ہی نہیں لگایا۔ سچ پوچھیں تو موصوف کو بچپن ہی سے اردو زبان سے عشق رہا ہے۔ نیز اردو پڑھنا لکھنا، تقریر کرنا، اردو کی محفلوں میں شرکت کرنا ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ اردو شاعری پر تو وہ جان چھڑکتے ہیں۔ جتنے اردو کے اشعار انہیں یاد ہیں شاید ہی کسی مادری زبان اردو والے کو یاد ہونگے۔ اردو کے جلسوں میں جب وہ تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو ان کی تقریر ختم ہونے تک موقع و محل کے

اعتبار سے بے شمار اشعار سناتے ہیں۔ اردو زبان وادب کی خدمت کرنا محفل مشاعرہ یا کسی ادبی اجلاس کو آراستہ کرنا بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا ان کے اندر یہ جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اس طرح موصوف کا ادبی ذوق بہت بلند ہے جس طرح بچے کو اپنی ماں سے اُنس ہوتا ہے اسی طرح ین محی الدین کُٹّی کو بھی اردو زبان سے وہی پیار ہے۔ غرض اردو زبان موصوف کا اوڑھنا بچھونا اور زندگی ہی نہیں بلکہ ان کا دین وایمان بھی ہے۔

چند شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو نام ونمود اور شہرت پذیرائی سے بے نیاز ہوتی ہیں لیکن یہی بے نیازی ان کی شخصیت کی پہچان بن جاتی ہے۔ عصرِ حاضر میں یہ صفت عنقا ہوتی جارہی ہے۔ کوئی فنکار ہو یا ادیب داد وتحسین نام ونمود اور شہرت سے بے نیازی برتتا ہے تو وہ اپنی مثال آپ بن جاتا ہے۔ جناب ین محی الدین کُٹّی بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک ہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے موصوف زائد از ربع صدی سے تعلیمی اور ادبی میدان میں کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔ یہاں کی ادبی محفلوں میں باقاعدگی سے وہ شرکت کرتے ہیں جہاں کہیں بھی وہ جاتے ہیں اور شرکت کرتے ہیں تو وہ محفلوں کی جان ہوتے ہیں۔ اسی لیے آپ کی شرکت مشاعروں اور ادبی محفلوں کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔ نہ صرف کیرالا کے اندر بلکہ کیرالا سے باہر حیدرآباد، گوا اور دہلی وغیرہ میں اردو زبان وادب سے متعلق منعقد ہونے والے سمیناروں، سمپوزیموں، کانفرنسوں اور ورک شاپوں میں انھیں نہ صرف مدعو کیا جاتا ہے بلکہ بڑے ہی تپاک سے ان کا خیر مقدم بھی کیا جاتا رہا ہے۔ اس طرح کیرالا کے جن احباب سے اردو دنیا کے نام اور کام سے جانکاری یا واقفیت ہوئی ان میں ین محی الدین کُٹّی کا نام سرِ فہرست ہے۔

موصوف کو اردو زبان سے قلبی لگاؤ اور بے حد محبت ہے جس کے فروغ کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں وسرگرداں ہیں۔ جہاں کہیں بھی وہ جاتے ہیں بہت ہی موثر انداز سے گھروں میں اردو کو رائج کرنے اور بچوں کو اردو سکھانے کے لیے ترغیب دیا کرتے ہیں اور لڑکوں اور لڑکیوں میں اردو پڑھنے کا شوق جگاتے ہیں۔ موصوف ہی کی دلچسپی اور انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج لڑکے اور لڑکیاں اردو کی بدولت امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کررہے ہیں۔ اس طرح موصوف نے کیرالا کے کونے کونے میں اردو زبان کو فروغ دینے میں زبردست کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہی نہیں انھوں نے اپنے قیمتی مشوروں اور اصلاحی کارناموں سے یہاں کے اردو کے نئے شیدائیوں کی ہمت افزائی بھی کی ہے۔ اسی طرح جب کیرالا میں اعلیٰ ثانوی تعلیم (ہائر سکنڈری) نظامِ تعلیم

کے شروع ہونے کے بعد لسانی فارمولے پر عمل آواری کے احکامات جاری کیے گئے تو اردو زبان پر بڑے کٹھن دن آئے۔ اس وقت اردو احباب کچھ کتراتے رہے اور کچھ اردو کے صحیح مقام کو سمجھنے اور سمجھانے سے قاصر رہے اور کچھ مایوس ہو کر گھر بیٹھے رہے۔

ان حالات میں اردو کے موقف کا معروضی جائزہ لینا اور معقول مطالبات کی تدوین کرنا پھر ان کو ارباب مقتدر سے منوانے کے لیے حد آداب میں ایک تحریک چلانا اور اس تحریک کے لیے ضروری تنظیم کھڑی کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ اس سلسلے میں ین محی الدین کُٹّی نے آگے بڑھ کر اس ذمہ داری کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنی ساری توانائی اردو کی خدمت میں لگا دی۔ اس سے مہتوں کے توسن فکر و ضمیر کو مہمیز ہوئی اور لوگ آتے گئے اور کاروان بنتا گیا مگر میرا کارواں موصوف ہی تھے۔ ین محی الدین کُٹّی چوں کہ استاد الاساتذہ بھی ہیں اسی لیے کیرالا کے تقریباً تمام اساتذہ اردو کو سرکار کی طرف سے چلائے جانے والے پانچ پانچ دن یا دس دس دن کے کورسس میں Resource Person کی حیثیت سے پڑھایا ہے۔ اس طرح سے درس و تدریس کا کام کرتے ہوئے بھی انھوں نے انجمن ترقی اردو ہند کیرالا شاخ کے معتمد عمومی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ موصوف نے اردو لورس فورم کے ممبر سکریٹری کی حیثیت سے بھی اردو کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اسی لیے کیرالا میں اردو پڑھنے والے طالب علموں کی تعداد بڑھی۔ اس بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ کر ہم حیران تھے اور اردو کی ترقی و ترویج کی کامیاب کوشش پر عش عش کرتے تھے۔ واقعی ین محی الدین کُٹّی نے اس کارہائے نمایاں میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔

یہاں کے معتبر محبان اردو میں معتبر نام ین محی الدین کُٹّی کا ہے۔ جن کا نام بڑے ادب و احترام سے لیا جاتا ہے کہ موصوف نے درسگاہوں سے باہر رہ کر بہت اہم کام کر دکھایا ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ ایسا استاد جو تعلیمی درسگاہوں سے باہر رہ کر کام کرنا ہوا سے کتنی مشکلیں اور رکاوٹیں سے انگریزی، اردو، ہندی اور عربی زبانوں پر عبور حاصل کر لیا۔ اس کے علاوہ فارسی اور ملیالم میں بھی مہارت حاصل کر لی۔ ان زبانوں پر انھیں قدرت تو حاصل تھی ہے۔ درس و تدریس جیسے اہم مضامین مین بھی انھیں درک حاصل ہے۔ آپ اردو زبان و تہذیب کے حقیقی اور زبردست ماہر استاد و معلم ہیں کیوں کہ وہ اردو کی تدریس کو محض اپنا منصبی فریضہ ہی نہیں سمجھتے بلکہ اپنا محبوب مشغلہ خیال کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے اندر تنقید و تحقیق کی بھرپور رنگین کے ساتھ لفظوں کے معنی ان کے محل استعمال، ان کے تلفظ اور ان کے املے کا اچھا ذوق بھی ہے اور اس ذوق کو دوسروں

تک منتقل کرنے کی بھی ان کے اندر لگن ہے۔اس طرح وہ اردو زبان کے لسانی پہلوؤں سے گہری واقفیت رکھنے والے کیرالا کے منفرد وممتاز زبان کے جادوگر ہیں جو اپنے لہجے سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔

جناب ین محی الدین کُٹّی خود ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔محروم تخلص کرتے ہیں اور وقتاً فوقتاً نظموں کے علاوہ غزلیں بھی کہنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی تخلیقات ملک کے مختلف ماہناموں، ہفتہ روزوں اور روزناموں جیسے سب رس، اردو دنیا، منصف، اعتماد کا پھلواری وغیرہ اور کیرالا کے اندر بھی ''اردو ساہتیہ منجری''، ''گیان پیٹھ جیتا گل''، ین۔سی۔آر۔ٹی کا جرنل، پرائمری شِکشک ،نراوَ، دلکش وغیرہ بھی شائع ہوتے رہے ہیں لیکن اپنی گوناگوں سماجی وتعمیری خدمات اور دوسری مصروفیات کے سبب اپنے کلام کو مجموعی صورت دے کر شائع کرنے سے قاصر رہے۔البتہ اپنے دوست ورفیق کے اصرار پر ایک مجموعہ ''پیاری پیاری نظمیں'' کے نام سے 2005ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آ گیا ہے جو ان کا پہلا مجموعہ ہے۔

جناب ین محی الدین کُٹّی جو ملاپُرم Language Teacher Training میں شعبہ اردو کے سربراہ تھے۔ پرموشن کے چلے جانے کے بعد ین محی الدین کُٹّی کو اس شعبہ کی ذمہ داری سونپی گئی۔موصوف کی سربراہی میں اس شعبے نے بڑی تندہی سے اپنا کام کیا اور ان کی تھوڑی سے مدت میں شعبہ چمک اٹھا۔لیکن 2001ء میں پہلے DIET میں پھر SCEAT ترویندرم میں اردو ریسرچ یونٹ کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت انھیں اس یونٹ کا انچارج یعنی ریسرچ آفیسر مقرر کیا گیا۔ریسرچ آفیسر کی ذمہ داری سنبھالتے ہی انھوں نے اپنی محنت، قابلیت، جانفشانی اور شخصیت سے اس شعبے میں چار چاند تو ضرور لگا دیئے مگر ملاپُرم کے Language Teacher Training اور Elite Urdu College, Malapuram اپنی پُر وقار حیثیت سے محروم ہو گئے۔حقیقت یہ ہے کہ موصوف SCERT ترویندرم میں شعبہ اردو سے وابستہ ہونے کے بعد سے کبھی آسودہ اور پُرسکون نہیں رہے۔ان کے ذہن وقلب پر ملاپُرم اور ایل ملاپُرم سے رخصت ہونے کی گرانی شدید تر ہوتی گئی۔ مادرِ وطن سے دلی لگاؤ ہونے کی وجہ سے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود وقتاً فوقتاً ملاپُرم آتے جاتے رہے۔اردو کی نسبت سے جو بھی ادبی اجلاس ملاپُرم میں منعقد ہوتا موصوف اس میں پابندی سے شریک ہوتے بلکہ وقت سے پہلے پہنچنے کی کوشش کرتے اور ملاپُرم میں اردو کے احوال وکوائف سے آگہی حاصل کر کے بڑے خوش ہوا

کرتے۔

بہ ہر حال Elite Urdu College Malapuram سے ان دنوں بھی ان کا رابطہ بدستور قائم رہا۔ ملاپُرم ایلائٹ اردو کالج کی عمارت کی ایک ایک اینٹ پر ین محی الدین کُٹّی کی خدمات کا نقش کندہ ہے جس نے ان کی قیادت میں اَن گنت ایسے لوگ پیدا کیے جن کا نام کیرالا کی اردو تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی جس کا ماضی تمدن اردو کی تاریخ کا ایک جگمگاتا ورق ہے۔ جہاں کبھی اچھے اچھے اساتذہ اردو اپنی خدمات انجام دیئے تھے۔ اب گوشہ نشین میں پڑا ہوا ہے۔ یعنی وہ رونق اور چہل پہل نہیں رہی جو پہلے تھی ۔ ین محی الدین کُٹّی نے اپنی عمر عزیز اس ادارے ہر صرف کی ہے۔ وہ ہمیشہ یہی تصور کرتے تھے کہ ایلائٹ اردو کالج محض ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں بلکہ ہماری تہذیبی علامت ہے۔ اسی لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کیرالا کا دل ملاپُرم ہے تو ملا پُرم کا دل ایلائٹ اردو کالج ہے۔ ین محی الدین کُٹّی دوران ملازمت جہاں بھی رہے اردو زبان کی تشخص کے ساتھ رہے۔ حق، معاملے میں اپنے اصولوں پر ثابت قدم رہنا دیکھے تو کوئی ان سے۔ ضمیر فروشی، وعدہ خلافی، کذب بیانی، جوڑ توڑ، الزام تراشی، ممکن بازی، تملق و چاپلوسی جیسی بری عادات سے وہ بالکل منزہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں ایک دردمند دل دیا ہے اس لیے وہ ہر کس و ناکس کو پریشان حال دیکھ کر اس کی امداد و اعانت ثواب سمجھتے ہیں۔ انھوں نے شہرت و ناموری سے ہٹ کر عزلت گزینی میں ہی اپنی عافیت سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ اتنی علمی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہوئے بھی بہت کم لوگ ایسے ہیں جو موصوف کے علمی کارناموں سے واقف ہوں گے۔

ریاست کیرالا میں 1980ء کے اوائل میں آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی تیار کردہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں لیکن 1985ء کے بعد سے ریاست کیرالا میں یہاں کی سرکا کے تعاون سے ٹکسٹ بُک تیار کرنے کا کام شروع ہوا تو ین محی الدین کُٹّی کو اردو ٹکسٹ بُک کمیٹی کا رکن بنایا گیا۔ اس طرح ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے انھوں نے کئی کتابیں تیار کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس وقت سے آج تک موصوف اسی کام میں مصروف ہیں۔ کیرالا میں اردو پانچویں جماعت سے پڑھائی جارہی ہے۔ ین محی الدین کُٹّی کی نگرانی میں تقریباً 15 یا 20 اردو اساتذہ دن رات کی محنت سے جدید رجحانات کو مدنظر رکھ کر پانچویں سے لے کر اعلیٰ ثانوی جماعتوں تک کی ساری کتابیں تیار ہو رہی ہیں ۔ یہی نہیں اس کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے لیے Hand Book بھی تیار کروا رہے ہیں۔ اس سال سے جو کتابیں بن رہی ہیں ان کی ایک الگ نوعیت

ہے۔ ہندوستان کیا دنیا بھر میں ان کتابوں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

جب سے موصوف نے SCERT میں ریسرچ آفیسر کا عہدہ سنبھالا اس وقت سے اپنی نگرانی میں ٹکسٹ بک کمیٹی کے اصول وضوابط کو ہر طرح سے ملحوظ نظر رکھ کر اس کا تانا بانا درست کیا۔ مدارس اردو کی معیار بندی ہوئی۔ طلباء اور اساتذہ میں تعلیم کا ذوق اور رجحان بڑھایا۔ موصوف کی کوششوں سے نصاب کی تجدید ہوئی اور امتحانات میں فاضل معقولات کا اضافہ ہوا۔ ان کی کوششوں پر غور کریں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موصوف روایتی آدمی نہیں بلکہ روایت کے حسن کو اپنی روح میں سمو کر جدید ٹکسٹ بک تخلیق کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جدید زبان جدید طرزِ اظہار اس کے قصے کہانیاں استعارہ ہیں جدید زندگی کی کشمکش کا۔ اس زندگی کا جو ہزاروں سال کی روایت کی لیکھ سے بھٹک کر میکانکی اور اخلاقی دور میں داخل ہو چکی ہے۔ ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے مدارس وغیرہ اردو کے لیے وہی سب کچھ کر رہے ہیں اس وقت اسے جس کی ضرورت ہے۔ اس طرح ین محی الدین کُٹّیا آج کل اردو ٹکسٹ بک کمیٹی کا علَم تھامے ہوئے ایک محبّ اردو ہیں جن کا خلوص اور محنت واقعی قابلِ رشک ہے۔ الغرض موصوف کی سربراہی میں اس شعبے نے بڑی تندہی سے اپنا کام کیا اور مشابانہ اوزمساعی سے اردو کی عظمت کو دوبالا کر دیا۔ سوال اردو کا ہو یا تعلیم کو جو بھی ہو تسلیم کرنا ہوگا کہ موصوف نے کبھی انتہا پسندی کو بھٹکنے نہ دیا۔ معقول رویہ معقول مطالعہ بات یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی وزیر تعلیم ایسا نہ تھا جس نے ان کی بات نہ سنی ہو نہ مانی ہو اس لیے جہاں تک میرا اپنا خیال ہے موصوف کے رٹائرمنٹ کے بعد اس شعبے میں اس پوسٹ پر پھر ایسا کوئی دوسرا شخص نہ آسکے گا جو مدارس اردو میں نہ صرف زندگی کی لہر پیدا کرتا ہو بلکہ ان مدارس کی گرتی ہوئی ساکھ کو اپنی جگہ مستحکم کرنا ہو۔ اس طرح موصوف نے اردو ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے اردو دنیا میں اپنی ایک الگ پہچان ایک الگ شناخت بنا رکھی ہے۔

کیرالا میں ضلع ملاپُرم کا ایک تاریخی شہر نیز ورنگاڑی کے PSMO کالج کے جناب کما ل پاشا اور عبدالرزاق سُلّمی نے ملیالم زبان میں ''قرآنٹڑے چرتر بھومی لوڈے'' کے نام سے ایک Documentry نکالا اور اس کے اردو ترجمے کا بیڑا اٹھایا تو انھیں ایک باصلاحیت اور محنتی معاون اردوداں کی ضرورت پیش آئی جسے بیک وقت عربی اردو ملیالم زبانوں میں مہارت حاصل ہو۔ اس سلسلے میں ان کی نظر جناب ین محی الدین کُٹّی پر پڑی اور انھوں نے اس عظیم کام کے لیے موصوف کو آمادہ کر لیا۔ اس سلسلے میں ین محی الدین کُٹّی نے بڑی محنت اور کدوکاش سے کام کیا اور

عبدالرحمٰن اورعبدالمجید ان دونوں کی مدد اور انتھک کوششوں سے قرآنی آیات کے مفاہیم کے ساتھ ''قرآ ئنڈے چرترا بھومی لوڈے'' ملیالم Documentry کا اردو ترجمہ بنام ''قرآن کے تاریخی مقامات'' تیار ہوکر منظر عام پر آیا اور بے شمار لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ بنا اور آج بھی اللہ کے بندوں کی ایک بڑی تعداد اس سے مستفید ہو رہی ہے۔اس ترجمے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور مکمل بامحاورہ ترجمہ ہے۔

غرض ان دنوں جناب ین محی الدین کُٹّی اپنے تحقیقی مقالے کی پیش کش کے لیے معروف جہد ہیں۔اس طرح مستقبل میں قریب وہ ڈاکٹر بھی بن جائیں گے۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ین محی الدین کُٹّی کی خیر و عافیت کے ساتھ یوں ہی زبانِ اردو کی خاموش خدمت کرتے رہیں۔آمین

☆☆☆

ڈاکٹر سید اقبال خسرو قادری کی نظم نگاری

ڈاکٹر شاذیہ بیگم،
صدر شعبۂ اردو، ایس. کے. آر گورنمنٹ کالج برائے خواتین (خودمختار)، کڈپہ

ڈاکٹر سید اقبال خسرو قادری' کڈپہ' علاقہ رائل سیما' آندھرا پردیش کی معزز ادبی شخصیت اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ انھوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں' جن میں سیمیا' یامنی' اسفار کے علاوہ شب زاد' خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس مقالے میں ڈاکٹر سید اقبال خسرو قادری کی نظم نگاری کے ضمن میں ان کے دو شعری مجموعے ''سیمیا'' مطبوعہ 2005 اور ''یامنی'' مطبوعہ 2012 کے حوالے سے گفتگو مقصود ہے۔

سیمیا کی پہلی نظم ہے ''مقدمہ''۔ اس میں خسرو صاحب نے عصر حاضر کا نوحہ کیا ہے کہ اس عہد میں کسی کو نہ بات کرنے کا سلیقہ ہے اور عذر پیش کرنے کا طریقہ۔ ہر آدمی صفر ہی صفر ہے۔ کسی میں کوئی صلاحیت نہیں ہے جو تعریف و توصیف کے مستحق ہیں۔ انہیں یہ چیزیں نہیں مل رہی ہیں۔ جو مدح کے لائق نہیں ان کی مدح کی جا رہی ہے۔ ہر بونا اپنے آپ کو سب سے بلند تر سمجھنے کی شدید غلط فہمی کا شکار ہے۔ ہر شخص مفاد پرستی' خود غرضی' انانیت جیسے بھیانک عفریتوں میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ عفریت آدمی کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

آج کے شاعر کے پاس کہنے کے لیے کچھ نیا نہیں ہے۔ وہی پھٹے پرانے اور بوسیدہ الفاظ ہیں۔ نہ افکار تازہ ہیں' نہ ترکیب نئی ہے۔ اس کے باوجود ایسے لوگوں کو زبان دانی کا غرّہ اور زبان دانی کا دعوی ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہئے تھا کہ اگر اللہ تعالی کسی کو کوئی خوبی عطا کرے تو اسے اللہ کا احسان اور اس کا کرم مانے۔ اگر خامی اور غلطی ہو تو اسے اپنی طرف منسوب کرے۔ مگر آج کا ادیب اور شاعر محنت سے جی چراتا ہے۔ کوشش اور جدو جہد سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ کم فہمی' کج فہمی' تن آسانی ہمارے دور کے ادیب کی شناخت بن گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھی شاعری اور معیاری شاعری جنم نہیں لے رہی ہے۔ کچھ نئی بات نہیں ہے۔ وہی مکھی پر مکھی مارنے

کی روش لوگ اختیار کرتے ہیں۔خسرو صاحب کی یہ نظم جو مقدمہ کے عنوان سے اس کتاب میں شامل ہے، قابل مطالعہ ہے، وسیع المفہوم ہے۔اس میں جہانوں کو موصوف نے سمیٹ کر رکھدیا ہے۔ملاحظہ فرمائیں نظم ''مقدمہ'':

''//اس عہد انحطاط کے/مصلحت پرست دماغوں میں/ سچ کی تلخیوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ مفقود/جھوٹ کی وقتی لذتوں کو ہضم کرنے کی طاقت نابود/ اعتراف شکست کی اخلاقی جرأت/ نہ حصول فتح کا ظرف اور صلاحیت/ نہ صف آرائی کا طریقہ!/ نہ عذر لنگ کا سلیقہ!/حق جوئی کا فاترالعقل سپاہی/ چاروں کھونٹ گھوم گھوم کر/کبھی کا حواس باساختہ ہو چکا/اپنی صفر در صفر دیوانگی کی چھاؤں میں/ بے سدھ سو رہا ہے/کیا عوام کیا خواص سب کے سب/منتخب موتیوں کے ہار/ بصد شوق خنزیر گردنوں کی نذر کر رہے ہیں/لیکن کوئی سانولا/ اپنے دیومالائی رتھ سے/قدم نیچے نہیں دھرتا/نوگزی دستار/روز وشب وہی سب بگھارتی رہتی ہے/ بذات خود جس پر کبھی عمل فرماتی نہیں/قلم کی تلوار ضرورتوں کی نیام میں قید؟/ تیغ زباں حق پرست'/ مرہون زنگ مصلحت!/آنکھیں کس کو نہیں پہچانتیں/جسم فقط جسم کا شناخت نامہ تسلیم کرتا ہے/نحیف ونزار افکار / فلسفے، اخلاق، اشعار/ بڑی دشواری سے سانس سانس زندہ ہیں/ استخوانی مٹھیوں میں/ وہی پرانے، سوکھے سہمے، ادھ مرے الفاظ!/محض الفاظ جو نہ انگور بن سکتے ہیں۔/ نہ چاول کا دانہ، نہ پانی کا قطرہ/ایک زاد انگلیوں کے بیچ/ ذرہ ذرہ وقت پھسکتا جا رہا ہے/'' کلام کرو؟ تاکہ پہچانے جاؤ''/ زبان دانی کا دعویٰ/ استادی کا غرّہ/سخن طرازی کا ادّعا' کچھ بھی تو نہیں!/ مجھ سے کم علم کی قابلیت کجا!/ جزویست از پیغمبری کی گراں بار امانت کجا!/ کچھ خوبیاں ہیں!/تو مالک لوح وقلم کا لطف واحسان وکن!/ خامیاں؟/کوزہ پشت عقل وخرد کا خمار/کم فہمی اور تن آسانی کے برگ وبار! /غریب مسئلہ یہ'/کہ تمام تر کوتاہیوں کا عرفان بھی ہے/ الف الف عجز وانکسار کے سامان بھی/مگر .... باوجود ایں صورت حال/احساس کمتری کا فقدان بھی/نگاہ تنقیص کی رو سے/ ہزار معائب نکل آئیں!/ نگاہ انصاف'/ دو چارہ محاسن کی نشاندہی تو کرے گی؟//''

''یامنی'' ڈاکٹر اقبال خسرو قادری کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ نومبر 2012ء کو اردو اکیڈمی' آندھرا پردیش کی جزوی مالی امداد سے شائع ہوا۔ایک سواٹھائیس(128) صفحات پر مشتمل اس مجموعہ کا سرورق اسکیچ'عرفات علی خاں' کمپیوزنگ سید طاہر احمد' تجسیم' تزئین' پیش کش' دبستان پبلی کیشنز' کڈپہ کا ہے۔اس کی قیمت لائبریریوں کے لئے -/200 ہے۔اس

کتاب پر ڈاکٹر اقبال خسرو قادری کو ریاستی سطح پر مقابلے میں دوسرا مقام حاصل ہوا اور انعام کے طور پر چھ ہزار روپئے نقد رقم' اور تمغہ ساہتیہ اکاڈمی اردو' حیدرآباد کی جانب سے آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

اس کتاب کا انتساب آپ نے آپ کی والدہ (مرحومہ) کے نام کیا ہے۔ اس میں 55 نظمیں' ایک مرثیہ (والدہ مرحومہ پر) 'شب زاد نظمیں' کے عنوان کے تحت 13 نظمیں اور 2 رباعیات شامل ہیں۔

''یامنی'' کی نظم ''نیامداری'' میں بھی سیمیا کی نظم ''مقدمہ'' کی طرح آج کے شعراء پر گہرا طنز کیا گیا ہے۔ آج کے شاعر کو ''نیامداری'' کے استعارے سے مخاطب کرتے ہیں جو غزل کہنے کا صحیح ذوق تک نہیں رکھتے۔ پھر بھی غزل گو شاعر کہلاتے ہیں۔

نظم ''نیامداری'' ملاحظہ ہو :

''//کڑی جہالت/ بہ شوق دل سردار اکھ سے ہاتھ' تاپتی/ لپی پتی' بے سری طوائف/ اداس غزلیں الاپتی ہے/ نشان تہذیب وشان اردو/ مزاج داں زبان اردو/ بہ زعم خود فخر میر و غالب/ بہ زعم خود پاسبان اردو/ غزل کو بے آسرا سمجھ کر/ کبھی کبھی از رہ ترحّم/ ذرا سا ستانے کی اجازت بھی بخشتا ہے/ ذرا بدلنے کو رنگ محفل/ نئے نئے منتر جاپتا ہے/ رٹے رٹائے خیال کی ڈگڈگی بجا کر/ منافق الفاظ ایک ترتیب میں سجا کر/ فساد پر نابکار نظمیں الاپتا ہے/ وطن کی مٹی سے' / ماں کی چادر سے' ماں کی بولی سے/ اپنی الفت کا پیٹتا ہے ڈھنڈورا شب بھر/ نیامداری...... سدھائے بندر نہیں نچاتا !/ نئی نئی طرز والے گھنگھرو/ گھسی پٹی شاعری کے پیروں میں باندھتا ہے / غزل نچاتا ہے.......!/ ناچتی ہے سخن سے بے بہرہ داد و تحسین/ سمیٹ کر رات کی کمائی/ بڑے تکبر سے/ اپنے زعم سخن وری پر ڈکارتا ہے/ سخن کی تقدیس پر بھی/ کچھ سکہ بند جملے بگھارتا ہے/ غزل کو لیکن/ گرسنہ تشنہ ہی مارتا ہے.......... !//''

''سیمیا'' کی نظموں سے ''یامنی'' کی نظموں کے سفر تک ڈاکٹر خسرو تھوڑا عام فہم اور سادہ گو نظر آتے ہیں۔ ان کی اکثر نظمیں دنیائے فانی کا تصور پیش کرتی ہیں۔ ''یامنی'' کی بہترین نظموں میں '' سپر بھات'' ''ہجرت'' '' مسخرے کی موت'' '' رقص جنوں'' '' نادانشوری'' ''نروان'' ''دغا'' اور ''مستاجر'' وغیرہ ہیں۔

خسرو کی نظموں کی یہ خاصیت ہے کہ ان میں مشکل ترین اور آسان ترین لفظیات کا

استعمال ہوا ہے۔خسرو عربی و فارسی لفظیات سے شعوری طور پر اجتناب کرتے ہیں۔آپ کے یہاں نیم استعارہ، نیم اشارہ کی کیفیت پائی جاتی ہے۔میرا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی بھی خیال یا کسی بھی موضوع کی طرف واضح طور پر اشارہ نہیں کرتے، بلکہ ابہام کو اپنی نظموں میں بطور خاص شامل کرتے ہیں، لیکن آپ کا ابہام زیادہ بلیغ اور زیادہ فصیح ہوتا ہے جو اہل علم، اہل زبان کے لیے لطف کا کام دیتا ہے۔ان کی نظموں کے موضوعات عامیانہ ذہن اور عام سوچ سے الگ ہوتے ہیں۔ وہ ایسے ایسے موضوعات پر بھی نظم لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جن کو ہم نہایت معمولی اور پامال موضوعات خیال کرتے ہیں۔مثال کے طور پر میں ان نظموں کے عناوین پیش کرنا چاہوں گی۔ ملاحظہ کریں :

۱۔جوکر ۲۔رانگ نمبر ۳۔تماشہ ۴۔بیعت ۵۔شاید

۶۔مسلوک ۷۔آ بگینہ ۸۔میراث ۹۔تجزیہ ۱۰۔شناخت

ڈاکٹر سید اقبال خسرو قادری کے تأثرات عام لوگوں کے تأثرات سے بالکل الگ ہیں۔جیسے جلسۂ تعزیت کے بارے میں آپ کی نظم ''جشن ارتحال'' ہے اس میں آپ نے بتایا ہے کہ عام طور پر مرنے والے لوگوں کے بارے میں جلسۂ تعزیت کے نام پر جو مجلسیں یا محفلیں منعقد ہوئی ہیں ان میں زیادہ تر تعزیت کرنے والے رسمی طور پر تعزیت کرتے ہیں۔ان کے الفاظ میں حقیقی درد و کرب نہیں ہوتا۔یہ ایک رسم ہوتی ہے، رسمی باتیں ہوتی ہیں۔

نظم '' آبگینہ'' میں موصوف نے انسانیت کے نفاق کو ظاہر کیا ہے۔معاشرے کے وہ کردار جو سامنے کچھ اور پیچھے کچھ ہوتے ہیں جو کسی کے سامنے تو اسکی تعریف کرتے ہیں مگر پیٹھ پیچھے اس کی چغلی کرتے ہیں۔ایسے غلیظ کرداروں کے بارے میں نہایت نازک اور مختصر نظم '' آبگینہ'' بڑی معنی خیز اور لطیف ہے۔بلاشبہ اختصار اور جامعیت کا حسن اس نظم کا خاصّہ ہے۔

نظم 'دھمال' کو ''سیمیا'' کا حاصل بھی کہہ سکتے ہیں۔اس نظم کا مزاج، اسلوب، طرز اور انداز کتاب کی دیگر نظموں سے یکسر مختلف ہے۔لگتا ہے کہ خسؔرو نے یہ نظم ایک خاص کیفیت میں تحریر کی ہے۔نظم پڑھتے ہوئے ساری دنیا کے فانی ہونے کا احساس شدت سے ابھرتا ہے۔ لگتا ہے کہ یہ دنیا، یہ دنیا کے کاز، اس دنیا کے عہدے کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔صرف اللہ ہی سب سے اہم ترین ہیں۔ان سے بڑھ کر ان سے اعلیٰ و ارفع کوئی اور نہیں ہے، کبھی بھی نہیں ہے۔

''راج گرو'' نامی نظم میں آپ نے بتایا ہے کہ آج جو بھی بڑے بڑے عہدوں پر

فائز ہیں وہ ان عہدوں کے لائق نہیں ہیں۔ عام طور پر نالائق لوگ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ گویا کہ خنزیر کے گلے میں ہیروں کا ہار ڈال دیا گیا ہے۔جس سے خنزیر کی اہمیت میں تو اضافہ نہیں ہوا۔الٹا ہیروں کی عظمت میں کمی آ گئی ہے۔ساری دنیا پر نظر ڈالیں' اس بات میں آپ کو صداقت نظر آئے گی۔آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔

کڈپہ کے شعروادب پر ڈاکٹر ستار ساحر نے اپنی کتاب ''میزان'' میں ''شہر کڈپہ کا ادبی منظر نامہ'' کے ضمن میں ڈاکٹر سید اقبال خسرو قادری کا تعارف کچھ اس طرح پیش کیا ہے :

''کڈپہ کے جواں سال شاعروں میں صاحب دیوان اقبال خسرو اک مستند اور معتبر شاعر ہیں ۔منہاج' مدرکہ' اعیان' سیمیا' اورنگ' اسفار وغیرہ بحیثیت شاعران کی پہچان ہیں۔انہوں نے اپنی شاعری میں ہر زاویہ سے ایک جہان دیگر تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے۔خسرو کی شاعری بے باکی اور تجربوں سے عبارت ہے اور ہر اعتبار سے جدید۔''(ڈاکٹر ستار ساحر تصنیف : میزان ص:21)

ڈاکٹر ستار ساحر نے خسرو کی نظم پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے :

'' ''سیمیا'' کی نظموں میں سماجی ناہمواریوں پر طنز کے ساتھ ساتھ شاعر کے مزاج میں برہمی پیدا کرنے والے زندگی کے مختلف عناصر خاصی تعداد میں ہیں۔مزاج کی برہمی سے شاعر پر تلخی جھلاّہٹ اور جھنجلاہٹ کا الزام لگ سکتا ہے لیکن اقبال خسرو نے انتہائی خوش اسلوبی سے اپنا دامن بچاتے ہوئے 'سیمیا' کی بیشتر نظموں کو جذبے کی شدت اور جوش تک محدود رکھا ہے۔''(ڈاکٹر ستار ساحر تصنیف : میزان ص: 114)

ساغر جیدی نے خسرو کی سیمیا پر مختصر منظوم اظہار رائے کیا ہے،غر جیّدی کہتے ہیں:

''//اقبال خسرو قادری کی سیمیا کو/ دل سے نہیں دماغ سے چاہتا ہے/ اچھی طرح خسرو بھی واقف ہے نبر اس اردو کی لولرزیدہ ہے/گل نہیں ہوئی / کیونکہ سیمیا نظموں کا ہر لفظ/ دوسرے/ منہاج لفظ کی نشاندہی میں لگا ہوا ہے/ اس لیے شاعر سیمیا/ اردو نظموں کی فضائے مردنی میں/ زندگی کے انفاس ابدی بھرنے میں کوشاں ہے/ یہ بھی ساغر کا معروضہ ہے/ کہ سیمیا

نظموں پر سوچنے میں/ ہر سیمیابی مدرکہ ورثہ پا نہیں سکتی۔//''

اقبال خسرو قادری کی نظموں کا اسلوب ایہام' ابہام سے عبارت ہے۔ یہاں آپ کو طرح طرح کے تجربے ملیں گے' استعارہ و کنایہ ملے گا' بلاغت و فصاحت ملے گی' لیکن یہ شعوری طور پر نہیں۔ وہ جان بوجھ کر ادق سے ادق الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ عربی و فارسی لفظیات سے بھی گریز کرتے ہیں۔ آپ کی نظمیں خالص اردو کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ آپ کی نظموں میں غنائیت ہے' حسن ہے' طنز کا ٹھائیں مارتا سمندر ہے' وہ سب کچھ جو ایک باشعور قاری چاہتا ہے اور تلاش کرتا ہے۔

ڈاکٹر وحید کوثر نے سیمیا پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے :

> ''سیمیا'' کے مطالعے سے شاعر کے مشاہدے کی وسعت' فکر کی گہرائی' علمت و قابلیت' تجربات و مشاہدات کو پیش کرنے کا سلیقہ سبھی کچھ اجاگر ہوتا ہے۔ فتح و کامیابی مور کی طرح خوب صورت ہوتی ہے لیکن اس خوب صورتی کے نشے میں انسان شکست و ہار کو کہنے اور برداشت کرنے کا حوصلہ گنوا بیٹھتا ہے۔ دراصل یہی حوصلہ فتح کے نشے سے زیادہ قیمتی اور اہمیت کا حامل ہے۔'' (ڈاکٹر وحید کوثر، شعر اور شعور، 2008، ص:114)

اور ایک مقام پر ڈاکٹر صاحب نے ''سیمیا'' کی بیشتر نظموں کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

> ''سیمیا'' کی بیشتر نظموں میں انسانی کردار کے دوغلے پن اور اس کی سماجی و نفسیاتی کمزوریوں اور سماج کے بندھے ٹکے رسم و رواج کے کھوکھلے پن کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ تو دوسری طرف اعلیٰ تہذیبی اقدار کے زوال' جدید ذہنیت کی بے مایگی' مفاد پرستی' مصلحت کوشی کا آئینہ بھی قاری کے ہاتھوں میں دیا گیا ہے۔ ایمان' یقین' تصوف جیسے پاک موضوعات پر قہوہ خانوں میں سگریٹ کا دھواں اڑانے والے کم علم لوگ بحث کر رہے ہیں اور اپنی دانشت میں وہ ان موضوعات کا حق ادا کر رہے ہیں۔'' (ڈاکٹر وحید کوثر، شعر اور شعور، 2008، ص:115)

خسرو کی نظمیں عام قاری کے لیے نہیں ہیں، کیونکہ ان میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ ادق ترین زبان ہے۔اس زبان سے زیادہ تر علمی حلقہ واقف ہے اور تفہیم کی صلاحیت رکھتا ہے۔عامۃ الناس کے لیے اگر خسرو ہلکی پھلکی زبان استعمال کرتے تو شاید عام لوگ بھی خسرو کے تجربات و مشاہدات میں شامل ہو سکتے۔میرے اس قول کی تائید ڈاکٹر وحید کوثر نے بھی کی ہے۔ لکھتے ہیں :

''اس مجموعے کی ہر نظم خسرو کے کسی نہ کسی تجربے یا مشاہدے کی غمّاز ہے۔ تجربہ جس قدر سنگین رہا ہے اظہار میں اتنی ہی تلخی نمایاں ہے، مشاہدہ جتنا ناگوار رہا ہے طنز کے تیر اتنے ہی نکیلے اور تیز ہیں۔ان سب سے وہی قاری مستفید ہو سکتا ہے جس کی علمی صلاحیت سند رکھتی ہو۔اس لیے بھی کہ خسرو قادری کی جدت پسندی ان کی مشکل پسندی کے تابع ہے۔اگر یہ جدت پسندی سہل نگاری کا سہارا لے لے تو پھر خسرو کی شاعرانہ عظمت عام ہو جائے۔'' (ڈاکٹر وحید کوثر، شعر اور شعور، 2008، ص:118)

جناب سید وصی اللہ بختیاری عمری نے ''سیمیا'' پر خوب صورت اور مرصع مضمون تحریر کیا ہے، جو جشن کڈپہ کے ساونیر کی زینت بنا۔اس میں وصی بختیاری صاحب نے ''سیمیا'' کی تمام نظموں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔مختصر الفاظ میں نہایت جامعیت کے ساتھ موصوف نے خسرو کی نظم گوئی پر لکھا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''نظم 'دھمال' اگرچہ صرف آٹھ بندوں پر مشتمل ہے لیکن تاثیر و تأثر کے لحاظ سے نہایت اثر انگیز ہے، کیونکہ سبق آموز اور عبرتناک اشاروں سے اس کا پیمانہ لبریز ہے۔دنیا کی بے ثباتی اور سرائے فانی کے جلوے نظر آتے ہیں اور حیات مستعار کی ماہیت منکشف ہوتی ہے۔'' (خسرو اقلیم سخن، ساونیر: جشن کڈپہ، 2006، ص:19)

اہل علم اور اہل ادب نے ڈاکٹر سید اقبال خسرو قادری کی نظم نگاری کا کماحقہ اعتراف بھی کیا ہے۔ذیل میں چند اہلِ نقد کی آرا درج کی جا رہی ہیں، جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نظم نگاری کا اعتراف کرتے ہوئے متعدد اہل علم نے خطوط لکھ کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

حضرت شمس الرحمٰن فاروقی نے یوں لکھا ہے :

'' ''سیمیا'' میں آپ کی طویل نظم درمدح شخصے' بہت پسند آئی۔ طنز و مزاح اور ہجو کا بہت عمدہ امتزاج اور میر و غالب کے مشہور اشعار کے انداز میں انھیں کے قافیوں کے ساتھ دیر تک بات کو نبھاتے رہنا' بڑے کمال کی بات ہے۔ مجھے بہت لطف آیا اور دل چاہا کہ ایسی کچھ نظمیں اور بھی کتاب میں شامل ہوں۔'' (بحوالہ خط مورخہ 24 ستمبر 2006، شمس الرحمٰن فاروقی' الہ آباد' یو. پی.)

مشہور افسانہ نگار اقبال متین نے ''سیمیا'' کے تعلق سے اپنے احساسات یوں ظاہر کئے ہیں :

'' آپ کے شعری آہنگ کی انفرادیت آپ کے لفظیات کی اجنبی اپنائیت بڑی وابستگی سے گذارتی ہے۔ کہیں کہیں الفاظ کے دروبست میں اظہار کی مشکل پسندی کا چسکہ لہجے کی غنائی سپردگی کو مجروح بھی کرتا ہے۔ اس نازک سے فرق کو آپ احساس کا حصہ بنا سکیں' یہ میری دعا ہے۔'' (بحوالہ خط مؤرخہ 21 اپریل، 2009)

سالک نائطی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

'' آزاد نظموں پر مشتمل اس مجموعہ کی اشاعت جاذب نظر ہے اور اس کی تحریرات جاذب دل ہیں۔ اعتراضات کی بہت کم گنجائش ہے۔ فکریات و مشاہدات کی جھلکیاں بہت زیادہ' زاویاتی سوچ کا الزام ان کے سر نہیں تھوپا جاسکتا' ہر نظم چند ایک بلکہ انیک حقیقت پسندانہ مشاہدات پر مبنی ہے۔ تسلسل بیان یقیناً اپنے پنجۂ گرفت سے قاری کو اس وقت تک رہا نہیں کر سکے گا جب تک کہ قلم کار اپنی اپنی بات ختم نہیں کرلے گا۔ اقبال خسرو صاحب کو ان کی نظموں کے پس منظر میں بہت کچھ پڑھا جاسکتا ہے۔ نام کا انتخاب بھی خوب ہے۔'' (بحوالہ خط مورخہ 3 مارچ، 2003)

ڈاکٹر رؤف خیر' حیدرآباد' سیمیا کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں :

’’سیمیا‘‘ کا نام ہی نہیں حرف حرف چونکا تا ہے۔ ویسے میں آپ کے منہج و منہاج سے واقف ہوں۔ بعض شاگرد اپنے استاد کے حوالے سے جانے جاتے ہیں لیکن آپ کے فکر وفن پر استاد ناز کرسکتا ہے۔ جس طرح آپ کی غزلیں تمام اچھوتے اسلوب کی حامل ہوتی ہیں اسی طرح نظموں کا یہ مجموعہ ’سیمیا‘ بھی منفرد ہے۔ آپ کے ’ڈرائنگ روم‘ میں تو اچھا خاصا صاحب علم بھی اپنے آپ کو جاہل محسوس کرتا ہے ویسے یہ آپ کا انکسار ہے کہ کہتے ہیں مصلحی تو اے تو سلطان سخن اور یہی انکسار آپ کو افتخار بخشے گا۔ جدید شاعری کے دعوے داروں کے لئے سیمیا ایک چیلنج سے کم نہیں ۔‘‘(بحوالہ مکتوب، مورخہ:17-03-2006 رؤف خیر‘ حیدر آباد)

Dr. Shaziya Begum

Head, Department of Urdu

SKR & SKR Government College for Women (Autonomous)

KADAPA - 516001

Mobile: 9866999808

Email: shazeeyahod.urdu@gmail.com

تاریخ النوائط: عزیز جنگ ولا کی نایاب تصنیف

ڈاکٹر قیصر احمد، شعبۂ فارسی، مانو، حیدرآباد

شہر حیدرآباد میں بہت سے اہل وعلم وادب گزرے ہیں جنہوں نے اپنا پورا علوم وفنون کی ترویج میں لگا دیا، ان شخصیات میں ایک نمایاں شخصیت کا نام عزیز جنگ ولا ہے ان کی مختلف حیثیتیں ہیں وہ بیک وقت بہترین شاعر ونثر نگار تھے۔تو دوسری طرف صحافی، تاریخ داں، ماہر نباتات، ماہر حیوانات، لغت نویس، قانون دان، فن سیاق کے ماہر الغرض ان کے اندر بہت سی صلاحیتیں پائی جاتی تھیں۔اور ہر فن میں وہ استاد تھے۔ ہر فن میں انہوں نے اپنا لوہا منوایا۔محنت عزیز جنگ ولا کی فطرت میں شامل تھی۔وہ منبع علوم وفنون تھے۔حقیقت میں آپ عبقری انسان تھے۔ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب محمد عمر صاحب مہاجر نے مرقع سخن جلد دوم میں لکھا ہے کہ:

> ''''کہا جاتا ہے کہ بیسویں صدی کے ربع اول میں ہر قسم کی معلومات بہم پہونچانے واحد ذریعہ حیدرآباد میں صرف نواب عزیز جنگ کی ذات تھی۔اس زمانے کے مصنفین ومولفین کو ان کے وجود سے گرانقدر مدد ملتی رہی۔ان کی زندگی حیدرآباد کی ایک ایسی زندہ تاریخ تھی جس میں یہاں کی معاشرت ، یہاں کے رسم و رواج اور یہاں کے علمی کارناموں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں''(۱)

عزیز جنگ ولا نے باقاعدہ تاریخ تاریخ النوائط کے نام سے لکھی ہے، ان کا تعلق خود قوم نوائط سے تھا۔اس کتاب میں عزیز جنگ ولا نے خاندان نوائط کا نسب، واقعات ہجرت،

مذہبی افکار، رسم ورواج اوران کے القاب وغیرہ بیان کئے ہیں۔اس کی تقریظ علامہ شبلی نعمانی نے تحریر فرمائی ہے۔اسی بات سے اس کتاب کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس کی تقریظ میں علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ:

''ابتداء اسلام سے عرب کے سینکڑوں خاندان ہندوستان میں آ کر آباد ہوئے جن کے کارنامے چہرہ تاریخ کے خط و خال ہیں ان میں نوایط کا خاندان ہے جو آج سے سینکڑوں برس پہلے ہندوستان میں آیا اور بڑی کامیابی کے ساتھ مدراس اور دکن کے حصوں میں پھولا پھلا اور آج یہی خاندان امتیاز کے ساتھ قائم ہے۔اور یادگاریں ان ممالک میں ہر جگہ ایک خاص نام و نمود رکھتی ہیں۔ یہ کتاب اسی خاندان کے حالات میں نواب عزیز جنگ بہادر کی تصنیف ہے۔''(۲)

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر حسن الدین احمد نے اپنے ادارے ولا اکیڈمی حیدرآباد کی جانب سے طبع کروایا۔دوسرے ایڈیشن میں انہوں نے دو دیباچہ بھی شامل کیا جو پہلے ایڈیشن کا جز تھا۔جس سے ہمیں کتاب لکھنے کی غرض و غایت معلوم ہوتی ہے۔دوسرے ایڈیشن میں ڈاکٹر حسن الدین احمد نے دو مضامین کا اضافہ کیا۔ پہلا مضمون ولا کے حالات سے متعلق ہے اور دوسرا مضمون ابتدائی باتیں کے عنوان سے ہے جس میں انہوں نے اپنے خاندان کے حوالے سے بہت سی باتیں کی ہے۔حضرت جعفر طیار سے ان کا سلسلہ نسب جا ملتا ہے جس پر انہوں نے بہت ہی فخر کا اظہار کیا ہے۔

کتاب کے سبب تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے عزیز جنگ

ولا اپنے مخصوص انداز میں یوں لکھتے ہیں:

''مجھکو اس تاریخ کی تالیف کا خیال ایک عرصہ سے تھا لیکن سلسلۂ ملازمت اور سخت عدیم الفرصتی اور مباسب الوقت تالیفات کے اشغال نے میرے خیال کو ایک عرصۂ دراز تک پورا ہونے نہ دیا، جب مجھ کو وظیفہ حسن خدمت کی نعت نصیب ہوئی اور کافی فرصت ہاتھ آئی تو مخدوم معظم جناب مولوی غلام علی قریشی نایطی اول تعلقہدار وظیفہ یاب سرکار نظام اور شفیق مکرم جناب مولوی محمد عبدالقادر شافعی نایطی رجسٹرار بلدہ حیدرآباد ادام اللہ برکاتہما کے ارشاد اور اصرار نے اس رسالہ کی تالیف پر مجھ کو آمادہ کر دیا۔ یہ رسالہ فن تاریخ میں میری تالیف کا پہلا یادگار ہے۔جس کو میں نے تاریخ النوایط سے نامزد کیا ہے۔چار باب پر شامل ہےاور ہر ایک باب میں دو فصل ہیں میں نہایت کم معلومات کا شخص ہوں۔اپنی کم سوادی پر مجھ کو شرم آتی ہے''(۳)

ڈاکٹر حسن الدین احمد اسی خاندان کے ایک فرد تھے ان کو اپنے آباء واجداد کی تحریروں کی قدر و قیمت کا اندازہ تھا۔بایں وجہ انہوں نے عزیز جنگ ولا کی بہت سی نایاب و نادر تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کیا۔یہ کتاب چونکہ ایک عرصے سے نایاب تھی اس لئے اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع کیا گیا۔

اس ذیل میں حسن الدین احمد لکھتے ہیں کہ:

''شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولا نے جو خود اس خاندان نوائط کے معزز فرد تھے۔۱۹۰۴ء میں

اپنے خاندان کی مبسوط تاریخ ''تاریخ النوائط''لکھی۔اس کتاب کواہل ملک نے عام طوراور نائط برادری نے خاص طور پر بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا یہ کتاب گزشتہ نصف صدی سے کمیاب بلکہ نایاب ہے۔

مجھ کو تاریخ النوائط کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کا خیال ایک عرصہ سے تھا لیکن سلسلۂ ملازمت کی عدیم الفرصتی،دیگر مصروفیات اور وسائل کی عدم فراہمی نے میرے خیال کو ایک عرصہ دراز تک پورا ہونے نہ دیا۔عزیزی قمر خلیل صاحب کا شکر گزار ہوں جنھوں نے وقتاً فوقتاً اس اہم کام کی جانب متوجہ کیا''(۴)

اب اس کتاب کے مشمولات پر نظر ڈالتے چلیں:

اس میں قوم نائط کے حالات وجہ تسمیہ،نسب،ہجرت،قوم نائط کا مذہب و مخصوصات،قوم نائط کی پابندی کفو،قوم نائط کا پردہ،قوم نائط کا لباس،قوم نائط کی زبان،تعلیم و تربیت،قوم نائط کی صدارت،شادی،قوم نائط کی منگنی،قوم نائط کی شادی،قوم نائط میں بیوی کی صحنک،رت جگا،قوم نائط میں منجے کی رسم ،سانچق،مہندی ،شب گشت،سہرا،مہر ،عقد،جلوہ،رونمائی،سلامی ،نازگشت،قوم نائط میں بیوہ کا عقد،قوم نائط میں تعزیت ،تہنیت کا رواج،قوم نائط میں ستواسا،نوماسا،بانگ کا گڑ،قوم نائط میں چھٹی،نام رکھائی، چھلہ ،سال گرہ،دودھ بڑھائی،مکتب،سالگرہ،کان چھدائی،ختنہ،الائچی کی رسم،قوم نائط میں باجوں کا رواج،قوم نائط میں رنگ کھیلنا،سکاگ،زیور کارواج،قوم نائط کے القاب وغیرہ۔

قوم نائط کے القاب کے ذیل میں حروف تہجی کے لحاظ سے نہایت تفصیل کے ساتھ انہوں نے گفتگو فرمائی ہے جس سے ان کی علمیت،اپنے خاندان سے لگاؤ،فن تاریخ پر زبردست عبور کا اندازہ ہوتا ہے۔اس حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''شریف۔یہ لقب شریف نائطی کی اولاد نے اختیار کیا ہے جن کا مقام کنبایت میں تھا۔مولف کو اس لقب کے کسی بزرگوار سے ملاقات کا اتفاق نہیں ہوا۔بعض بزرگان قوم نے کہا کہ شاہی

حکومت گوا میں ایک شرعی عہدہ شریف کے نام سے قائم تھا۔اوسی طرح جس طرح آجکل برٹس انڈیا کے انتظام میں بھی اس نام کا ایک عہدہ ہے کچھ عجب نہیں کہ اس لقب کے مورثین میں سے کسی کو یہ عہدہ عطا ہوا یہ محض خیال ہے''

بہر کیف عزیز جنگ ولا کی تاریخ نویسی اورفن پر عبور کا ہمیں اس کتاب سے پتہ چلتا ہے اس کے علاوہ ان کی ایک کتاب محبوب السیر بھی ہے جو فارسی زبان میں ہے۔اس میں میر محبوب علی خان کے دور کی تاریخ بیان کی گئی ہے ساتھ ہی اس دور کے راجاؤں ،مہاراؤں،اصلیوں اور ماماؤں کے حالات زندگی بھی بیان کئے گئے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی قدیم اور نادر کتابوں کا ایک نیا اور عمدہ اڈیشن شائع کیا جائے اور موجودہ نسل کو بتایا جائے کہ کیسی ذی علم شخصیات ہماری قوم میں گزشتہ زمانے میں رہے ہیں اور ہمیں بھی ان کی تقلید کرتے ہوئے۔مختلف علوم وفنون میں ماہرانہ درک حاصل کرنا چاہیئے۔

حواشی:

(۱) مرقع سخن تذکرۂ شعراء دکن ،جلد دوم،مولف:عبدالجبار خان صوفی ملکاپوری ،ناشر:مطبع رحمانی،سن اشاعت:۱۳۲۹ہجری،ص:۲-۱۱۷

(۲) تاریخ النوائط،سن اشاعت ۱۹۷۶ء،مقام اشاعت: حیدرآباد، ناشر: ولا اکیڈمی حیدرآباد ،ص: ۳۲۵

(۳) ایضاً،ص: ۲-۳

(۴) ایضاً،ص:۱۳

(۵) ایضا،ص:۲۵۹

منفرد لہجے اور نئے زاویے

انور ہادی جنیدی

اردو ادب کے حوالے سے شہر کڈپہ کی سرزمین تقریباً چار سو سالہ تاریخ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اگر اس گنجینۂ علم کے اوراق پلٹے جائیں تو حضرت من عرف گنج بخش، ابن رضا، حیدر بن ابن جعفر سے لے کر سلسلہ شہ میریہ اور بزمِ زکی تک ایک طویل اور تابناک ادبی تاریخ ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ وہ تاریخ ہے جس نے اس خطے کو صرف مذہبی و روحانی پہچان ہی نہیں دی بلکہ ادبی شناخت بھی عطا کی۔ اسی دبستانِ سخن کی روشن مثال 1974ء میں منظرِ عام پر آنے والا مجموعہ 'لہجے' ہے۔ یہ صرف ایک کتاب کا نام نہیں تھا بلکہ ان پانچ نوجوان شعرا کی تخلیقی کاوشوں کا نچوڑ تھا، جنہوں نے جدید اردو شاعری میں کڈپہ کو نہ صرف اپنے علاقے بلکہ پورے جنوب کی نمائندگی بخشی۔ میری مراد ہیں، ساغر جیدی، عقیل جامد، راہی فدائی، اشفاق رہبر اور یوسف صفی۔ یہ مجموعہ اردو دنیا میں کڈپہ کی شناخت کا ذریعہ بنا اور ایک نئی راہ متعین کر گیا۔ چند برس بعد 1978ء میں ایک اور مشترکہ مجموعہ 'انتسللہ' کے نام سے سامنے آیا۔ اس میں ساغر جیدی، عقیل جامد اور راہی فدائی کی تخلیقات شامل تھیں۔ یوں ان احباب کے مشترکہ شعری مجموعوں کا پہلا دور یہیں پر اختتام پذیر ہوا۔ اس روایت کو زندہ رکھنے کا سہرا بعد کے زمانے میں ڈاکٹر اقبال خسرو قادری کے سر جاتا ہے۔ انہوں نے 1993ء میں اپنے ساتھ عارف جنید، ضیا نعمان اور اثر حامد کو شامل کر کے ایک مشترکہ مجموعہ 'اعیان' کے نام سے شائع کیا، جسے ادبی حلقوں میں بے حد پذیرائی حاصل ہوئی۔ یہی نہیں، بلکہ 2012ء میں ایک اور مجموعہ 'سرورِ کونین' منظرِ عام پر آیا، جس میں نور محمد جالب مرحوم، ستار فیضی، شیخ محمد ہاشم اور شکیل احمد شکیل مرحوم کا نعتیہ کلام شامل تھا۔ اس کے ساتھ ہی مشترکہ مجموعوں کا دوسرا دور بھی اپنے اختتام کو پہنچا۔

اب تیرہ برس کے طویل وقفے کے بعد 2025ء میں ایک نیا شعری مجموعہ ’زوائے، ادبی دنیا کے افق پر جلوہ گر ہوا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تیسرے دور کا اولین مجموعہ ہے، جس نے ایک نئی امید کی کرن روشن کی ہے۔اس مجموعے میں تین شعرا کا کلام شامل ہے۔ یونس طیب، عطا کوثر، تابش ربانی یہ تینوں نوجوان اپنے منفرد لہجے اور نئے زاویے فکر کے ساتھ اردو شاعری میں داخل ہوئے ہیں۔’زوائے، کے ذریعے کڈپہ کی روایت ایک بار پھر زندہ اور تابندہ دکھائی دیتی ہے، اور اس بات کی بھی امید قوی ہے کہ اس دور میں مزید دو تین مشترکہ مجموعے منظرِ عام پر آئیں گے جو نہ صرف اس سلسلے کو آگے بڑھائیں گے بلکہ اردو ادب کے ذخیرے کو بھی مالا مال کریں گے۔’زوائے، صرف ایک کتاب نہیں، بلکہ ایک تسلسل کی تجدید ہے، ایک ایسی کڑی جو کڈپہ کے ادبی ورثے کو ماضی سے جوڑ کر مستقبل کی طرف لے جاتی ہے۔زوائے کے شعرا کو میں دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔اس مجموعے کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تینوں شعرا کا صرف منتخب کلام شامل کیا گیا ہے اور اس کی ترتیب وتزئین کی ذمہ داری ڈاکٹر اقبال خسرو قادری صاحب نے نبھائی ہے۔ میں دعوے کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس مجموعے کی اشاعت پر جتنی خوشی اس میں شامل شعراء کو ہوئی، اس سے کہیں زیادہ مسرت خود ڈاکٹر اقبال خسرو قادری صاحب کو ہوئی ہوگی، کیوں کہ وہ مدت سے اس خواہش کے امین تھے۔آئے اب زاویے کے شعرا پر سرسری گفتگو کرتے ہیں۔

یونس طیب

اردو دنیا میں وہ نام ہمیشہ زندہ رہتے ہیں جو اپنے فن کے ذریعے زندگی اور سماج کے بدلتے ہوئے رویّوں کو آئینہ دکھاتے ہیں۔ایسے ہی شعراء میں یونس طیب کا شمار کیا جاسکتا ہے۔اصل نام شیخ محمد یونس ہے اور ادبی دنیا میں یونس طیب کے قلمی نام سے جانے جاتے ہیں۔ آپ کی ولادت 15 جولائی 1972 کو شہر کڈپہ میں ایک معزز گھرانے میں ہوئی۔ والدِ محترم کا نام حاجی شیخ محمد اور والدہ کا اسمِ گرامی شیخ محمودہ ہے۔ خاندانی پس منظر دینی وعلمی رہا، جو آپ کی

شخصیت میں سے بھی جھلکتا ہے۔ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر کڈپہ ہی میں حاصل کی۔ بعدازاں اعلیٰ تعلیم کے سفر کو جاری رکھتے ہوئے ایم۔اے(اردو) کی سند حاصل کی اور اس کے بعد بی۔ایڈ،بھی کیا۔درس وتدریس کو بطور پیشہ اختیار کیا اور اس شعبے سے دیرینہ وابستگی قائم ہے۔ادبی سفر کا باقاعدہ آغاز 2005 میں کیا۔سخن وری کی اس روش پر آپ نے نہ صرف خلوصِ دل سے قدم رکھا بلکہ اسے شعور واحساس کی گہرائیوں سے سینچا۔شاعری میں رہنمائی کے لیے معروف ادیب و شاعر ڈاکٹر اقبال خسرو قادری صاحب سے شرفِ تلمذ حاصل کیا،جن کی تربیت نے آپ کے کلام کو نکھارا سنوارا۔

یونس طیب نے اگرچہ اپنے عہد کی روایتی فضا میں آنکھ کھولی،لیکن ان کے کلام میں تازگی،جدتِ خیال اور جذبے کی شدت نے ایک نئی فضاء کو سازگار بنایا۔ان کے اشعار پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ محض ردیف اور قافیہ کے اسیر نہیں بلکہ لفظوں میں ایک نئی جان ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔یونس طیب کی غزلوں کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ ان کے یہاں زندگی کے تضادات ایک خاص رنگ میں ابھرتے ہیں۔کبھی وہ مایوسی اور ناانصافی کے گہرے اندھیروں میں جھانکتے ہیں تو کبھی امید کی کرن دکھاتے ہیں۔ان کی زبان سادہ بھی ہے اور دل نشین بھی، لیکن ساتھ ہی وہ اپنے قاری کو گہرے فکر واحساس کی طرف لے جاتی ہے۔ان کی غزلوں میں ایسی معنویت دیکھی جاسکتی ہے جو عام قاری سے لے کر سنجیدہ ناقد تک سب کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔یونس طیب کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ لفظ اور جذبے کو یکجا کرنے کا فن جانتے ہیں۔ان کے یہاں علامتوں کا استعمال حد درجہ بامعنی ہے۔وہ کلاسیکی روایت کے بھی امین ہیں اور جدید حسیت کے بھی ترجمان ہیں۔اس امتزاج نے ان کے کلام کی انفرادیت کو ابھارا ہے۔جو دبستانِ کڈپہ کی ادبی فضا میں نمایاں ہے۔

ان کے اشعار میں محبت کی پاکیزگی ملتی ہے اور حیاتِ انسانی کی بے ثباتی کا اعتراف بھی۔ان کی غزلوں میں فلسفے کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔اور یہ سبب ہی قاری کو غور و

فکر پر مجبور کرتا ہے۔ان کے یہاں نہ تو محض سطحی عشقیہ واردات ہیں اور نہ ہی خالص خشک فلسفہ، بلکہ دونوں کے بیچ ایک ایسا توازن ہے جو شاعری کو معنوی اور فنی، دونوں حوالوں سے معتبر بنا دیتا ہے۔ یونس طیب کے کلام پر نظر ڈالتے ہوئے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ وہ اپنے اشعار میں روایتی طرز رکھنے کے باوجود اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے میں کامیاب ہیں۔ان کی غزلوں کی نغمگی، روانی اور داخلی سچائی قاری کے دل و دماغ پر دیرپا اثر چھوڑتی ہے۔

حمد و مناجات

مالک بحر و بر خالق دو جہاں رب کل، وحدہ لا شریک لہ!
ذرے ذرے سے قدرت ہے تیری عیاں رب کل وحدہ لاشریک لہ
تیرے محبوب کے نور سے ہی ملی ہم کو ایقان و ایمان کی روشنی
نعمتوں کا بھلا ہم سے کیا ہو بیاں رب کل، وحدہ لاشریک لہ!(1)

نعت نبی

اے کاش میں آقا کے تلوؤں کا دُھلا ہوتا
زم زم سے الگ ہوتا کوثر سے جدا را ہوتا
فردوس نشیں مجھ پر سب رشک کیا کرتے
میں گنبد خضری کے سائے میں پڑا ہوتا(2)

مجموعہ کی پہلی غزل کے چند شعر

اپنی مرضی کے کہاں ہم ہیں
کچھ عیاں تھے کچھ نہاں ہم ہیں
جل رہے ہیں الٰہی رشتے
اور سوکھی لکڑیاں ہم ہیں(3)

عطا کوثر

عطا کوثر کا اصل نام سید عطا اللہ قادری ہے۔آپ کی ولادت 20 مئی 1980ء کو شہرِ کرنول میں سید وحید پاشا قادری اور سیدہ کریم النساء کے گھر ہوئی۔ابتدائی تعلیم وہیں پائی اور پھر اعلیٰ تعلیم میں ریاضیات اور کیمسٹری کے مضامین میں ایم۔سی اور ایم۔ایس۔سی، کی ڈگریاں حاصل کیں۔اس کے بعد اردو زبان و ادب کی محبت نے آپ کو اپنی طرف کھینچا، چنانچہ ایم۔اے، اردو اور بی۔ایڈ، کی تعلیم بھی مکمل کی۔آج تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں اور سنجیدہ مطالعہ و تدریس کے ساتھ ساتھ 2010ء سے باقاعدہ شاعری کر رہے ہیں۔انہیں بھی براہِ راست ڈاکٹر اقبال خسرو قادری صاحب سے تلمذ حاصل رہا ہے، جس نے ان کے کلام کو ایک خاص فکری اور فنی دھار بخشی ہے۔زوائے میں عطا کوثر کی ایک نعت اور بیس غزلیں شامل ہیں۔

عطا کوثر کی شاعری کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو میں یہ کہنا چاہوں گا کہ بعض شعراء اپنی فکری بالیدگی اور شعری لطافت کے باعث قاری کے دل میں مستقل جگہ بنا لیتے ہیں۔عطا کوثر کا شمار بھی ایسے ہی حساس، باشعور اور صاحبِ دل شعرا میں ہوتا ہے جن کی شاعری نہ صرف ایک خوبصورت تجربہ ہے بلکہ روح اور عقل دونوں کو بیدار کرنے والی صدا ہے۔ان کا کلام، خاص طور پر نعتیہ اشعار، عقیدت اور عرفان کا ایسا حسین مرقع ہیں جو صرف زبانی مدح نہیں، بلکہ قلبی وابستگی اور روحانی سکون کا مظہر ہیں۔

جو اس کے در تلک پہنچا، پہنچ اس کی خدا تک ہے
جبین شوق کا رشتہ درِ خیرالوری تک ہے

جیسے اشعار، عقیدے اور یقین کی انتہا کو بیان کرتے ہیں، اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ شاعر کے دل میں عشقِ مصطفیٰ کی خوشبو مہک رہی ہے۔نعت کے اشعار میں جہاں ایمان کی روشنی ہے، وہیں علم، فن، دعا، اذان، درود اور شفاعت جیسے تصورات کو اس قدر خوبصورت ربط سے باندھا گیا ہے کہ قاری کو محسوس ہوتا ہے جیسے یہ سب کچھ ایک ہی نور کا تسلسل ہے۔

عطا کوثر کی غزل بھی ان کے شعری مزاج کی وسعت کی خوبصورت تصویر ہے۔

غزل کا یہ مطلع دیکھئے۔

زندگی کیا ہے مزاج شیشے کا

اور پتھر علاج شیشے کا!

یہ ایک علامتی اور استعاراتی اظہار ہے جس میں زندگی کی نازکی، سماجی جبر، روایتی زنجیروں اور فن کی جمالیاتی نزاکت کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ شاعر نے شیشہ اور پتھر جیسے استعارے استعمال کر کے انسان کی کمزوری اور زمانے کی سختی کے درمیان کشمکش کو ظاہر کیا ہے۔ اب یہ شعر ملاحضہ فرمائیں۔

پاؤں میں بیڑیاں روایت کی

شعر کے سر پہ تاج شیشے کا

مندرجہ بالا جیسے اشعار اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ شاعر ایک طرف روایت کا احترام کرتا ہے تو دوسری طرف وہ فن اور اظہار کی آزادی کا بھی قائل ہے۔ عطا کوثر کا شعری اسلوب سادہ مگر عمیق ہے۔ ان کے الفاظ میں سلاست کے ساتھ معنویت چھپی ہوئی ہے۔ وہ نہ صرف زبان پر عبور رکھتے ہیں بلکہ فکری حوالوں سے بھی ان کی شاعری پختگی کی علامت ہے۔ چاہے وہ عشقِ رسول ہو یا انسان کی داخلی کشمکش، عطا کوثر ہر موضوع کو نہایت نرمی سے برتتے ہیں۔ ان کے اشعار نہ صرف جذبات کو ابھارتے ہیں، بلکہ سوچنے پر مجبور بھی کرتے ہیں۔ عطا کوثر کی شاعری ایک حساس دل اور بیدار ذہن کی آئینہ ہے جو محض لفظوں سے کھیلنے کا فن نہیں جانتا، بلکہ لفظوں کے ذریعے دلوں میں اترنے کا ہنر بھی رکھتا ہے۔

نمونہ کلام، نعت

جو اس کے در تلک پہنچا، پہنچ اس کی خدا تک ہے

جبین شوق کا رشتہ در خیرالوری تک ہے

وہی تفسیر قرآں کی وہی تکمیل ایماں کی
وہی جو ابتدا سے تھا وہی جو انتہا تک ہے(4)

غزل کے دوشعر

زندگی کیاہے مزاج شیشے کا
اور پتھر علاج شیشے کا!
برف کی سل کہاں پگھلتی ہے
اک کرن ہے خراج شیشے کا(5)

تابش ربانی

شیخ محمد ربانی، قلمی نام تابش ربانی، 7 اکتوبر 1983ء کو(شہرِ نیک نام آباد) کڈپہ میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد کا نام شیخ عبدالجبار اور والدہ کا نام مہرالنساء ہے جو پیشہ سے معلّمہ رہی ہیں۔ابتدائی تعلیم کڈپہ کی مسلم ہائی اسکول سے حاصل کی اور بعدازاں اعلیٰ تعلیم میں بی۔سی اے،اور بی۔ایڈ،کی ڈگریاں مکمل کیں۔تابش ربانی نے 2002ء میں باقاعدہ مشق سخن شروع کی اور کم عمری ہی میں اپنی شناخت قائم کر لی۔تابش بھی براہِ راست ڈاکٹر اقبال خسرو قادری کے تربیت یافتہ شعرا میں شامل ہیں، جس کا عکس ان کے اشعار میں فکری پختگی اور تہذیبی شائستگی کی صورت میں جھلکتا ہے۔زوائے میں تابش ربانی کی ایک نعت اور بیس غزلیں شامل ہیں، جو ان کے ذوقِ سخن، دھیما لہجہ اور فکری جہتوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

تابش ربانی کی شاعری: جذبے کی شدت اور اظہار کا طرز

تابش ربانی کا کلام نہ صرف عشقِ نبی کی مہک لیے فضاؤں کو معطر کر رہا ہے بلکہ اس میں داخلی توانائی اور تخلیقی توازن بھی بھرپور نظر آتا ہے۔تابش ربانی کی نعت کا مطلع ملاحضہ فرمائیں۔۔

جو بھی گدائے احمد مختار ہو گیا

رب کریم اس کا مددگار ہو گیا

اس مطلع میں ایک دردمند دل کا اظہار ہے جو ذاتِ مصطفیٰ سے وابستہ ہو کر اپنے وجود کی معنویت پاتا ہے۔شاعر کی نعتیہ زبان میں سادگی کے ساتھ ایک روحانی وجد کی کیفیت بھی ہے۔ یہاں عشق، بیماری نہیں بلکہ مسیحائی ہے یہاں امی لقب کا فیض ایک ریگ زار کو گلزار میں بدلنے کی تمثیل بن جاتا ہے۔خاص طور پر

قرآں میں حسن خلق کا اظہار ہو گیا

میرا یقیں سلگتا ہوا ریگ زار تھا

جیسے اشعار شاعر کی فکری بلندی اور روحانی شعور کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔نعت کے آخری شعر میں جب جبرئیل پر رشک کی بات آتی ہے،تو یہ صرف الفاظ کا استعمال نہیں،ایک گہرا روحانی ادراک ہے جو مدحتِ رسول کو سب سے اعلیٰ مقام پر بٹھاتا ہے۔

اب آئے کچھ غزل پر بھی بات کرتے ہیں ان کے غزلوں میں بھی ایک جداگانہ لہجہ اور فکری رسائی نظر آتی ہے۔غزل کا یہ شعر ملاحضہ فرمائیں۔

نظر محدود ٹوٹے سائباں تک

تخیل کی اڑانیں کہکشاں تک

یہ غزل کا مطلع فکری اور معنوی سفر کی کہانی سنا رہا ہے، جہاں تخیل کی پرواز عام مشاہدات سے بہت آگے، کہکشاؤں تک جا پہنچتی ہے۔ایسے اشعار روزمرہ کی زندگی سے جُڑے ہوئے ہیں مگر ان میں پوشیدہ فلسفہ قاری کو گہری سوچ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ایک اور شعر ملاحضہ کیجیے۔۔

وہاں سے ابتدا ہوتی ہے اپنی

تصور کی رسائی ہے جہاں تک

اس نہج کے اشعار نہ صرف فکری وسعت کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ قاری کو اپنی تخلیقی دنیا کی وسعتوں

سے آشنا بھی کرتے ہیں۔شاعر کا داخلی سفر، انا (میں) کے فنا ہونے کے مرحلے سے گزرتا ہے اور۔یقیں کے شہر سے دشتِ گماں تک۔کا بیان اس جدوجہد کا شاعرانہ اظہار ہے جس میں یقین، تلاش اور وجود کی معنویت باہم جُڑے ہوئے ہیں۔تابش ربانی کی شاعری کا امتیاز یہ ہے کہ وہ قاری کے ذہن پر بوجھ ڈالے بغیر، اسے فکری بلندی تک لے جاتی ہے۔ان کے الفاظ میں گہرائی بھی ہے، روانی بھی، جذبہ بھی ہے اور توازن بھی۔ان کی نعتیہ شاعری عشق کے اظہار کی بلند مثال ہے، جبکہ غزل فکری تجسس، خودی کے سفر اور روحانی آگہی کی پاسدار ہے۔

نعت

جو بھی گدائے احمد مختار ہو گیا
رب کریم اس کا مددگار ہو گیا
ہر ایک سانس رشک مسیحا بنی ہوئی
عشق نبی کا جب سے میں بیمار ہو گیا (6)

غزل کے چند شعر:

نظر محدود ٹوٹے سائباں تک
تخیل کی اڑانیں کہکشاں تک
وہاں سے ابتدا ہوتی ہے اپنی
تصور کی رسائی ہے جہاں تک (7)

زوائے صرف تین شعرا کا مشترکہ مجموعہ نہیں بلکہ کڈپہ کے ادبی ماحول میں ایک نیا باب ہے، جس نے موجودہ دور کے اردو ادب میں تازگی اور معیار دونوں کا امتزاج پیش کیا ہے۔یونس طیب کی فلسفیانہ گہرائی اور علامتی حسن، عطا کوثر کے تجرباتی رنگ اور تخلیقی فہم، اور تابش ربانی کی تخیل و انسانی احساسات کی وسعت نے اس مجموعے کو متوازن اور پُراثر بنا دیا ہے۔ڈاکٹر اقبال خسرو قادری صاحب کی محتاط ترتیب وتزئین نے کلام کی روانی، معنوی وضاحت اور جمالیاتی

حسن کو جلا بخشتی ہے، جس کی بدولت ہر شاعر کا اپنا فنی اور انفرادیت بھرا زاویہ نمایاں ہوتا ہے۔ نعتیہ کلام میں عقیدت اور عشقِ رسول کی شدت، جبکہ غزلوں میں انسانی کیفیات، زندگی کے تضادات اور تخیل کی پرواز، قاری کو ہر لمحے غور و فکر اور جمالیاتی لذت کی دعوت دیتے ہیں۔

حواشی:

1. ڈاکٹر اقبال خسرو قادری، زاویے، دبستان پبلیکیشنز کڈپہ، ص:12
2. ڈاکٹر اقبال خسرو قادری، زاویے، دبستان پبلیکیشنز کڈپہ، ص:13
3. ڈاکٹر اقبال خسرو قادری، زاویے، دبستان پبلیکیشنز کڈپہ، ص:15
4. ڈاکٹر اقبال خسرو قادری، روایے، دبستان پبلیکیشنز کڈپہ، ص:50
5. ڈاکٹر اقبال خسرو قادری، زاویے، دبستان پبلیکیشنز کڈپہ، ص:51
6. ڈاکٹر اقبال خسرو قادری، زاویے، دبستان پبلیکیشنز، کڈپہ، ص:85
7. ڈاکٹر اقبال خسرو قادری، زاویے، دبستان پبلیکیشنز، کڈپہ، ص:86

ماخذ:

1. سید شکیل احمد شکیل، سرورِ کونین، نوشین گرافکس، کڈپہ، 2014
2. ڈاکٹر اقبال خسرو قادری، زاویے، دبستان پبلیکیشنز کڈپہ، 2025

مولانا ابوالکلام آزاد کی فکری بصیرت

ثمینہ پروین، پی
شعبۂ اردو، مرودھر کیسری جین کالج فار ومن (خودمختار)، وانمباڑی تمل ناڈو

مولانا ابوالکلام آزاد 11 نومبر 1888 کو مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے۔ان کا اصلی نام "ابوالکلام" تھا، اور "آزاد" ان کا تخلص تھا، جو بعد میں ان کے قلمی نام کے طور پر مشہور ہوا۔ وہ ایک عظیم عالم، مفکر، سیاستدان اور آزاد ہندوستان کے رہنما تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا تعلق ایک گہری علمی اور فکری روایت سے تھا۔ان کی تحریریں اور خیالات نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں بلکہ پوری دنیا کے لیے ایک اہم اثاثہ ہیں۔ان کی مشہور تصنیف "غبارِ خاطر" اور "ترجمان القرآن" ان کے علمی مقام کو ثابت کرتی ہیں۔مولانا نے اپنی زندگی کے بیشتر حصے میں اسلامی تعلیمات اور ہندوستانی ثقافت کو فروغ دینے کی کوشش کی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو تعلیم سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ ہمیشہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ تعلیم کے ذریعے قوموں کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ان کا کہنا تھا کہ اگر ایک قوم تعلیم میں ترقی کرے تو وہ ہر شعبے میں کامیاب ہوسکتی ہے۔ان کی وزیرِ تعلیم کے طور پر خدمات نے ہندوستان میں تعلیمی نظام کو بہتر بنانے میں مدد فراہم کی۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے اداروں سے بھی جڑے ہوئے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی پوری زندگی ہندوستان کی آزادی کے لیے وقف کی۔ وہ کانگریس کے اہم رہنماؤں میں شامل تھے اور برطانوی راج کے خلاف تحریک میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔ان کا جذبہ، جدوجہد اور علم نے ہندوستان کے عوام کو تحریک دی کہ وہ اپنی آزادی

کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔

مولانا آزاد نے ہمیشہ ہندوستان کی یکجہتی اور بھائی چارے پر زور دیا۔ ان کا ایمان تھا کہ ہندوستان کی ترقی اسی وقت ممکن ہے جب مختلف مذہبوں، زبانوں اور ثقافتوں کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کریں۔ ان کی قیادت میں آزادی کی تحریک اور بعد میں آزاد ہندوستان کی ترقی میں اہم کردارادا کیا گیا۔انہوں نے فرقہ واریت کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کی اورایک جمہوری، سیکولر اور متنوع معاشرت کے قیام پرزور دیا۔

آزادی کے بعد، مولانا ابوالکلام آزاد کو ہندوستان کے پہلے وزیرِ تعلیم کے طور پر منتخب کیا گیا۔ انہوں نے تعلیمی شعبے میں متعدد اصلاحات کیں اور آرکیٹکچرل ترقی کے ساتھ ساتھ سائنسی تحقیق اورجدید تعلیم کے نظام کوفروغ دیا۔ان کی کاوشوں کی بدولت ہندوستان میں آئی آئی ٹی جیسے تعلیمی ادارے قائم ہوئے، جنہوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں ملک کا نام روشن کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت صرف ایک سیاستدان یا عالم کی نہیں بلکہ ایک نظریے کی نمائندگی کرتی ہے۔انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اپنے ملک کی آزادی، تعلیمی ترقی اور مختلف قوموں کے درمیان اتحاد کے لیے صرف کیا۔ ان کی قربانیاں، ان کے خیالات اور ان کی رہنمائی ہندوستان کی تاریخ کا حصہ ہیں اور ہمیشہ یادرکھی جائیں گی۔ان کا نام ہمیشہ عزت اوراحترام کے ساتھ لیا جائے گا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستان میں تعلیم کے نظام کو بہتر بنانے کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ ہندوستان کے پہلے وزیرِ تعلیم تھے اوران کی قیادت میں کئی تعلیمی ادارے قائم ہوئے جیسے آئی آئی ٹی اوراین آئی ٹی۔ انہوں نے تعلیم کوعوامی فلاح کا ذریعہ سمجھا اوراس کے ذریعے سماجی ترقی کے لیے کام کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں اہم کردارادا کیا۔ وہ انڈیا نیشنل کانگریس کے رہنما تھے اور انہوں نے محمڈن لیگ اور انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں اپنا

بھر پور حصہ ڈالا۔ ان کی قیادت نے بہت سے لوگوں کو تحریک میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔

مولانا کا غبارِ خاطر ایک مشہور کتاب ہے جس میں انہوں نے اپنے خیالات اور یادوں کو بیان کیا ہے۔ یہ کتاب ان کی ذاتی زندگی اور سیاسی جدوجہد کے حوالے سے بہت سی اہم معلومات فراہم کرتی ہے اور ان کی فکری بلندی کو اجاگر کرتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ہمیشہ فرقہ واریت کے خلاف آواز اٹھائی۔ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان بھائی چارے اور ہم آہنگی کے لیے کام کیا۔ ان کا ماننا تھا کہ ہندوستان کی حقیقت اس کی تنوع میں ہے، اور یہی ملک کی قوت ہے۔

مولانا نے قرآن پاک کی تفسیریں بھی کی ہیں، جو ان کے علم و فہم کی گہرائی کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان کی "تفسیر القرآن" ایک اہم تصنیف ہے جس میں انہوں نے اسلامی تعلیمات کو جدید مسائل کے تناظر میں بیان کیا۔

مولانا نے مسلمانوں کی معاشی اور سماجی ترقی کے لیے بھی کام کیا۔ ان کی سیاست اور فکر میں مسلمانوں کی فلاح کے لیے ایک واضح لائحہ عمل تھا جس میں تعلیمی ترقی، اقتصادی خودمختاری اور سماجی انصاف پر زور دیا گیا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے پاکستان کے قیام کے خلاف سخت موقف اختیار کیا۔ ان کا ایمان تھا کہ ہندوستان کی ترقی اور بقاء مختلف قوموں اور مذاہب کے درمیان تعلقات پر منحصر ہے، اور یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان یکجہتی کے حامی تھے۔

مولانا کا ماننا تھا کہ دینی اور دنیاوی تعلیم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ انہوں نے دونوں کو ساتھ لے کر چلنے کی ضرورت پر زور دیا تا کہ مسلمانوں کو دنیا کے جدید تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا جا سکے۔ ان کا مقصد تھا کہ مسلمان اپنے مذہب اور دنیاوی علم دونوں میں ماہر ہوں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت نہایت سادہ، پُرعزم اور ایماندار تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کو صرف ایک مقصد کے لیے وقف کیا تھا، ان کا مطمحِ نظر وطن کی خدمت تھی۔ ان کی زندگی ہمارے

نمونہ تھی، جس میں قربانی، محنت اور صداقت کی مثال ملتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نہ صرف ایک عظیم رہنما تھے بلکہ ایک اہم مفکر اور ادیب بھی تھے۔ ان کی کتابیں اور مضامین آج بھی لوگوں کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں اس دور کے مسائل کا گہرا تجزیہ کرتی ہیں اور ان کی فکر کا اثر آج بھی محسوس کیا جاتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد 22 فروری 1958 کو نئی دہلی میں وفات پا گئے۔ ان کی وفات پر پورے ہندوستان میں غم کی لہر دوڑ گئی، کیونکہ وہ نہ صرف ایک عظیم عالم تھے، بلکہ ایک مفکر اور آزادی کی جدوجہد میں ان کا کردار بھی انتہائی اہم تھا۔

کتابیات و رسائل:

1۔ترجمان القرآن۔سنِ اشاعت.1931۔از مولانا ابولکلام آزاد

2۔غبارِ خاطر۔سن اشاعت.1946۔از مولانا ابولکلام آزاد

3۔الہلال۔ ہفتہ وار

4۔لسانِ الصدق۔از مولانا ابولکلام آزاد

by Abul Kalam Azad−India Wins Freedom۔5

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PARVEEN.PSAMINA
Department of URDU
Marudharkesari Jain Collage For Women
(AUTONOMOUS)
Vaniambadi, Tamilnadu
Cell: 8124279661

جامعہ میں داخلہ

سید معاذ، متعلم جامعہ دارالسلام عمرآباد

مجھے بچپن سے خواہش تھی کہ مدرسہ میں تعلیم حاصل کروں، گھر کا ماحول بھی اس کے لیے سازگار تھا، والدین کا خواب تھا کہ ان کا بیٹا ایک عالم دین بنے، یہی وجہ تھی کہ وہ شروع ہی سے مجھے دینی مجلسوں اور علماء سے قریب تر کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ جامعہ میں داخلہ سے قبل وہ مجھے دینی اجلاسوں اور مجلسوں میں مجھے خصوصی طور پر لے جاتے، اور شعوری طور پر دین میرے اندر جاگزیں کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کی کوشش ہوتی کہ میں جب کسی مجلس میں حاضر ہوں تو غور سے مواعظ سنوں، سمجھوں اور باقاعدہ اس پر عمل پیرا ہوں۔ چنانچہ اس طرح میرے اندر دینی علم حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔

میں اپنے گھر کے پاس، ایک اسکول میں زیر تعلیم تھا، ہمارے اردو کے استاذ نے کسی وجہ سے میری اور میرے چچا زاد بھائی کی خوب دھلائی کردی۔ جس کی وجہ سے ہمیں بہت تکلیف ہوئی۔ میں نے والد صاحب سے کہہ دیا کہ میں اب مزید اسکولی تعلیم حاصل نہیں کروں گا، کیوں کہ وہاں بے وجہ مار کھانی پڑتی ہے اور ویسے بھی میں دینی تعلیم حاسل کرنا چاہتا ہوں۔

والد صاحب نے بستی کے قریب آباد جامعہ دارالتوحید میں مجھے داخل کردیا، ایک سال تک وہاں پڑھتا رہا، والد صاحب کو جامعہ دارالسلام عمرآباد کے بارے میں معلوم ہوا تو انھوں نے کہا: کیوں نہ آپ وہاں تعلیم حاصل کرو؟ میں کہنے لگا کہ میں کہاں اور جامعہ کہاں؟ کیوں کہ میں اس وقت تک جامعہ کی نیک نامی اور معیار کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا، والد صاحب گویا زبانِ حال سے کہنے لگے ''ہمتِ مرداں مددِ خدا''، چنانچہ آپ نے کوشش شروع

کردی، بہت سارے احباب سے داخلہ وغیرہ کی بابت پوچھا اور کاروائیاں شروع کردیں، چنانچہ ایک ماہ کی کوششوں کے بعد میری درخواست کی منظوری آگئی، گھر میں خوشی کا ماحول تھا، خصوصا والد صاحب کی خوشی دیدنی تھے، پھر والد صاحب نے مجھے نصیحت کی کہ جامعہ جا کر دینی تعلیم خوب دل لگا کر حاسل کرو، استاذ کی ہر بات مانو، اورایک ماہر و نیک عالم بنو۔ میں نے والد صاحب کی یہ باتیں گھٹی میں باندھ لیں۔ اوران سے کہا: ان شاءاللہ ایسا ہی کروں گا۔

اللہ کا فضل ہے کہ میرا یہ تعلیمی سفر جاری ہے۔ اور ابھی میں عالمیت سال آخر میں ہوں، دعا ہے کہ بقیہ مراحل اللہ بہ آسانی پایہ تکمیل تک پہنچادے اور مجھے قوم وملت کے لیے نفع بخش بنائے۔

میرے والد، میرے رول ماڈل

معراج الرحمٰن، متعلم جامعہ دارالسلام عمرآباد

میری پیدائش ۸۰۰۲ کی ہے اور میرا تعلق بنگال سے ہے، میرے گھر میں کل ۰۱ افراد رہائش پذیر تھے، میرے والدین کے علاوہ گھر کے دیگر افراد دین سے نابلد تھے۔ والدِ محترم ایک سرکاری اسکول میں میر معلم (Head Teacher) تھے۔ وہ اپنے زمانہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ ہماری بستی میں آپ کی پہچان ایک فرض شناس رہ نما، ہر دلعزیز قائداور سرگرم ذمہ دار کی تھی۔ اللہ تعالی نے آپ کو بڑی پیاری آواز سے نوازا تھا۔ جب آپ مسجد میں نماز پڑھاتے تو لوگوں کی بھیڑ امنڈ پڑتی، لوگ آپ کی سحر انگیز آواز سے مسحور ہو جاتے تھے۔ نیز آپ ایک بہترین خطیب تھے۔ جب والد محترم کسی اجلاس یا جسلہ میں تقریر کے لیے مائک تھامتے تو خالی محفل بھر جاتی۔

والدِ محترم سے متاثر لوگوں کا حلقہ کافی وسیع تھا، وہ آپ پر مر مٹنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ آپ کی پوشاک نفیس، اور رہن سہن اعلی تھے۔ والدِ محترم ایک دردمند مبلغ بھی تھے اور ایک مدرسہ میں تدریسی ذمہ داریاں بھی نبھاتے تھے۔

والد صاحب کا خواب تھا کہ وہ اپنی زندگی میں ایک عالی شان یونیورسٹی تعمیر کریں۔

والد صاحب ہنس مکھ انسان تھے، ہر راہ چلتے آدمی سے خندہ پیشانی سے ملا کرتے تھے، آپ کے بولنے کا سلیقہ اور لوگوں سے تعامل بالکل جداگانہ تھا یہی وجہ تھی کہ لوگ آپ سے بے حد متاثر تھے۔ آپ صبر و تحمل کے پیکر تھے، صلاحیت وصلاحیت کے ساتھ اللہ تعالی نے آپ کو مقبولیت بھی عطا کی تھی۔

آپ کی ان خوبیوں کا تذکرہ لوگ آج بھی کرتے ہیں، چند لوگ تو آپ کی ان

خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے آبدیدہ ہوجاتے ہیں۔ سچ کہا کسی نے کہ "دنیا میں رہو تو کچھ ایسا کر گزرو کہ تمہارے مرنے کے بعد لوگ تمہارے کاموں کی وجہ سے تم کو یاد رکھیں" میرے والدِ محترم نے یہی کیا۔ غرض آپ کی وفات ۵۱ سال قبل ہوگئی۔ سچ کہوں تو والدِ محترم کو میں نے شعوری عمر میں نہیں دیکھا لیکن لوگوں کے تاثرات بتاتے ہیں کہ آپ بڑے ہی عظیم انسان تھے۔ غفراللہ لہ واسکنہ فسیح الجنان۔

میری خواہش بلکہ خواب ہے کہ میں بھی والدِ محترم کی طرح ایک ماہر خطیب، بے باک عالم، دردمند مبلغ، قاری اور اچھا انسان بنوں۔

میری والدہ نے میرے اس خواب کو تعبیر دینے کے لیے مجھے کسی بڑے دینی ادارہ میں داخل کرنے کی ٹھان لی، چنانچہ مجھے جامعہ دارالسلام میں داخل کر دیا گیا، میں ابھی جماعت ِ پنجم میں ہوں، سچ کہوں تو اب تک غیر شعوری کی عمر کاٹی ہے، میں اپنے عزائم کو لے کر سنجیدہ نہیں تھا، لیکن اب قوم کے لیے بہت کچھ کرنے کا اراد ہے۔ لوگ بڑے بڑے خواب بُنتے ہیں مگر کسی رکاوٹ کی وجہ سے وہ پیچھے رہ جاتے ہیں لیکن میں حالات کا شکوہ نہ کروں گا، مسلسل آگے بڑھوں گا، اور کسی بھی قسم کی رکاوٹ سے پیچھے نہیں ہٹوں گا، ان شاءاللہ۔

جامعہ دارالسلام عمرآباد میں داخلہ سے قبل میں نے کئی اسکولوں اور مدرسوں میں تعلیم حاسل کی اور الحمدللہ ہر جگہ میرا شمار ممتاز طلبہ میں ہوا کرتا تھا۔ میں اپنے اساتذہ کا چہیتا تھا۔ لیکن جب جامعہ میں داخلہ ہوا تو مجھے زبان کی وجہ سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، میں بنگال سے تھا اور اردو سے نابلد، شروعاتی دور میں اشاروں اور Body Language سے کام چلایا کرتا تھا۔ جب جماعتِ سوم کو پہنچا تو بتدریج اردو زبان بولنا شروع کیا اور الحمدللہ اب تھوڑا بہت لکھنے کی بھی کوشش کرنے لگا ہوں۔

میرا مقصد اور میری خواہش ہے کہ میں اپنے والدِ محترم کی طرح بن کر قوم وملت کی خدمت کروں۔

کرغم کو اختیار کہ گزرے تو غم نہ ہو

فوزان احسن صمدانی، متعلم جامعہ دارالسلام عمرآباد

وقت، وقت کی بات ہے، چند دن پہلے مولانا حفیظ الرحمٰن اعظمیؒ ہماری نگاہوں کے سامنے ہشاش بشاش تھے، اور آج آپ نہ رہے۔ کل تک جن کی بیماری کا حال صدرِ عمومی یا اساتذہ کی زبان سنتے رہے، آج ان کی وفات کی خبر اشک بار آنکھوں اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لکھنی پڑرہی ہے۔ کل تک جن کی تقریروں سے جامعہ کے درودیوار گونجا کرتے تھے، آج ان کی وفات سے یہ اشک بہارہے ہیں۔ کل تک جن کے نام کے آگے حفظہ اللہ لکھا کرتے تھے، آج رحمہ اللہ لکھنا پڑرہا ہے۔

صورت از بے صورتی آمد بروں

باز شد انا للہ وانا الیہ راجعون

ماں کے بچھڑنے پر بچہ کو جو تکلیف ہوتی ہے، اس سے بھی کہیں زیادہ آپؒ کی وفات سے جامعہ اور اہلِ جامعہ کو تکلیف پہنچی، اسی لیے جامعہ کے اساتذہ نے بلا مبالغہ بیک زبان یہ بات کہی " آپ کی وفات سے جامعہ کا ایک عہد ختم ہوگیا۔" آپ کی وفات سے صرف جامعہ ہی غم زدہ نہیں بلکہ نائیجیریا، ملیشیا اور ہندوستان کی گلیاں بھی اداس اور غم زدہ ہیں۔

دنیا والوں کو تو صرف آپؒ کے جانے کا غم تھا پر راقمِ سطور کو ایک ساتھ دو غموں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک تو آپؒ کی وفات کا غم اور دوسرا آپؒ سے شرفِ تلمذی سے محرومی کا غم۔ میری ان آنکھوں نے کئی بار آپ کا دیدار کیا مگر افسوس ہے ان ہاتھوں پر جو آپؒ سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں کر پائے۔ تاسف ہے زبان پر جو کہنے کی ہمت نہ کرسکی۔ آپ سے زانوئے تلمذ تو دور آپ کی قربت سے بھی دور رہا۔ میں اس کو بدبختی سمجھوں یا شومئی قسمت بہرحال جو بھی ہو میرے لیے آپ کی وفات کا سانحہ عظیم حادثہ تھا جو مجھے بیک وقت دو غم دے گیا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں یہ سب کیا لکھ رہا ہوں سچ کہوں تو نوکِ قلم میرے

جذبات واحساسات کی ترجمان بن گئی ہے۔

جیسا لکھ آیا ہوں کہ آپ کے سامنے ہوتے ہوئے بھی آپ کی صحبت سے کوسوں دور تھا، جس کی وجہ سے آپؒ کے سلسلے میں اس ناداں ذہن میں زیادہ معلومات اکھٹی نہیں ہیں۔لہذا جو کچھ آپؒ کی کتابوں کو پڑھ کر، اساتذہ سے سن کر، بندہ کو معلوم ہے اس کو جنبش قلم دینے کی کوشش کروں گا،آپؒ کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کے آپؒ سمندر کو کوزے میں سمونے کا ہنر جانتے اور رکھتے تھے۔تحریروں اور خیالوں کو ایک دو جملے میں اس طرح پروتے کہ معنی کما حقہ ادا ہو جاتا۔

آپؒ کو اپنے اساتذہ سے بڑا لگاؤ تھا،آپؒ کی تحریروں سے یہ بات جھلکتی تھی کہ آپؒ اپنے مشفق اساتذہ کرام کے بڑے قدردان تھے۔ان کی تعریفوں اور کاوشوں میں رطب اللسان رہتے،آپؒ کا ماننا تھا کہ "میں جو کچھ ہوں یہ سب میرے اساتذہ کی محنت کا بدلہ ہے۔۔۔" آپؒ کو اپنے اساتذہ سے جو لگاو تھا اس کا اظہار آپ کی کتاب "میرے اساتذہ" کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔آپؒ کا حافظہ غضب کا تھا۔آپؒ نے بالترتیب اپنے اساتذہ کا ذکر کیا ہے۔نیز ان کی چھوٹی بڑی خوبیوں کا دلکش انداز میں تذکرہ کیا ہے۔مزید برآں استاذِ محترم کی قدردانی،ان کی شفقت،علم نوازی اور ذرہ نوازی کے قائل تھے۔

آپؒ ایک بے باک مقرر اور خطیب تھے،بولتے تو سارے مجمع پر سکوت چھا جاتا، ہر کوئی محسوس کرتا کہ علم کے موتی آپ کی زبان سے جھڑ رہے ہیں،انداز بیان اس قدر عمدہ کہ ہر سامع کا دل عش عش کر جاتا اس لیے کہنے والوں نے کہا کہ " آپؒ کی تقریر میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی جھلک نظر آتی تھی''۔ یہی وجہ تھی کہ ہر سامع کی تمنا ہوتی کہ آپ اور بولیں اور بولتے جائیں،آپؒ کی تقاریر مواد سے بھر پور ہوا کرتی تھیں،اشعار کا استعمال برمحل ہوا کرتا، دلائل اور استنباط کا طریقہ اتنا عمدہ ہوتا کہ عوام تو کجا خواص کا دل بھی باغ باغ ہو جاتا۔ایک بے باک اور نڈر مقرر ہونے کے باجود عجز وانکساری کا عالم یہ ہوتا کہ خطاب کے شروع میں کہتے "میری زبان لڑکھڑا رہی ہے" آپؒ کی بے باکی اور جرات مندی کے سلسلے میں ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ آپؒ جمالیہ میں زیرِ تعلیم تھے،جمالیہ کے احاطہ میں ایک ہال تھا جس میں اس کے بانی اور ان کے فرزندان کی قبریں تھیں،وہاں کا دستور تھا کہ طلبہ فجر اور مغرب کے بعد وہاں بیٹھ کر "قصیدہ بردہ" کے دس دس اشعار لازمی پڑھا کرتے تھے، چونکہ یہ برسوں کی روایت تھی اور روایت شکن باغی

ٹھہرتا ہے، آپؒ نیااس روایت سے بغاوت کردی، جس کی وجہ سے آپؒ کا ماہانہ وظیفہ ۵ روپیے بند کردیا گیا، لیکن اس کے باوجود آپؒ ڈٹے رہے اوراس روایت کی پاسداری نہ کی۔

آپؒ شریعت کے بڑے پابند تھے، ''**اقیموا الصلوۃ و آتوا الزکوۃ و اطیعوا الرسول**'' سے آپؒ کی زندگی عبارت تھی، پیروں میں کمزوری کی وجہ سے آپؒ صحیح سے چل نہیں پاتے تھے، لیکن فرائض کے اس قدر پابند تھے کہ مسجد میں ہی ادا کرتے تھے۔

آپؒ اپنے طلبہ کے لیے بڑے مشفق ومہربان تھے، ان کے ہم درد وغم گسار تھے۔ طلبہ کی خوشی، آپؒ کی خوشی تھی، طلبہ کا غم گویا آپؒ کا غم تھا۔ بہترین مربی تھے ، **تبسمک فی وجہ اخیک صدقۃ** ، کے پیکر تھے۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں جب آپ نماز کے لیے خدمت کے جذبہ سے لیث طلبہ کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر خراماں خراماں قدموں کے ساتھ مسجد کا رخ کرتے ہوتے ، درمیان میں کوئی طالب علم سامنے آجاتا اور ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے لیے ہاتھ بڑھاتا تو آپؒ اس کو مایوس نہ کرتے بلکہ کمزوری وعلالت کے باوجود مسکراتے چہرہ کے ساتھ ملاقات کرتے اور دعاؤں کے ساتھ رخصت فرماتے۔

آپؒ کو جامعہ سے قلبی لگاو تھا۔ عمر کا اکثر وپیشتر حصہ جامعہ کے درودیوار سے وابستہ ہورگزارا، وقتی طور پر خدمت کی غرض سے آپؒ نے ملیشیا اور نائجیریا کا بھی رخ کیا، لیکن جامعہ کی یادیں اوراس سے قلبی لگاو آپؒ کو وہاں زیادہ دن رکنے نہیں دیا بالآخر وہاں سے جلد ہی جامعہ کو لوٹ آئے اور آخر وقت تک خدمات انجام دیتے رہے۔

۳۲ مئی بروز منگل یہ روشن چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہوگیا۔

افف یہ جادہ کہ جسے دیکھ کے جی ڈرتا ہے
کیا مسافر تھے جو اس راہ سے گزر گیے۔

آپ جامعہ کے ترجمان تھے، آپؒ نے اپنے علم وہنر سے کئی ایسے چراغ روشن کیے جن سے آج بھی تاریک دینا منور ہورہی ہے۔ آپؒ نے اپنی تقریر، تحریر اور افکار کے ذریعہ قوم کے نوجوانوں میں بیداری کا جذبہ پیدا کیا اور قوم کے جذبات کو صحیح رخ دینے کی تعلیم دی۔

دعا ہے کہ رب ذوالجلال آپؒ کی بشری خطاوں کو درگزر کرتے ہوئے خدمات کو قبول فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمایے۔

مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو تیرا ‏ ‏ ‏ ‏ نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو تیرا

مائل خیرآبادی اورادب اسلامی

محمد سمیع اللہ عمری،ترووللوور یونیورسٹی،سی۔عبدالحکیم کالج میل وشارم

نگران:ڈاکٹر ایس محمد یاسر،صدر شعبہ اردو سی۔عبدالحکیم کالج میل وشارم

مائل خیرآبادی شاعر بھی تھے اورادیب بھی تھے۔آپ نے بہت ساری کھانیاں بھی لکھی ہیں بہت سارے افسانے ناول بھی تحریر کیا ہے آپ نے کئی اسلامی مضامین بی قلم کیا ہے آپ خواتین اور بڑے بوڑ ھےلوگوں کے لیے بھی لکھتے تھے،بچوں کے لیے بھی لکھتے تھے آپ کی خاص خصوصیت ہی یہی تھی کہ آپ جو بھی لکھتے تھیاشاعت اسلام کے لیے لکھتے تھے۔آپ کا مقصد اسلام کا غلبہ تھا۔کیونکہ آپ کے دور میں ادیب اپنے ادب کوادب برائے تفریح استعمال کرنے لگے تھے۔عریانیت کا فروغ ہونے لگا تھا۔اخلاقی پہلومسخ ہونے لگا تھا اور عام طور پر یہ رجحان بڑ ھنے لگا تھا کہ اگرادب یعنی ناول اورافسانوں کوبغیر فحش کے پیش کیا جائے تو لوگ پسند نہیں کریں گے۔عوام میں ایسی کتابیں قبولیت کا مقام حاصل نہیں کر پائیں گی۔دوسری طرف فلموں اورگانوں کی ذریعہ عریانیت پھیل رہی تھی۔ایسے میں مائل خیرآبادی نے اس بات کوثابت کرنے کی کوشش کی کہ کردارسازافسانے،ناول اور کہانیاں اچھے انداز بیان اورشگفتہ زبان کے ساتھ اگر قلمبند کیا جائیں تو ضرور عوام میں مقبولیت حاصل ہوگی۔اوراس کے ذریعہ بچوں،خواتین وغیرہ کی صحیح ذہنی اوراخلاقی تربیت بھی ہوگی یعنی ادب صرف تفریح کے لیے استعمال کرنے کے بجائے ادب اسلام کی اشاعت،عمدہ اور بہترین اخلاق کوفروغ دینے کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔اس کے ذریعہ بچوں اورنوجوان کی ذہنی تربیت اسلامی اصولوں پر کی جاسکتی ہے۔اس بات کوثابت کرنے کے لئے آپ نے اپنے قلم کا استعمال کیا۔

اردوادب کی تاریخ کا بغور مطالعہ کرنے سے جو بات روز روشن کی طرح عیاں نظر آتی ہیوہ یہ ہے کہ اردوادب کے آغاز ہی سے ایسے ادباء وشعراءاکرام کی اکثریت تھی جنھوں نے اردوادب کوسماجی برائیوں کو دور کرنے،غلط رسومات کا تدارک کرنے، معاشرے کی

اصلاح کرنے، عمدہ اور بہترین اخلاق کو فروغ دینے کے لئے استعمال کیا ہے۔ جیسے پریم چند وغیرہ ہیں۔ بعض ادباء ایسے بھی ہیں جنھوں نے خالص اسلام کی اشاعت ہی کے لیے اپنے قلم کا استعمال کیا ہے۔ علامہ اقبال، حالی اور شبلی نعمانی وغیرہ ہیں۔ مائل خیر آبادی بھی ایسے ہی ادیب ہیں جنھوں نے اپنے قلم کو خالص اسلام کے لئے استعمال کیا ہے۔ لیکن آپ کی انفرادیت اور خصوصیت اس بات پر ہے کہ آپ نے ادب کو اسلام کے اس نظریہ کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے کہ اسلام صرف چند ظاہری رسم ورواج کو اپنانے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ایک نظام حیات ہے۔ اسلام زندگی کے ہر پہلو کے لئے رہنمائی کرتا ہے۔ جو شخص بھی اپنی زندگی کے ہر معاملے میں اسلامی اصولوں کا خیال رکھیں تو ضرور اس کی دنیا سنور سکتی ہے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کی کہانیوں میں اس بات پر زیادہ زور ہیکہ جب کسی بھی شخص کیدل میں اللہ پر اور آخرت پر ایمان مضبوط ہو جائیں تو کس طرح اس کی زندگی نڈر بن جاتی ہے۔ ہر مشکلوں کا سامنا کرنا اس کے لئے کتنا آسان ہو جاتا ہے۔ بڑے سے بڑے بادشاہوں سے ٹکرانا بھی اس کے لئے آسان بن جاتا ہے۔ اس کی زندگی ہر پہلو سے اسلامی زندگی بن جاتی ہے۔ صوم وصلوٰۃ کا بھی پابند، حرام حلال کی تمیز اس کے اند آجاتی ہے، معاشرے کے دوسرے افرادوں کے ساتھ معاملات درست ہو جاتے ہیں، ہر اچھے اخلاق کو اپنے اندر پروان چڑھانا آسان ہو جاتا ہے اور رذیل اخلاق سے اپنے کو محفوظ رکھنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح آپ نے جو انشائیہ کے طور پر مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین میں آپ نے موجودہ دور میں اسلام پر کیے جانے والے اعتراضات کا بھی مدلل جواب دیا ہے۔ غیر مسلم بھائیوں کے جو اعتراضات اسلام پر ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ اسلام کو بدنام کرنے، کمزور بتانے کے لئے اس بات پر زیادہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام میں عورتوں کے حقوق مردوں کے مساوی نہیں ہیں۔ اس اعتراض کے جواب میں آپ نے بڑی ہی مدلل انداز میں ایک کتاب لکھی ہے جو حلقہ علماء میں بھی کافی مقبولیت پائی ہے۔ اسی طرح عورتوں کی اصلاح کے لئے آپ نے امہات المومنین کے واقعات، مشہور صحابیات کے واقعات کو کہانی کی شکل میں دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری کو یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اس نے کوئی اسلامی کتاب پڑھی ہے بلکہ ایسا محسوس ہونے لگتا ہیکہ وہ ایک دلچسپ کہانی کا مطالعہ کرر ہا ہے۔ اس کے لئے آپ کوئی ناصحانہ انداز اختیار نہیں کرتے بلکہ قاری خود اس سے نصیحت حاصل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اسی طرح بچوں کی تربیت اسلامی تہذیب وآداب کے مطابق کرنے کے لئے آپ نے اسلامی تہذیب وآداب پر بھی بہت ساری کہانیاں بچوں کے لئے آپ نے لکھی ہے جس سے بچے خود دلچسپی سے ان قصوں کا مطالعہ کریں ساتھ ہی اسلامی تہذیب کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے چلے جائیں۔

اسی طرح آپ نے عمدہ اخلاق کے پروان کیلئے بعض اخلاقی کہانیاں لکھی ہیں جسے بچوں میں سچ بولنے کی عادت پیدا ہونے کے لئے، خدا کا خوف پیدا ہونے کے لئے، ہمت و شجاعت کی عادت پروان چڑھانے کے لئے، امانت و دیانت کی عادت پیدا ہونے کے لئے وغیرہ۔ اخلاقی پہلو پر بھی آپ نے کہانیاں قلمبند کی ہے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کہانیاں بچوں کے لئے ہیں لیکن اگر نوجوان، بڑے بزرگ، خواتین کوئی بھی ان کہانیاں کو پڑھیں گے تو کہانیوں سے اثر لیے بغیر نہں رہیں گے۔ یا تو ان میں خود، اچھے اخلاق کو پیدا کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا یا پھر اپنی اولاد میں ان اخلاق کو پروان چڑھانے کا عزم کر کے وہ اٹھیں گے۔

اسی طرح آپ نے دعوتی موضوع کو بھی اپنی کہانیوں میں شامل کیا ہے۔آپ اپنی کہانیوں میں یہ بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ ہمارے اخلاق کیسے ہوں؟

اس تعلق سے مسلمانوں میں کیا غفلت پائی جاتی ہے۔ان سب باتوں کو کہانیوں کے انداز میں قلمبند کیا ہے۔ یہ آپ کی خاص خصوصیت ہے۔

اگر مجموعی حیثیت سے کہا جائیں تو اسلامی معاشرہ کی اصلاح، غیر مسلم میں دعوتی کام، تزکیہ نفس، خدمت خلق، ملی وملکی مسائل، غیر مسلموں کے اسلام پر اعتراضات، خواتین کے حقوق دین اسلام میں وغیرہ جیسے موضوعات کو قران وحدیث کی ترجمانی کرتے ہوئے کہانیوں کی شکل میں اپنے مخصوص انداز میں کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں۔ یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ آپ اسلامی نظریہ کو پیش کرر ہے ہیں۔

افسانوں میں اسلام پسندی

آپ نے بے شمار افسانے قلمبند کیے ہیں۔ ہر افسانے میں آپ نے اسلام کے پیغام کو کہانی اور واقعات کی شکل دی ہے۔آپ نے ہر کتاب میں دس سے پندرہ مختصر افسانوں کو مرتب کیا ہے۔اچھے افسانے کے نام سے آپ نے ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب ۶۹ صفحات پر

مشتمل ہے۔ اوراس میں تیرہ مختصر افسانوں کو آپ نے مرتب کیا ہے۔ آپ کی اسلام پسندی کی ثبوت کے لئے تین افسانے پیش کیے جا رہے ہیں۔

1. پان والا: یہ اس کتاب کا پہلا مختصر افسانہ ہے اس میں آپ نے قرآن مجید کی ایک آیت کو واقعہ کی شکل میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ واقعہ کا آغاز آپ نے فارسی کے ایک شعر سے کرتے ہیں جو ایک پان کی دوکان کے سائن بورڈ پر لکھا ہوا رہتا ہے۔ اسے دیکھ کر خود بخود قدم دوکان کی طرف اٹھ جاتیہیں۔ جب پان خریدنے کے لئے دوکاندار کے پاس انکی آگے بڑھاتے ہیں تو وہ ایں ظفر صاحب! کہہ کر پان والا دوکان سے کود پڑتا ہے اور گلے لپیٹ لیتا ہے۔ ادھر ظفر صاحب حیران رہتے ہیں کہ میں علی گڑھ کا گریجویٹ اور سرکاری تحصیلدار اور یہ پان والا۔ اس سے کبھی شناسائی کیا رہی ہوگی۔ پھر پتا چلتا ہے کہ آپ کا علی گڑھ کالج کا ساتھی حبیب ہے۔ ظفر صاحب کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ گریجویٹ ہو کر پان بیچنےکیسے بیٹھ گیا۔ یہاں ناول نگار اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ لوگ عام طور پر گریجویٹ ہوتے ہوئے دوکانداری کرنے کو عیب سمجھتے ہیں۔ پھر حبیب اس کی تفصیل بتاتے ہوئے کہتا ہے والد صاحب کی تنخواہ کی بنیاد پر ہی گھر کی روزی اور تعلیم کا انحصار تھا والد صاحب بیماری کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ اس وقت والدین کی تمنا سے شادی بھی ہوگئی۔ نوکری کی تلاش میں دربدر پھرتا رہا کوئی موقعہ نہیں ملا۔ گھر کی یہ حالت تھی کہ ماں نے آکر کہا کہ بیٹا! کل کے کھانے کے لئے گھر میں سودا نہیں ہے۔ گھر کی یہ حالت دیکھ کر مجھ سے رہ نہیں گیا تو میں نے خودکشی کرنے کا ارادہ کرلیا۔ آخری نظر بیوی اور ماں کو دیکھ کر نکل رہا تھا۔ بیوی نے میری گھبراہٹ کو دیکھ کر مجھ سے پوچھنے لگی تو میں نے میرا ارادہ ظاہر کر دیا۔

اس کے بعد حبیب اپنے دوست ظفر کو یہ بھی بتلاتا ہے کہ اس وقت بیوی نے نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ ''خودکشی کرنا حرام ہے۔ مسلمان اور حرام موت یا اللہ!'' پھر جب میں نے رزق کی تنگی کا سبب بتایا تو اس نے مجھے نصیحت کرتے ہوئے قرآن مجید کی آیت کا ترجمہ سنانے لگی ''جو کوئی اللہ تعالی کا تقویٰ اختیار کرے گا تو اللہ اس کے لئے کوئی راہ پیدا فرما دے گا اور اس کو ان طریقوں سے روزی پہنچائے گا جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں'' پھر اس نے مجھے اس بات کا مشورہ دیا کہ چھوٹا موٹا روزگار کیلئے پان کی دوکان ہی سہی رکھ لیجئے۔ اس پر میں نے کہا کہ کیا تمہاری نظر میں میری قدر اتنی ہی ہے۔ اس کے جواب میں پھر اس نے کہا کہ اللہ و

رسول منع نہ کرتے تو میں آپ کو سجدہ کرتی۔ پھر ملازمت اور روزگاری کا فرق بتاتے ہوئے کہا کہ دیکھو ملازمت ایک غلامی ہے اور اس میں رشوت وغیرہ لیا جاتا ہے جو حرام ہے۔ اس کے مقابلے میں حلال روزی اختیار کرنے میں کیا خرابی ہے۔ پھر علامہ اقبال کا شعر بھی اس نے سنا دیا

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

آخر میں نے پان کی دوکان کے لئے تیار ہو گیا۔ پھر اللہ نے بھی میری مدد فرمائی میں ترقی کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ یہ ساری تفصیلی بات حبیب اپنے ظفر کو سناتا ہے۔ حبیب جب اپنی آپ بیتی ختم کر دیتا ہے تو ظفر یہ سن کر لمبی سانس لیتا ہے اور دل میں حبیب کی زندگی پر رشک کرتا ہے۔ اس طرح یہ افسانہ ختم ہو جاتا ہے۔

اس مختصر افسانے میں مائل خیرآبادی نے حسن وخوبی کے ساتھ یہ بات بتادی کہ بندہ رزق کے معاملے میں اللہ پر کیسے بھروسہ رکھیں اور درج ذیل آیتوں کی ترجمانی بھی کر دی۔

"جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اُس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا اور اُسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اُس کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔ جو اللہ پر بھروسہ کرے اُس کیلیے وہ کافی ہے۔ اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے" (سورۃ الطلاق:2,3)

"اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دُوسرے کے مال ناروا طریقہ سے کھاو؟ اور نہ حاکموں کے آگے ان کو اس غرض کے لیے پیش کرو کہ تمہیں دُوسروں کے مال کا کوئی حصہّ قصداً ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے۔" (سورۃ البقرۃ:188)

2. کہاں سے کہاں؟

اس مختصر افسانہ میں . آپ نے حضرت موسیٰؑ کے بچپن کا واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اس میں آپ نے اصل تین کرداروں کو پیش کیا ہے ماں، نوجوان لڑکی اور بچہ۔ اس کا آغاز کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ٹھک ٹھک کی آواز سن کر، نوجوان لڑکی اچانک چونک پڑتی ہے۔ نوجوان لڑکی دیکھتی ہے کہ ماں بالکل آہستہ آواز میں، صندوق بنانے میں محو ہے۔ اس کے بعد اس صندوق میں معصوم بچے کو رکھ کر اٹھا لے جاتی ہے۔ نوجوان لڑکی کا دل تڑپتا ہے کہ آگے پڑھ کر اس صندوق سے بچے کو اٹھا لو۔ لیکن ماں اس صندوق کو دریائے نیل میں بہا دیتی ہے۔ نوجوان

لڑکی بار بار اس صندوق کو لینے کی کوشش کرتی ہے لیکن اس کی ماں اس کو ہمیشہ روک دیتی ہے اور کہتی ہے کہ اللہ کا حکم یہی ہے، اطمینان رکھو، وہی اللہ تمہارے بھائی کی حفاظت کرے گا۔ پھر بیٹی سے کہتی ہے کہ اچھا جا! نیل کے کنارے کنارے، دیکھ اللہ اپنے بندوں کی کس طرح حفاظت کرتا ہے۔ نوجوان لڑکی اس صندوق کے پیچھے چلتی رہتی ہے چلتی رہتی ہے اچانک ایک عالیشان محل دریا کے کنارے بہت بڑے رقبہ میں بنا ہوا دیکھتی ہے۔ محل پر کچھ عورتیں زرق برق لباس پہنے کھڑی ہیں۔ ان عورتوں میں سے ایک معزز خاتون یکا یک صندوق کی طرف اشارۃ کر کے پاس کھڑی ہوئی عورتوں سے کچھ کہتی ہے پھر کچھ مچھیر جال لیے اس محل سے نکلتے ہیں صندوق پر جال پھینک کر اس کو اٹھا لیتے ہیں۔ اور محل کی مائلہ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ مالکہ صندوق کھولتی ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے نکلتا ہے ''بچہ'' اس نے بچے کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیتی ہے چومتی ہے پھر پاس کھڑی ہوئی عورتوں کو حکم دیتی ہے کہ ملک کی خوبصورت نوجوان، سلیقہ شعار اور بہترین دودھ پلائی کو حاضر کریں۔ حکم پا کر یکے بعد دیگرے کئی مائیں آتی ہیں اور بچے کو لے کر دودھ پلانے کی کوشش کرتی ہیں۔ مگر بچہ کسی کا دودھ منہ میں نہیں لیتا ہے۔ یہ دیکھ کر نوجوان لڑکی آگے بڑھ کر کہنے لگتی ہے کہ اگر آپ حکم دیں تو میں ایک ایسی ماں حاضر کروں جس کا دودھ یہ بچہ ضرور پیے گا۔ مالکہ اس کی اجازت دے دیتی ہے۔ فوراً لڑکی گھر کی طرف آتی ہے اور ماں سے کہتی ہے کہ ''اللہ اپنے بندوں کی حفاظت خوب کرتا ہے'' پھر سارا حال سناتی ہے۔ دوسرے میں بیٹی آگے آگے اور ماں پیچھے پیچھے ایک راستہ پر بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ اس پر افسانہ ختم ہو جاتا ہے۔

اس افسانہ میں آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بچپن کا واقعہ جسے اللہ نے سورۃ القصص میں آیت نمبر 7 سے 13 میں بیان کیا ہے بہترین واقعے کی شکل میں آپ نے پیش کر دیا ہے۔

مائل خیرآبادی نے اصلاح معاشرہ اور دعوت و تبلیغ کے لیے ناول افسانے اور کہانیاں وغیرہ کے جو طریقے آپ نے استعمال کیے ہیں وہ بہت ہی قابل تحسین ہیں۔ دور حاضر میں اس کی سخت ضرورت ہے۔ کیونکہ آج نوجوان بچے بوڑھے عورتیں سب reals اور short films وغیرہ کے دیوانے ہیں۔ اپنا زیادہ وقت ان میں گزارنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اگر ان کہانیوں کو ویڈیو کی شکل دے کر ریلز اور شارٹ فلمز بنائیں تو ضرور لوگ دلچسپی سے دیکھیں گے اور اس کے ذریعے سے عورتوں اور بچوں کی اسلامی نہج پر تربیت بھی ہوگی۔

R. MOHAMMED SAMEEULLAH [Research Scholar]
Dr. S. MOHAMED YASSIR [Research Supervisor]
DEPARTMENT OF URDU
C.ABDUL HAKEEM COLLEGE[AUTONOMOUS],
MELVISHARAM
THIRUVALLUVAR UNIVERSITY, VELLORE

نیک خواہشات

منیار محمد ارشاد عمری

معروف اسلامی اسکالر و بینکر

ادونی

باب خاکہ

عبداللہ نادر عمری کے

مٹھی بھر خاکے

خلیل مامون

عبداللہ نادر عمری

خوبصورت قد وقامت، صاحبِ علم وعظمت،

چہرہ کتاب نما، شخصیت آفتاب نما،

کشادہ پیشانی، ذہانت کی نشانی،

ستواں ناک، زبان بے باک،

بڑے بڑے کان، عظمت ورفعت کی پہچان،

مزاج سادہ، لہجہ شائستہ

تحریر میں شُستگی، تقریر میں شگفتگی،

یہ ہیں نامور شاعر وادیب، زبانِ اردو کے نقیب،

دانش مند ودانشور، سابق آئی پی ایس آفیسر،

کرناٹک میں اردو کی شان، محترم خلیل الرحمن۔

تاریخ اردو لکھنے والے ان کے ممنون رہیں گے،

آسمانِ شعر وادب پر تابندہ خلیل مامون رہیں گے۔

مامون صاحب انیس سو اڑتالیس کو اس عالم رنگ و بُو میں آئے، دارالسرور شہرِ بنگلور میں مسکرائے۔

بچپن سے ہی لکھنے پڑھنے کے عادی تھے، مشکل سے مشکل کام کرنے پر راضی تھے،

بیدِل، رومی، غالب اور اقبال کو خوب پڑھا، جس سے آپ کا ذوقِ شعر وسخن خوب بڑھا۔

آل انڈیا ریڈیو سے وابستگی اختیار کی، یہ بات ان کے لیے باعثِ صد افتخار تھی۔

قلم وقرطاس سے بھی رشتہ جوڑا، اپنے ناخنِ فکر سے حالات کا رخ موڑا۔

محمود ایاز کے حبیب تھے، حد درجہ ان سے قریب تھے۔

"سوغات" میں اپنے علمی جوہر دکھلائے، گلشن "ادب" میں رنگ برنگے پھول کھلائے۔

افق ادب پر "نیا ادب" جاری کرتے رہے، شب وروز اس کی آبیاری کرتے رہے۔

جب سماج کو علیل پایا، خدمت کا بیڑہ اٹھایا.

انیس سو ستھتر میں انڈین پولیس سروس میں شامل ہوئے، جہاں سے انسپکٹر جنرل آف پولیس کے عہدے سے سبکدوش ہوئے .

جیسے وہ ساری اردو دنیا میں چھا گئے، جب کرناٹک اردو اکادمی کے صدر کا منصب پا گئے .

انہوں نے تنقیدی مضامین کو " تاثرات " کا عنوان دیا،

"لسان، فلسفے کے آئینے میں" بیان کیا .

درد و کرب میں ڈوبتی زندگی کو "نشاطِ غم" دیا،

پھر اپنے افکار و انکشافات سے " آفاق کی طرف " سفر کیا.

" محمود ایاز سے گفتگو " کی خوشبو پھیلایا، "راز امتیاز کی شاعری " کا جادو جگایا .

" جسم و جاں سے دوری " اختیار کیا، "بن باس کا جھوٹ " آشکار کیا.

" سرسوتی کے کنارے " ڈھونڈنے نکل گیے، یہاں تک کہ " سانسوں کے پار " پہنچ گیے .

وہ زندگی کی سچائیوں کو خوب سمجھ چکے تھے، گھر کی چہار دیواری میں سمٹ کر رہنے لگے تھے،

دنیا والوں سے کنارہ کشی کر لی، پیڑ پودوں اور مچھلیوں سے دوستی کر لی.

ان کی شاعری تنہائی کے غم و الم کا اظہار یہ ہے، سماج کے دوغلے پن اور دروغ گفتن کے خلاف اک بیانیہ ہے.

ان کی نظمیں سماج کا آئینہ ہیں اور غزلیں انکشافات کا گنجینہ ہیں .

ان کا کلام کیا ہے؟

دستِ شبنم پہ دمِ شعلہ نوائی ہے

صبح کی گود میں شب بھر کی کمائی ہے

اکیس جون، جمعہ کی مبارک گھڑی تھی، دوپہر کی دھوپ کڑی تھی . اچانک ان کے سانحۂ ارتحال کی خبر اُڑی، یہ بات کانوں پر بجلی بن کر پڑی .

ہم انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں، نذرانۂ اشک و محبت پیش کرتے ہیں.

اکرم اللہ بیگ اکرم

عبداللہ نادر عمری

چہرہ تشبیب، محبت کی تسبیب ۔ بلند و بالا قامت، خوش بختی کی علامت ۔ گھنیرے بالوں میں چھپی پیشانی، دور شباب کی خوبصورت نشانی ۔ آنکھیں جیسے ساقی نامہ، دل و دماغ صریر خامہ ۔ لب گویا نظم کا عنوان، خاموشی میں ایک داستان ۔ ابھری ہوئی ناک، زبان بے باک۔ لباس و پوشاک سادہ، دل ونظر کشادہ ۔ دیوانوں میں دیوانہ، فرزانوں میں فرزانہ ۔ اپنے فن میں یگانہ، وہ کہتے ہیں تو بغور سنتا ہے زمانہ ۔ شہر گلستاں کے فنکار، دیکھنے میں فلمی اداکار ۔ ماہر فن عروض، شاعر و صحافی، دست بستہ کھڑے رہتے ہیں ان کے آگے ردیف وقوافی ۔ ذی جاہ ذی شان، صحافت کی اونچی اڑان ۔

بزم اردو بنگلور کے صدر ہیں، مسلم لائبریری کے نائب صدر ہیں ۔ یہ ہیں ہر دل عزیز، نہایت محترم و مکرم یعنی اکرم اللہ بیگ اکرم ۔

آپ تین، فروری، انیس سو پچپن کو پیدا ہوئے، شہر بنگلور میں مسکرائے ۔ گھر میں خوشحالی تھی، بچپن کی بے خیالی تھی ۔ ٹھنڈی چھاؤں میں دن گزر رہے تھے، ماں باپ کے سایے میں پل رہے تھے ۔ اچانک سر سے یہ سایہ اٹھ گیا، شفیق باپ کا ساتھ چُھٹ گیا ۔ بکھرتے گھر کو نانا نے سمیٹا، رشتوں کو کچے دھاگے سے لپیٹا ۔ آپ نے نانا کے زیر تربیت پروان چڑھا، دین، تہذیب اور اخلاق کا سبق پڑھا ۔

ابتدائی تعلیم رحمانیہ گورنمنٹ اسکول میں پائی، پھر قوت الاسلام ہائی اسکول میں مشعل جلائی ۔ الامین کالج میں علم کا جام پیا، سن جوسف سے بی کام کیا ۔ کتابوں سے دوستی کر لی، مٹر گشتی سے توبہ کر لی ۔ پہلے کتابت سیکھی پھر صحافت سیکھی ۔ فن عروض سیکھا، فکر وسخن کی نزاکت سیکھی ۔ ابن صفی کو خوب پڑھا، ادبی ذوق خوب بڑھا ۔ جذبۂ شوق کو ابھارا، تنقیدی ادب کو ذہن میں اتارا ۔ عبیداللہ شریف کی رفاقت ملی، یار دوستوں سے محبت ملی ۔ شکیل جاوید سے دوستانہ ہوا، کتابوں سے یارانہ ہوا ۔ رات بھر اخبار میں کتابت کا کام کرتےتھے، اور گھر آ کر دن بھر آرام کرتے تھے ۔ ابتدا میں عروج ہند، قرب و جوار، تسخیر انسانیت سے وابستہ رہے، پھر فلم ایڈوانس، کرائم انفارمر اور

روزنامہ پاسبان سے پیوستہ رہے ۔ مضامین لکھے اور چھپوائے، سالار کے کالم ''دھوپ چھاؤں'' پر چھائے ۔ فن عروض میں مہارت رکھتے ہیں، اچھے اچھوں کے اشعار کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں ۔ آپ جوش و امنگ کے نائب مدیر ہیں، دولسانی تہذیب کے سچے سفیر ہیں ۔ ایڈووکیٹ ایوب احمد خان کے دست و بازو ہیں، اگر وہ جام، تو یہ سبو ہیں ۔

میدان شعر وسخن میں دیر سے قدم رکھا، مگر اپنے استاد اسد اعجاز کے اعتماد کا پورا بھرم رکھا ۔ ان کے اشعار میں تلخیوں کی ضرب ہے، حالات حاضرہ کا کرب ہے ۔ رومانیت کی حدت ہے اور جذبات کی شدت ہے 1977 ۔ میں عقد اول ہوا اور یہی آخر ہوا، دل جو اک بار مسلماں ہوا پھر نہ کافر ہوا. اب آپ خیر سے بزرگِ اہل خانہ ہیں، کئی نواسوں کے نانا ہیں ۔ آپ مزاجاً راست گو اور اصول پسند ہیں، حاملِ دلِ دردمند ہیں

خود ہی کہتے ہیں:

دوستی اپنی جگہ اور مصلحت اپنی جگہ
سیکھا اکرم نے نہیں ہے رات کو دن بولنا

اردو پڑھتے ہیں، پڑھاتے ہیں، روٹی بھی اردو کی کھاتے ہیں ۔ اکثر خیالوں میں گم رہتے ہیں، دریائے سخن میں بہتے ہیں ۔ نثری مضامین کو ''غوامض العروض'' میں باندھ رکھا ہے، اس کے ہر حرف کا معیار بلند رکھا ہے ۔ شعری مجموعہ ''انبساط سخن'' ہے، جو کئی رازوں کا مدفن ہے ۔

آپ کی شخصیت کا رنگ اور عظمت فن دیکھیے، وہ کہتے ہیں تو طرزِ سخن دیکھیے ۔

بقول خود

میں فن شناسا ہوں کہتے ہیں مجھے اکرم
لیتے ہیں قدم بڑھ کر دلی و دکن والے

آپ شہر بنگلور کی شان ہیں، بزم اردو کی جان ہیں ۔

آہنگ و عروض، شعر و سخن آپ کی پہنچان ہیں اور ستر سالہ نوجوان ہیں.

عزیز بلگامی

عبداللہ نادر عمری

چہرا غزل کا خوبصورت مطلع، ناک رباعی کا چوتھا مصرع

سراپا جیسے کھلی کتاب، شخصیت مثل ماہتاب

آنکھیں شعلۂ طور، علم وادب کا مرکز نور

ناک سوز وساز، بت کدے میں حق کی آواز

روشن پیشانی، عزم وہمت کی نشانی

زبان شستہ وشائستہ، لہجہ نرم اور شگفتہ

ہونٹوں پر تبسم، ہر وقت خیالوں میں گم

اجلا اور گندمی رنگ، فکروفن کا ایک خوبصورت آہنگ

قد بحر مختصر، شخصیت معتبر

بدن دوجلدوں میں، کاغذ وقلم ہاتھوں میں

آپ کی شخصیت ریاست کرناٹک کی شان ہے، ساری دنیا میں آواز ہی آپ کی پہچان ہے .

نکتہ سنجی، نکتہ آفرینی، نکتہ پردازی، نکتہ دانی، نکتہ بینی، نکتہ گری اور نکتہ فہمی.

مذکورہ سارے نکات کا معجونِ مرکب ہیں عزیز بلگامی

آپ یکم مئی، انیس سو چوپن کو کڑچی ضلع بلگام میں پیدا ہوئے، محمد اسحاق جمعدار کے بیسویں اور آخری وارث کہلائے

سب سے چھوٹے ہونے کا فائدہ اٹھایا، سب نے شہزادہ کو پلکوں پر بٹھایا .

بچپن ہی سے طبیعت میں نزاکت تھی، کچھ الگ کرنے کی عادت تھی .

فارغ اوقات میں مچھلی کا شکار کرتے تھے، ندی کے کنارے بانسری بجاتے تھے

ابتدائی تعلیم جنیدیہ ہائی اسکول میں پائی، ایس ایس ایل سی کی پڑھائی باشیبان ہائی اسکول میں

پائی .

بی ایس سی کِٹل کالج دھارواڑ سے مکمل کیا، پھر خود پر اعتماد کیا .

بنگلور یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا، عطاء الرحمٰن عطاء کے فن اور شخصیت پر ایم فل کیا .

حساب کتاب میں پکے تھے، مگر زندگی کے راستے کچے تھے

اسٹیل انڈسٹری میں کام ملا، شب و روز کی الجھنوں کو آرام ملا.

یہاں سے اٹھے، SBI بینک کی کرسی پر بیٹھائے گئے، عسرت سے عیش و عشرت کی محفل میں لائے گئے.

قدرت کو منظور کچھ اور کرنا تھا، آپ کو حدِ پرواز سے گزرنا تھا.

شاہین صفت کو یہ برداشت کیونکر ہوتا، چونکہ اقبال کا یہ شعر پیش نظر تھا:

اے طائر لاہوتی، اس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو، پرواز میں کوتاہی

خالص رزق حلال کے لیے سرگرداں رہے، خدمت انسانیت کے لیے ہردم جواں رہے

درس و تدریس سے وابستہ رہے، بحیثیت پرنسپل زبیدہ کالج شکاری پور سے پیوستہ رہے

صحافت میں بھی قسمت آزمائی، جوہر صحافت، صدائے فطرت اور ماہنامہ الرشید کی ادارت سنبھالی .

اپنے مضامین میں نئے مسائل کو کوریج دیا، شاعری سے لَو میرج کیا .

اردو ڈی ٹی پی میں مہارت حاصل کیا، سینکڑوں کتابوں میں اپنا خونِ دل شامل کیا

پرنٹیک پبلشنگ ہاوز کے سربراہ ہیں، شعراء و ادباء کے خیر خواہ ہیں

دوردرشن بنگلور میں انٹرویورر ہے، خلوت نشینی سے دور رہے

فکر و فن، شعر و سخن کے مدیر ہیں، سیدھی بات نیوز چینل کے مشیر ہیں .

سرکاری نصاب میں آپ کی تخلیقات شامل کتاب ہیں، ساری دنیا میں مشہور آپ کے حمد و نغمات

ہیں

محفوظ ہے فکر وفن کئی کتابوں میں، روز چھپتے ہیں آپ اخباروں میں.

ساری شعری دنیا کو اپنی مٹھی میں جکڑ رکھا ہے، یہاں بیٹھے، جاپان کی ادبی سرگرمیوں پر بھی نظر رکھا ہے .

آپ کثیر الجہات اور کوہ کن ہیں، اپنی ذات میں اک انجمن ہیں .

آپ صرف شاعر نہیں، نثر نگار، کالم نگار، ترجمہ نگار، مشاعرہ کار ہیں، علاوہ ازیں انٹرویور، پبلیشر، قرآنک عربی ٹیچر ہیں .

آپ کی چھ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، اور کئی کتابیں پریس کا منہ دیکھنے کے لیے ترس رہی ہیں .

حرف وصوت میں خون جگر نچوڑ دیا، پھر سکون کے لمحوں کی تازگی کا احساس پایا .

دل کے دامن پر اپنے جذبات کو اتارا، پھر زنجیرِ دست وپا سے شخصیت کے رنگ ونور نکھارا .

نقد وانتقاد سے بھی کام لیا، بساطِ تنقید پر بڑے بڑوں کا نام لیا .

با مقصد شاعری آپ کا کمال ہے، نعت گوئی آپ کی شخصیت کا حسن و جمال ہے .

شاعری اگر آپ کے ہاتھ کی چھڑی ہے تو نثر نگاری جیب کی گھڑی ہے.

غفران امجد بنارسی

عبداللہ نادر عمری

چہرہ ایک کھلی کتاب، آہنگ وعروض کا نصاب.
آنکھیں ساقی نامہ، لب صریرِ خامہ
سر پر سرخ وسیاہ بال، اس عمر میں بھی پیکرِ جمال
مزاج خاموش، خامہ بگوش.
سانولا رنگ، لب ولہجہ ترنگ.
بامحاورہ انسان، شعور وآگہی کا جہان
قدوقامت ایک مکمل غزل، بیچ تالاب میں کھلتا کنول.
یہ ہیں ہم وطنِ پریم چند، کبیر وسرشار، محبت وانسانیت کے علمبردار
خوش نظر، خوش اخلاق، خوش مزاج، شعروسخن کے سر کا تاج
بزم اردو، بنگلور کے عمومی معتمد، یعنی جناب غفران امجد
آپ چوبیس، نومبر، انیس سواُنسٹھ کو پیدا ہوئے، صبح بنارس کی روحانیت پر فدا ہوئے
ضیاء بنارسی کے سچے وارث ہوئے، باپ کی آنکھوں کا نور کہلائے .
دادا عبدالغفور بھی سخنور تھے، گھر آنگن شعروسخن سے منور تھے
شاعری پڑی تھی آپ کی گھٹی میں، اردو کا خمیر شامل ہے اس مٹی میں
تعلیم زینت الاِسلام میں پائی، صرف پانچویں جماعت تک یہ ہو پائی
نصابی کتابوں میں دل نہ لگتا تھا، کھیلنا کودنا اچھا لگتا تھا
پڑھنا اس لیے بھی ضروری نہیں سمجھا، خاندانی کاروبار ہی کافی تھا
مطالعہ اور مشاہدہ خوب کیا، نتیجۃً فکر کو لفظوں کا روپ دیا .
ساڑیوں کی تزئین وآرائش کرنے لگے، تخلیق کے سمندر میں گہر تلاش کرنے لگے .
بچپن سے ہی والد کے ساتھ مشاعروں میں جاتے تھے، پروازِ تخیل کے لیے پر تولتے تھے .
انیس سو ستاسی میں پہلی بار تخلیق کا کرب سہا،
پہلی غزل کا مطلع اور ایک شعر یوں کہا.

قدم قدم پہ لہو، خاک سے بدلنے کا
عجب جنوں تھا، ہواؤں کے ساتھ چلنے کا
حصارِ ذات سے نکلوں تو کائنات بنوں
کوئی بتائے مگر، راستہ نکلنے کا

ابتدا میں عرفان صدیقی، ندا فاضلی اور افتخار عارف سے متاثر ہوئے، کبیر اجمل، خالد جمال اور روشن لال کے ہم عصر ہوئے .

باقاعدہ کسی کو استاد نہیں بنایا، ہم ذوق دوستوں سے فیض اٹھایا.

ماہنامہ شاعر، آج کل اور نیا دور جیسے رسائل میں چھپنے لگے، تعریف وتنقید کی راہ سے گزرنے لگے .

جب شمال میں کاروبار ڈھپ پڑنے لگا، جنوب میں قسمت کا ستارہ چمکنے لگا

یکم جنوری دو ہزار چھے میں بنگلور کو وطن ثانی بنایا، خواب کی مٹی سے محبت کی کہانی بنایا .

اگلے ہی سال بزمِ اردو کا آغاز کیا، یار دوستوں سے رابطے استوار کیا .

آپ کے شاگرد ملک بھر میں مشاعرے پڑھ رہے ہیں، آپ کی محنت کی روٹی وہ کھا رہے ہیں .

آپ اس بات کا یوں قرار کرتے ہیں، مگر بآواز بلند کہنے سے انکار کرتے ہیں . شعر دیکھیں

خرچ کرتے ہیں سرِ بزم کئی لوگ جسے
میرے افکارِ مسلسل کی کمائی سب ہے

آپ کی شاعری میں زندگی کھنکتی ہے، خوابوں کی مٹی میں خوشبو مہکتی ہے . جب لہو کی دھوپ برستی ہے، تب خیالوں کی دنیا چمکتی ہے .

آپ کی غزلوں میں صبحِ بنارس کی روحانیت ہے، شامِ اودھ کی نزاکت ہے، دہلی کی تاریخی عظمت ہے، اور شہرِ گلستاں بنگلور کی شادابیت ہے.

غفران امجد کی صبح تو بنارس میں ہوئی، مگر شامیں بنگلور کی رنگین ہوئیں

آپ کی زندگی کا سورج شمال میں اُگا، مگر جنوب کے آسمان پر روشن ہوا

بقول خود:

کسے خبر تھی کہ مٹی یوں رنگ بدلے گی
کہاں جنوب، کہاں تھی شمال کی روٹی

ڈاکٹر فریدہ رحمت اللہ خان

عبداللہ نادر عمری

چہرا کتابی، شخصیت حجابی . سراپا مسلمان، معصومیت بھری مسکان . پیشانی مرکزِ شعور، آنکھیں علمیت سے بھرپور . ستواں ناک، سادہ پوشاک . ہونٹوں پر تبسم، خیالوں میں گم . زیبِ تن کرتہ و پائجامہ، انداز مشرقی، کردار مشفقانہ . نکلتا ہوا قد و خال، ہرنی جیسی چال . صنف افسانہ کی آبرو، محفل ادب کی آرزو . شیریں گفتار، پاکیزہ کردار . اردو کی خدمت گار، میدان تعلیم کی سپہ سالار . زریں شعاعیں کی مدیرہ، پیامِ امن کی سفیرہ . خواتین عالم کی ترجمان، ریاست کرناٹک کی شان . نسائی ادب کی پہچان، عزم و ہمت کی چٹّان یعنی فریدہ رحمت اللہ خان۔

فریدہ رحمت اللہ 19 / اپریل 1956 کو پیدا ہوئیں، گلن پیٹ ضلع چکمنگلور میں مسکرائیں . والدین نے فریدہ نام رکھا، خدا نے انہیں منفرد و بیمثال رکھا . گھر علم و ادب کا گہوارہ تھا، شعور و آگاہی کی آماجگاہ تھا . والدہ سے قصے کہانیاں سننے لگیں، ذہن میں خیالات کے تانے بانے بُننے لگیں .

ابتدائی تعلیم گھر میں پائی، پھر بلندیوں سے ہاتھ ملائی . ماں کی نظروں سے بچ کر رہنے لگیں، ابن صفی کو خوب پڑھنے لگیں . کالج کی کھلی فضاؤں میں سانس لیا، اردو کے بعد اب انگریزی کتابوں کو ہاتھ لیا . اپنے اساتذہ سے مدد لی، ایم اے اردو کی سند لی . صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، ایم اے پولیٹیکل سائنس بھی کیا.

پریم چند، ابن صفی اور منٹو نے سرشار کیا، قرۃ العین، عصمت چغتائی اور ممتاز شریں کے فن پر اعتبار کیا . قلم کو مقصدِ زندگی جانا، اور وجودِ انسانی کو پہچانا . لکھنے پڑھنے کا شوق وراثت میں پایا، جو آگے چل کر کام آیا.

سب سے پہلے جب قلم اٹھایا، "سماج اور عورت" کا عنوان دیا . اسے روزنامہ سالار نے شائع کیا، ایک حوصلہ و اعتبار عطا کیا . لازوال افسانے بُنے، چھوٹوں، بڑوں نے سر دُھنے.

1989 سے ماہنامہ زریں شعاعیں جاری ہے، ملک بھر میں شعر و ادب کا سحر طاری ہے .
ہندوستان کی اکلوتی خاتون مدیرہ اس قابل ہے، بفضل خدا یہ اعزاز آپ کو حاصل ہے.
آپ کے تخلیقی کینوس پر کئی تصویریں ہیں، سماجی برائیوں کے خلاف تحریریں ہیں.
آپ نے شاعری کی الگ راہ نکالی، صنف نازک کی تصویر اُجالی . ادب برائے زندگی کی طرف دار ہیں، بیٹی، دلھن، لڑکی اور عورت کی غم خوار ہیں.
آپ بیک وقت کئی میدانوں کی شہسوار ہیں، شاعرہ، مدیرہ، ناول نگار، افسانہ نگار اور سماجی خدمت گار ہیں . اللہ جانے آپ سے یہ سب کیسے ہوتا ہے، محنت وخلوص کے بغیر دنیا میں کچھ نہیں ہوتا ہے.
کئی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں، جو قارئین کے دلوں میں جگہ پا چکی ہیں . جب کبھی " قاتل مسیحا"، " قسمت کے خریدار " ہوئے، عورتیں بیٹیاں رسوا سرِ بازار ہوئے . جب پڑھا "ٹوٹی مالا بکھرے موتی"، دل ہوا زخمی، رہ گئیں آنکھیں روتی" . درد کی دہلیز " پر جب قدم رکھا، "درد کی گونج" سے دل یہ سہم اٹھا.
الغرض آپ کی نگارشات سماج کے منہ پر ایک تھپڑ ہیں، تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی پر ایک کنکر ہیں.
آپ کی سماجی خدمات سب سے اوپر ہیں، جو آپ کے ماتھے کا جھومر ہیں . بے شمار تنظیموں اور انجمنوں سے وابستہ ہیں، ادبی وسماجی پھولوں کا گلدستہ ہیں . اپنی تخلیقات پر انعامات پا چکے ہیں، سرکاری اور ادبی اداروں سے اعزازات پا چکے ہیں .
آپ کی شخصیت کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر ہے، جس کی پرواز میں ہمت ہے اور نگاہ میں اثر ہے۔

عورت ہوں مگر صورتِ کہسار کھڑی ہوں
اک سچ کے تحفظ کے لیے سب سے لڑی ہوں

(فرحت زاہد)

منیر احمد جامی

عبداللہ نادر عمری

کتابی چہرا، آنکھوں کا رنگ گہرا

متوازن جسم، ہونٹوں پر لفظوں کا طلسم

بڑے بڑے کان، دانش مندی کی داستان

ستواں ناک، انداز پُر تپاک

چوڑی پیشانی، علمیت کی نشانی

بھرے بھرے، گورے گورے گال، ٹوپی سے باہر نکلتے ہوئے سیاہ وسفید بال

مزاج خاموش، خامہ بگوش

شاعر اور خوش نویس، نہایت خلیق ونفیس

یہ ہیں نامور حمد گو، نعت گو اور شاعر غزل، حمد گوئی میں کوئی نہیں ہے جن کا بدل

معروف شاعر وادیب، زبانِ اردو کے نقیب

ماہنامہ طرزِ تحریر کے ایڈیٹر، محبت وخلوص کا مظہر

ہم سب کے محبوب، نامی گرامی، یعنی منیر احمد جامی

منیر احمد جامی 5، جولائی، 1953 کو عالم وجود میں آئے، شہر گلستاں بنگلور میں مسکرائے

والد سرکاری ڈاکٹر تھے، میدان طب کے کیمیا گر تھے

ابتدائی تعلیم حفیظیہ اسکول میں پائی، پھر مختلف دانش گاہوں سے لو لگائی

اعلیٰ تعلیم بی کام تک پائی، اپنی تخلیقی دنیا بسائی

1970 میں افق شاعری پر نمودار ہوئے، مختلف اصنافِ سخن آپ پر آشکار ہوئے

اپنی ہی افتادِ طبع کو استاد کیا، اصلاح کی جھنجھٹ سے خود کو آزاد کیا

قدرت کا یہ احسان ہوا، جامی تلمیذ رحمٰن ہوا

پیشے سے تاجر ہیں،لفظوں کے جادوگر ہیں

پرنٹنگ پریس قائم کیا، کتابوں کی عمدہ طباعت میں بڑا نام کیا

روزنامہ سیاست میں ادبی ایڈیشن کے مدیر رہے، اہل وطن کے درمیان محبتوں کے سفیر رہے

بنگلور دوردرشن اور آل انڈیا ریڈیو کو اپنی آواز دی، تخلیقی عمل کو اونچی پرواز دی

آپ اردو زبان کے بےلوث خادم ہیں، ادبی محفلوں کے کامیاب ناظم ہیں.

کرناٹک اردو اکادمی کے رکن رکین ہیں، افقِ ادب پر ماہ مبین ہیں

جامی صاحب ایک درجن کتابوں کے مالک ہیں، بہت سے شعری مجموعوں کے خالق ہیں

آپ کا پہلا شعری مجموعہ حرف تمام ہے، جو رب ذوالجلال کا حمدیہ کلام ہے

دوسرا شعری مجموعہ نقش لاثانی ہے، یہ محبت رسول کا جذبۂ لافانی ہے

اختراع: کلام شاعر بہ خط شاعر کا حسین گلدستہ ہے، سنگلاخ شعری زمین پر سبز ؟ نورستہ ہے .

اجتماع: منظوم سوانح نگاری کا نایاب نمونہ ہے، مسلم رہنماؤں کی حیات کا شفاف آئینہ ہے

وجہ گُل منظوم سیرۃ النبی ہے، جو پاک نبی کی پاکیزہ زندگی پر مبنی ہے

صدقُت اور تذکرۃ الصالحین مقبول خاص وعام ہوئے، جسے دیکھ کر قارئین شادکام ہوئے

آج رونمائی ہوئی موج سلسبیل کی، بڑھ گئی برکتیں آپ کی زنبیل کی

طبیعت اور مزاج شاہانہ ہے، رکھ رکھاؤ اور انداز فقیرانہ ہے.

بےلوث و باشعور ہیں، فخر وغرور سے بہت دور ہیں

خود ہر کام کرتے ہیں، ہر شخص کا احترام کرتے ہیں

آپ ادبی محفلوں کی جان ہیں، اچھے فنکار ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے انسان ہیں.

خیر الکلام ماقل ودل

ارتعاش کا 12 واں شمارہ بروقت منظر عام پر آرہا ہے، الحمد للہ، اس کے قلمی معاونین میں خاص کر باب افسانہ میں معروف قلم کار اور کہنہ مشق افسانہ نگار جناب فیاض قریشی نے اپنے قیمتی افسانے سے سرفراز فرمایا ہے، ارتعاش کے تازہ شمارے کے لئے افسانوں کی ضرورت تھی چنانچہ ناچیز نے جناب عبداللہ نادر عمری سے کہا کہ آپ کی نظر میں کوئی افسانہ نگار ہیں جو ارتعاش کے لئے افسانہ ارسال کر سکیں تو انہوں نے فیاض قریشی کا نام لیا اور ان کی ریختہ میں موجود ایک کتاب کی نشاندہی کی، جس کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد فیاض قریشی کے بہترین افسانوں کے مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور فن افسانہ پر ان کی گرفت سے واقفیت حاصل ہوئی، بعدازاں عبداللہ نادر کے توسط سے ہی انہوں نے دو افسانے ارسال کئے جن میں سے ایک افسانہ ارتعاش کے لئے منتخب ہوا۔

اس شمارے میں ہم عبداللہ نادر عمری کے چند خاکے ایک ساتھ پیش کر رہے ہیں تاکہ قارئین انہیں بھرپور انداز میں پڑھ سکیں۔

بہر کیف اس مرتبہ مجلس ادارت میں استاد محترم ڈاکٹر قیصر احمد اور ڈاکٹر فیروز عالم کے اسمائے گرامی شامل ہوئے ہیں، ہم ان کا مجلس ادارت میں استقبال کرتے ہیں، ارتعاش کی مجلس ادارت میں جنوب کے اہم اساتذہ کے اسماء گرامی شامل ہیں، ان کا تعاون ہمیں روز اول ہی سے حاصل رہا ہے۔

ان شاء اللہ ارتعاش پابندی کے ساتھ شائع ہوا کرے گا، تمام قلمکاروں سے گزارش ہے کہ ہمارا قلمی تعاون فرمائیں۔ شکریہ۔

والسلام ڈاکٹر ظہیر دانش عمری

APR - JUNE 2025

ISSUE: 12

Quarterly

IRTIASH

KADAPA

Peer-reviewed & Refereed Journal of Urdu Literature

ISSN: 2320-2416

AATISH ACADEMY PUBLICATIONS

8/209-1-5, Almasppet, Bismilla Nagar

Kadapa - 516001 A.P. India

Cell: 9701065617, irtiashissn@gmail.com